ماہنامہ
کراچی
آنکھ مچولی
نوری ۱۹۹۰ء
خ... خو خوفناک نمبر
ے کے ساتھ "پاک ک" کا انوکھا
اور حسین تحفہ مفت حاصل کریں

مانو کی مانو

میں ہوں بڑی سیانی لڑکی
نام ہے میرا مانو

غور سے سُن لو باتیں میری
سب مُجھ کو پہچانو

پھل پھول اور سایہ سبزہ پھاتے ہو گر پانا
دادا ابّو کہتے تھے کہ بہت سے پیڑ لگانا

پیڑوں سے ہریالی بھی ہے پیڑوں سے خوشحالی
ہم ہیں پاک چمن کے باسی ہم ہیں اس کے مالی

مجھے وطن کی خوشحالی کا راز سمجھ میں آیا
آپ نے بھی تو سمجھا ہو گا کیا کوئی پیڑ لگایا

محکمہ جنگلات پنجاب

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

جلد ۴ شمارہ ۷ جنوری ۹۰ء جمادی الثانی ۱۴۱۰ھ

مدیر اعلیٰ ظفر محمود شیخ
مدیر مسئول تجمل حسین چشتی
مشاورت مشفق خواجہ ، امجد اسلام امجد
مدیران اعزازی طاہر مسعود ، محمد سلیم مغل
مجلس ادارت شاہنواز فاروقی ، سید خورشید عالم
خطاطی عارف سعید

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپر ز سوسائٹی

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے شائع کیا۔

فون نمبر - ۲۹۹۱۷۸

ناشر ، ظفر محمود شیخ طابع ، زاہد علی مطبع ، لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ ۔ کراچی
خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی ، گرین گائیڈ اکیڈمی ، ۱۱۲۔ڈی ، نورس روڈ ، سائٹ کراچی

قیمت ۱۵ روپے ۱۰ درہم ۱۰ ریال
زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

۶	روز قیامت (نظم)	نور احمد شیخ
۱۳	ڈاکیا ڈاک لایا	
۱۵	ڈرو اُس دن سے	سید خورشید عالم
۲۱	آیئے آیئے خوف نہ کھایئے	سید ایاز محمود
۲۳	پُراسرار قلعہ	محمد ادریس قریشی
۳۱	سمندر کے بھوت	نادیہ امتیاز
۳۸	موت کی وادی	سید خورشید عالم
۴۱	آدھی رات کا سفر	نیّر ندیم
۴۹	خوفناک نمبر پڑھنے کے بعد (نظم)	محمد نوید مرزا
۵۰	یادگار رات	میر محمد خان کوہاٹی
۵۱	ڈر کیوں لگتا ہے؟	ذیشان بن صفدر
۵۷	فوبیا	محمد ساجد ارشاد
۵۹	ساحلی جھیل کا بھوت	شاہنواز فاروقی
۶۹	روح نے نوکری بچالی	س۔م۔ واثق
۷۵	لاوے سے بنے انساں	سلمیٰ سلیم
۷۶	کھٹے میٹھے	(انتخاب لطائف)
۸۳	ہزار خوف ہیں دل میں	محمد صادق ارشاد
۸۵	ایک خواب جس نے دنیا کو ہلا دیا	خالد شکیل
۸۸	کیلیگراتھ کی کھوپڑیاں (ترجمہ)	عباس جلبانی
۹۳	ڈراؤنی فلمیں ڈراؤنے کردار	س۔ خ۔ عالم
۹۷	قصہ چہار مسافر	سلمان غزالی
۱۰۷	جن کا انتقام	محمد انجم مبین
۱۱۱	بھوت نگر کی سیر کو چلئے	صباحت شکیل
۱۱۳	ایک خاتون جو روح سے باتیں...	عبدالباسط
۱۱۵	انجانی مہم	محمد نوید مرزا
۱۲۱	جنوں کی دعوت	اسد علی رضوی
۱۲۴	بھو کا دوست	محمد خالد جتوئی

عنوان	مصنف	صفحہ
ڈراپ سین	محمد بن مالک محمدی	۱۲۹
پُراسرار پورٹریٹ	نعیم مشتاق نوری	۱۳۴
یک نہ شد دو شد	شین فاروقی	۱۴۷
قیامت کے دو روز	محمد سلیم مغل	۱۴۹
خوفناک غزل	شاہنواز فاروقی	۱۵۶
دنیائے قدیم کے عجیب وغریب	س۔ سعید	۱۵۷
جستجو شرط ہے		۱۶۰
خوف	لبنیٰ اقبال	۱۶۳
جانے کیا ماجرا تھا ؟	ارم اقبال	۱۶۵
[illegible]	[illegible]	۱۶۹
[illegible]	[illegible]	۱۷۶
موت سے پہلے	[illegible]	۱۷۹
[illegible]	[illegible]	۱۸۳
[illegible]	[illegible]	۱۹۲
[illegible]	[illegible]	۱۹۵
[illegible]	[illegible]	۲۰۸
[illegible]	[illegible]	۲۱۱
[illegible]	[illegible]	۲۱۹
سناؤں تمہیں بات ۔ ۔ ۔	محمد عادل منہاج	۲۲۲
جب ہم نے بھوت ۔ ۔ ۔	اورنگ زیب عالمگیر	۲۲۷
ایک خوفناک فضائی حادثہ	نیرا بدالی	۲۲۹
خزانے کی تلاش	وسیم عباس شیخ	۲۳۳
گنی چنی معلومات	سید عقیل عباس جعفری	۲۳۶
مس چڑیل سے انٹرویو	آصف وقار احمد	۲۳۹
ننھی نگارشات		۲۴۳
سالگرہ کے ساتھی	قلمی دوستی	۲۵۵
امّی ابو کا صفحہ	سید ایاز محمود	۲۵۸

اس دن کا ہولناک منظر جس سے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اپنے بندوں کو ڈرایا ہے

روزِ قیامت

نور احمد شیخ

اچانک پے بہ پے جھٹکوں سے اُس دن
دہل جائے گا دھرتی کا کلیجہ
اُگل دے گی زمیں اپنے خزینے
سماں ہو جائے گا پُر ہول سارا
کوئی ہو گا نہ انساں کا سہارا
ہر اک انساں پکارے گا الٰہی
کہاں سے آ گئی ہے یہ تباہی
نکل آئیں گے سب قبروں سے مُردے
ہٹیں گے سب چھپے رازوں سے پردے
سوا نیزے پہ سورج آ رُکے گا
ہر اک گمراہ کا بھیجہ پکے گا
کسی کی ایک ننھی سی بُرائی
کسی کی ایک ننھی سی بھلائی
خُدا کی آنکھ سے اوجھل نہ ہو گی
یہ دن ہو گا خُدا کے فیصلے کا
صِلہ پائیں گے سب اپنے کئے کا

ماہِ رواں کی پہلی بات

انسانی زندگی میں خوف کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم نے ایک سال قبل آپ کی خدمت میں خوف کے مختلف موضوعات سے ترتیب پانے والا "خوفناک نمبر" پیش کیا تھا۔ تاکہ نئی نسل کے ادب میں موجود اس خلا کو پُر کیا جاسکے جو خوف کے موضوع پر معیاری مواد کی عدم موجودگی کے باعث برسوں سے موجود تھا۔ آپ کی جانب سے پہلے خوفناک نمبر کی بھرپور پزیرائی اور اس کی بار بار اشاعت کے مسلسل تقاضوں نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم خوف کے موضوع پر نئے زاویوں اور نئے ذرائع سے پہلے سے زیادہ معیاری خوفناک نمبر ترتیب دے کر آپ کی نذر کریں۔ پہلے خوفناک نمبر کی طرح اس خوفناک نمبر کا مقصد بھی کہانیوں اور مضامین کے ذریعہ مختلف اقسام کے خوفوں کی حقیقت بیان کر کے آپ کو ان سے بے خوف بنانا ہے۔

خوف اور انسان ازل سے آج تک ایک ساتھ سفر میں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ علوم کی ہمہ جہت ترقی نے جنوں بھوتوں، چڑیلوں اور اسی نوع کے بہت سے خوف اور توھمات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ مگر یہ بات بھی درست ہے کہ مذہب اور اخلاق سے عاری علوم اور خاص طور پر سائنسی علوم نے انسانوں کےلئے نئے خوف پیدا کر کے انہیں پہلے سے زیادہ شدید خوف کا شکار بنادیا ہے۔ ایٹمی جنگ کا خوف، خاندانی نظام کے خاتمے سے پیدا ہونے والا تنہائی کا خوف، مادی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جانے کا خوف، جدید خوفوں کی چند نمایاں مثالیں ہیں۔ چونکہ جدید علوم کی ترقی مغربی ممالک میں ہوئی ہے اس لئے یہ معاشرے زیادہ کثرت اور شدت کے ساتھ ان خوفوں کی گرفت میں ہیں۔

تاہم اس حوالے سے ہمارے معاشرے کا حال مغرب کے معاشرے سے بھی برا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جنوں، بھوتوں، اور چڑیلوں وغیرہ کے خوف میں بھی مبتلا ہیں اور مغرب کے پیدا کردہ خوفوں سے بھی سہمے ہوئے ہیں۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنی تہذیب پر مغربی تہذیب کی برتری کا احساس ہمارے لئے سب سے بڑا خوف ہے۔

مغربی تہذیب اور دیگر اقسام کے خوفوں سے مقابلے اور ان سے نجات کی ایک صورت ممکن ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم تمام جدید علوم کو مذہب اور اخلاقیات کی بنیادوں پر ترقی دیں اور خدا سے اپنے تعلق کو حقیقی معنوں میں مضبوط اور گہرا بنائیں۔ یہ بات لاکھوں مثالوں سے ثابت ہے کہ جو دل اللہ کے خوف سے بھر جاتا ہے وہ دنیا کے ہر خوف سے نجات پاجاتا ہے۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے کتنے سستے کتنے پیارے

دسمبر ۱۹۸۹ء سے قبل ممبرشپ حاصل کرنے والوں کے لیئے مہّاتی کہانیوں کی خوبصورت کتاب "حق اسکواڈ" کا تحفہ بالکل مُفت

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت اور تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبرشپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

آنکھ مچولی بیرونِ ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰/- روپے

رسالہ سال بھر تک منگوانے کے لئے دو طریقوں میں سے جو مناسب اور احسن سمجھیں اختیار کریں۔

① زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں یا

② ۱۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ اور صرف کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں۔ ہم آپ کو پہلا رسالہ وی پی بھجوا دیں گے۔ (آپ ۱۴۰ روپے کے عوض وی پی چھڑوالیں (کوپن صفحہ نمبر ۱۱۱ پر موجود ہے)

سالانہ ممبرشپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی

ڈاکیا ڈاک لایا

میرے پاس خوفناک نمبر تھا وہ گم ہو گیا۔ میں نے پورا پڑھا بھی نہیں تھا۔ بک اسٹال اور لائبریری وغیرہ چھان مارا لیکن کہیں بھی نہیں تھا۔ بک اسٹال والوں نے کہا کہ آتے ہی ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گیا۔ لائبریری والوں نے بتایا کہ جو بھی لے گیا وہ رسالہ دینے کے بجائے اس کی قیمت دے گیا۔ اگر آپ کے پاس خوفناک نمبر، ہو تو میں آپ کو پیسے بھجوا دوں ؟

○ ..... بھائی مجتبیٰ آپ یقین مانیں کہ خوفناک نمبر، کی ہمارے پاس ریکارڈ کی کاپیاں بھی نہیں ہیں ..... ہمیں آپ کی پریشانی کا اندازہ تھا اسی لئے تو ہم نے اس کا دوسرا حصہ شائع کر دیا ہے۔ فی الحال اسی پر گزارہ کیجئے۔

آپ نے خوفناک نمبر، کے لئے آنکھ مچولی پڑھنے والوں کو دعوت تحریر دی ہے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میں اپنی تحریر بڑے کاغذ پر لکھ کر ارسال کروں تو کوئی ہرج تو نہیں ہے۔

○ ..... کوئی ہرج نہیں۔ لیکن افسوس کہ آپ یہ بات اب پوچھ رہے ہیں جبکہ خوفناک نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

شیخ اعجاز تبسم، میاں چنوں

بھائی جان آپ نے تو رسالے کی خامیاں نکالنے کے لئے کھلی چھٹی دے رکھی ہے تو عرض یہ ہے کہ اسی کا ٹائٹل بالکل اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کسی مصور سے اچھی تصویریں بنوایا کریں یا پھر دلکش نظاروں کی تصویریں چھاپا کریں۔

○ ..... تبسم میاں ہم صحت مند تنقید کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر تنقید کو ہم درست بھی تسلیم کرلیں۔ ہمارا ٹائٹل بچوں کے تمام رسالوں سے زیادہ خوبصورت اور اچھوتا ہوتا ہے۔ یہ تو آپ بھی مانیں گے۔

مسرت جہاں، کراچی

آخر آپ کے رسالے میں ایک ہی رائٹر کی دو تحریریں کیوں چھپتی ہیں۔ مثلاً ایک لکھنے والے کی ایک نظم چھپی ہے اور دوسری کہانی چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اور آخر میری تحریر کس کام آئے گی۔؟

○ ..... ماشاء اللہ بڑا کانٹے کا اعتراض کیا ہے آپ نے بھئی بات یہ ہے کہ اگر ہمیں لکھنے والوں کی معیاری اور اچھی تحریریں نہ ملیں تو مجبوراً ہمیں ایک مصنف کی دو تحریریں چھاپنی پڑتی ہیں۔

قمر طارق، دبئی

یہاں بچوں کے اردو رسالے دستیاب نہیں ہیں۔ میرے چچا جان مجھے آنکھ مچولی بھجوا دیتے ہیں۔ کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ مجھے آنکھ مچولی باقاعدگی سے ہر ماہ مل جایا کرے اور اگر میں کوئی تحریر بھیجوں تو چھپ جائے گی؟

○ ..... اس کا آسان سا طریقہ یہ ہے کہ آپ آنکھ مچولی کی سالانہ خریدار بن جائیں۔ سالانہ خریداری کی رقم پرچے پر لکھی ہے۔ آپ کی تحریر اچھی ہوئی تو کیوں نہیں چھپے گی۔؟

ذاکر منیر، اسلام آباد

دسمبر کے شمارے میں محمد افتخار کھوکھر کی تحریر "نافرمانی کی سزا" اچھی ہے اسی مہینے کے "تعلیم و تربیت" میں بھی یہی کہانی شائع ہوئی ہے۔ دونوں کہانیوں میں ایک نقطے کا بھی فرق نہیں۔

○ ..... افتخار کھوکھر صاحب ایک ذمہ دار لکھنے والے ہیں۔ ہمیں خود حیرت ہے کہ انہوں نے اتنا غیر

ذمہ دارانہ طرز عمل کیوں اختیار کیا؟ اور دونوں ہی رسالوں کے اعتماد کو دھچکا پہنچایا۔ ہمیں اس سلسلے میں اور بھی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ لیکن اب سوائے صبر کرنے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

صائمہ طاہر، پشاور

انکل آپ صفحات کے نمبر اردو کے بجائے انگریزی میں دیا کیجئے تاکہ مجھے پڑھنے میں آسانی ہو کیوں کہ اردو کی گنتی مجھے نہیں آتی۔

○ ..... صائمہ بی بی۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ اگر آپ کو اردو کی گنتی نہیں آتی تو آپ کو سیکھنا چاہئے۔ آپ اسے کوشش کر کے چند دنوں میں سیکھ سکتی ہیں۔

محمد علی، مہاجر کیمپ، کراچی

میرے ذہن میں بہت سی کہانیوں کے پلاٹ ہیں۔ میں نے دو ایک کہانیاں بھی لکھ ڈالی ہیں مگر پوسٹ کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ اگر ناکامی ہوئی تو میرا دل چکنا چور ہو جائے گا۔

بھئی سچ پوچھئے تو کسی کہانی کو ناقابل اشاعت قرار دیتے ہوئے خود ہمارا دل بھی چکنا چور ہو جاتا ہے لیکن اگر ہم ان کہانیوں کو چھاپ دیں تو پڑھنے والوں کے دل چکنا چور ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ آپ کہانیاں بھیجیں تو سہی۔

تنویر احمد حیدر آباد

آج کل ہمارے ملک خصوصاً صوبہ سندھ میں جو نفرت اور عصبیت پھیلی ہوئی ہے اس کو دور کرنے کے لئے آپ اپنا کردار ادا کیجئے۔

آپ نے بڑے اہم مسئلے کی جانب توجہ دلائی ہے۔ انشاء اللہ ہم بہت جلد اس حوالے سے ایک اہم تحریری سلسلہ شروع کریں گے۔ کاش۔ حکومت اور سیاسی و سماجی ادارے بھی اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کوئی قدم اٹھائیں۔

فاروق بشیر ناظم آباد کراچی

نومبر کا شمارہ خریدا لیکن اس کے ساتھ پاکٹ کیلنڈر نہیں ملا۔ جناب۔ آپ نے کیلنڈر دیا بھی تھا یا رسالہ لانے والے صاحب نے "مک مکا" کر لیا۔

آپ کا اندیشہ درست ہے۔ ہر رسالے کے ساتھ پاکٹ کیلنڈر مفت دیا گیا ہے اور ہر بک اسٹال والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس رسالے کے ساتھ پاکٹ کیلنڈر بھی دے۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو یہ سخت بد دیانتی ہے۔ آپ اپنے بک اسٹال والے کا نام ہمیں لکھ بھیجئے اور ساتھ ہی ٹکٹ بھی تاکہ ہم آپ کو پاکٹ کیلنڈر بھجوا سکیں۔

اجلال عباس، پشاور، افتخار احمد آزاد، کھاریاں

آپ نے نومبر کے شمارے میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے، ناموں میں سے کوئی ایک نام خوصورت انداز سے لکھ بھیجئے۔ اللہ کا ہر نام خوصورت ہے اور اس طرح لکھنے سے بے حرمتی ہوتی ہے۔ پھر اس کا گناہ کس کو ملے گا؟

آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ چونکہ ننانوے نام بیک وقت لکھ بھیجنا عملاً ممکن نہیں تھا اس لئے کسی ایک نام کو لکھنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے آپ لوگوں نے یہ نتیجہ کہاں سے نکال لیا کہ نعوذ باللہ باقی اسمائے حسنہ کی بے حرمتی ہوئی ہے۔ مذہبی معاملات میں ذرا سوچ سمجھ کر جذباتی ہونا چاہئے۔

آنکھ مچولی ـــــ تحریری مباحثہ

تبصرے، تجزیئے اور اظہارِ رائے کی صلاحیت کو فروغ دینے کے لئے ماہنامہ آنکھ مچولی طلبا و طالبات کے مابین ایک تحریری مباحثے کے انعقاد کا اعلان کرتا ہے۔۔

مباحثے کی قرارداد یہ ہے

"لڑکیاں والدین کی زیادہ فرمانبردار ہوتی ہیں"

طالبات قرارداد کے حق میں اور طلبا اس کی مخالفت میں اپنے اپنے دلائل، خوبصورت اور مختصر تقریری شکل میں تحریر کر کے ۱۵ فروری تک بھجوا دیں اوّل، دوم اور سوم آنے والوں کو تین بہترین انعام دیئے جائیں گے۔ جبکہ بقیہ خوبصورت تحریریں وقتاً فوقتاً شائع کی جاتی رہیں گی۔

تحریری مباحثہ :- ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۱۲- ڈی، سائٹ کراچی ۱۶

اچھی کتابیں

سرمایۂ حیات بھی رفیقِ زندگی بھی

طالبانِ
علم وادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ھی فائدہ اُٹھایئے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ
۱ سب سے بڑا انسان ؐ۔ سیرت طیبہؐ پر سید نظر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ۔ ڈی لکس ایڈیشن	۴۰ روپے	۲۵ روپے
۲ راہ نما قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۳ سفر مبارک حجازِ مقدس کا سفر نامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام ۴ حصوں پر مشتمل۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق اسکواڈ مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۶ کہنا بڑوں کا مانو تعمیر سیرتِ اطفال کے لئے خوبصورت	۴ روپے	۳ روپے

آپ صرف ۵۰ روپے کا منی آرڈر بھیجواکر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا :- گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ۱۱۲-ڈی سائیٹ کراچی نمبر ۱۶۔ فون نمبر ۲۹۹۱۷۸

manhattan PAKISTAN

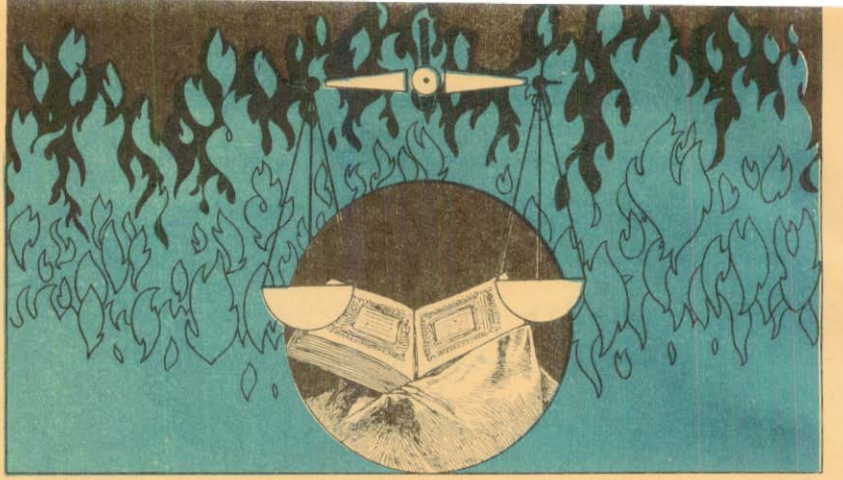

ڈرو اُس دِن سے

سیّد خورشید عالم

"اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ تم سب کو اس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔" (آیت ۸۷..... سورہ النسا)

مندرجہ بالا آیت مبارکہ قیامت کے برحق ہونے کی سب سے روشن دلیل ہیں۔ یہ وہ دن ہو گا جب تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اور ان کے اعمال کے مطابق سزا یا جزا کا فیصلہ ہو گا۔ اس دن کی ہولناکی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے جس کی طرف سورہ قارعہ کی اس آیت میں اشارہ ہے۔ یعنی

"(وہ قیامت ہے) جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسی دھنکی ہوئی رنگ برنگ کی اون"..... (آیت ۴ تا ۵)

اس دن کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ نہ سفارش چلے گی اور نہ رشوت دے کر بچاؤ کا سامان ہو سکے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں نیک اعمال کئے ہوں گے ان کو اس دن کوئی خوف نہ ہو گا۔ البتہ جنہوں نے دنیا میں فسق و فجور کے ساتھ وقت گزار کر اس دنیا کو گناہوں سے بھر دیا ان کا نہایت ہولناک انجام ہو گا۔ اسی بات کو سورۃ بقرہ کی اس آیت میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ "اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا۔ نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔ نہ کوئی سفارش ہی آدمی کو فائدہ

دے گی..... اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔ " ..... (آیت ۱۲۳)

اسی بات کو سورۃ المعارج کی ایک آیت میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ۔

" مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا، اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے۔ ہر گز نہیں۔ وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی۔ " (آیت ۱۱ تا ۱۷)

جن لوگوں کا جرم اس دن ثابت ہو جائے گا ان کے بارے میں سورۃ مریم کی ایک اور آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ

" اور مجرموں کو پیاسے جانوروں کی طرح جہنم کی طرف ہانک لے جائیں گے۔ " (آیت ۸۶)

اسی بات کو سورۃ طٰہٰ کی ایک آیت میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ۔

" حقیقت یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گا اس کے لئے جہنم ہے۔ جس میں وہ نہ جیئے گا نہ مرے گا۔ " ..... (آیت ۷۴)

سورۃ الکہف کی ایک اور آیت بھی اس کی طرف اس انداز میں روشنی ڈالتی ہے کہ۔

" سارے مجرم اس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب انہیں اس میں سے گزرنا ہے۔ اور وہ اس سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے۔ " (آیت ۵۳)

اسی طرح جن لوگوں نے اللہ کی زمین کو ظلم سے بھر دیا ان کا انجام بھی قیامت میں نہایت ہولناک ہو گا۔ دنیا کی زندگی میں قوت اور دولت کے بل بوتے پر ممکن ہے کہ ان سے مواخذہ نہ ہو سکے اور عموماً ایسا بھی ہوتا ہے۔ مگر قیامت کے روز ان کا انجام بڑا دردناک ہو گا۔ سورۃ القصص کی ان آیات میں اس کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

" اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ ہم نے انہیں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیش رو بنا دیا اور قیامت کے روز وہ کہیں سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے۔ ہم نے اس دنیا

میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے روز وہ بڑی قباحت میں مبتلا ہوں گے۔" ..... (آیت ۴۰ تا ۴۲)

سورۃ طٰہٰ کی اس آیت میں ایسے لوگوں کی طرف مزید اشارہ ہے۔

"اس دن جبکہ صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس حال میں گھیر لائیں گے کہ ان کی آنکھیں (دہشت کے مارے) پتھرائی ہوئی ہوں گی۔" ..... (آیت ۱۰۲)

ظالم لوگوں کو قیامت سے پہلے ہی جس عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا وہ موت کا وقت ہو گا۔ خاص بات یہ ہے کہ جو متقی ہوتا ہے اسے اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا ہر وقت انتظار رہتا ہے۔ جبکہ گناہ گار ہمیشہ موت سے ڈرتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے موت بھی بڑی ہولناکیاں لے کر آتی ہے۔

اسی بات کو سورۃ الانعام کی اس آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ۔

"کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جبکہ وہ سکرات موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ لاؤ نکالو اپنی جان۔ آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے۔ اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے۔" ..... (آیت ۹۳)

ایسے لوگ قیامت کے روز کس طرح پہچانے جائیں گے اس کی طرف سورۃ رحمٰن کی ایک آیت میں واضح طور پر اشارہ موجود ہے کہ

"مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لئے جائیں گے اور انہیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔" ..... (آیت ۴۱)

اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق نہ چلنے والوں کا انجام سورۃ طٰہٰ کی آیات میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ

"اور جو میرے ذکر (درس نصیحت) سے منہ موڑے گا۔ اس کے لئے دنیا میں تنگ زندگی ہو گی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا پروردگار دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا یہاں مجھے کیوں اندھا اٹھایا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ ہاں اسی طرح تو ہماری آیات کو جبکہ وہ تیرے پاس آئی تھیں، تو نے بھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے۔" ..... (آیت ۱۲۴ تا ۱۲۶)

البتہ نیک لوگ جنہوں نے ہمیشہ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر قدم رکھا اس دن کسی خوف کا شکار نہ ہوں گے۔ اس کی طرف سورۃ الانبیاء کی ان آیات میں بیان فرمایا گیا ہے کہ۔

"رہے وہ لوگ جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہو گا تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے۔ اس کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی من بھاتی چیزوں کے درمیان رہیں گے۔ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا۔ اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔" ...... (آیت ۱۰۱ تا ۱۰۳)

مفکر اسلام مونالا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"اس وقت نیک لوگوں پر ایک اطمینان کی کیفیت طاری رہے گی۔ اس لئے کہ سب کچھ ان کی توقعات کے مطابق ہو رہا ہو گا۔ ایمان و عمل صالح کی جو پونجی لئے وہ دنیا سے رخصت ہوئے تھے وہ اس وقت خدا کے فضل سے ان کی ڈھارس بندھائے گی اور خوف و حزن کے بجائے ان کے دلوں میں یہ امید پیدا کرے گی کہ عنقریب وہ اپنی سعی کے نتائج خیر سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔"

اعلانات

ماہنامہ آنکھ مچولی

◇ ـــــ طلباؤ طالبات کے لئے آنکھ مچولی اسکالرشپ کے نتیجے کا اعلان آئندہ ماہ فروری ۱۹۹۰ء کے شمارے میں کر دیا جائے گا۔ انشاءاللہ

◇ ـــــ جن حضرات نے "تعلیم الاسلام" کے حصول کے لئے ڈاک ٹکٹ بھجوائے ہوئے ہیں اُن کی اطلاع کے لئے۔

"تعلیم الاسلام" کا نیا اور خوبصورت ایڈیشن طبع ہونے کے بعد
(اندازاً اختتام جنوری تک) آرڈرز کی تعمیل کر دی جائے گی۔

آیئے آیئے خوف نہ کھایئے

سید ایاز محمود

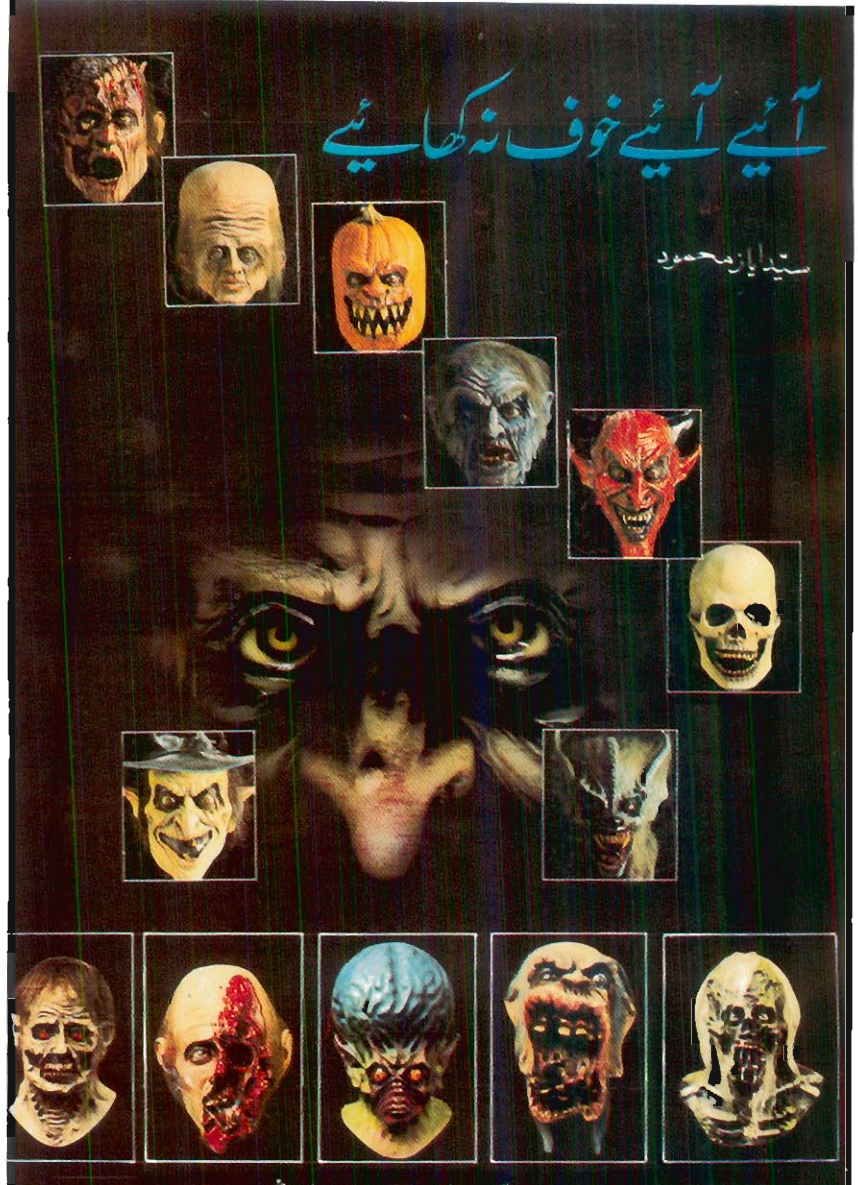

اختر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی جونہی بتی جلائی تو کمرے میں موجود بھیانک شخص کو دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے چیخنا چاہا مگر مارے دہشت کے اس کی آواز تک نہ نکل سکی۔ خوفناک شخص اپنی شعلہ بار آنکھوں سے اختر کو مسلسل گھور رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے نوکیلے دانت اور بائیں آنکھ سے نیچے جبڑے کی طرف آتا ہوا زخم کا نشان اجنبی شخص کی بدصورتی کو مزید بھیانک بنا رہا تھا۔

ہا ہا ہا . . . اُس نے اختر کو دیکھتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

تمام تر ڈر اور خوف کے باوجود اختر کو قہقہے کی آواز جانی پہچانی لگی۔

"تم ۔ تم ۔ !" اُس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اجنبی شخص نے مٹھی میں اپنے بال پکڑے اور ایک جھٹکے سے اپنا چہرہ اُتار کر پھینک دیا۔

ہا ہا ہا . . . شجو بھائی ماسک اُتارنے کے بعد بھی بے ساختہ ہنستے جا رہے تھے۔

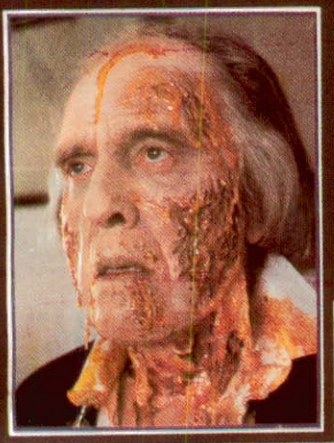

"بس دیکھ لی تمہاری بہادری" انہوں نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اگر میں پانچ سیکنڈ تک مزید ماسک پہنے رہتا تو جناب کو چ ہی کر گئے ہوتے۔ ویسے بے ہوش ہونے میں تو آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

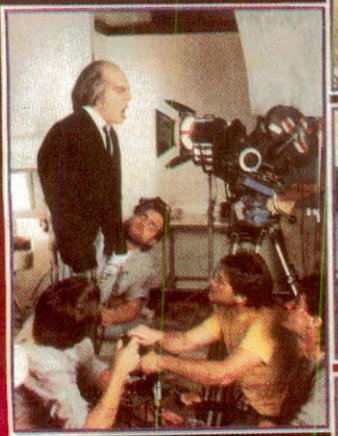

اختر نے اطمینان کا سانس لیا کہ بھیانک چہرے والا اجنبی کوئی اور نہیں بلکہ ان کے شجو بھائی تھے جو ماسک پہن کر سب بچوں کو باری باری ڈرا رہے تھے۔

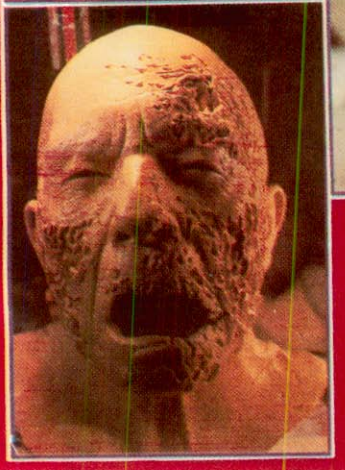

اسی قسم کے ڈرانے والے ماسک آپ نے بھی دکانوں پر دیکھے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے انہیں دوسروں کو ڈرانے کے لئے استعمال کیا ہو یا پھر خود ہی ڈر گئے ہوں۔ یہ تو ایک مذاق کی بات ہے، لیکن ایسا مذاق کبھی کبھار کمزور دل والوں کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

بہت سے لوگ اس بات سے ناواقف ہیں کہ ماسک کا اس

کے علاوہ بھی کوئی اور کام ہے کہ اسے
پہن کر جھوٹی موٹی کسی کو ڈرا دیا جائے۔ اگر آپ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں تو اپنی معلومات میں اضافہ کر لیجئے کہ ماسک یا نقلی چہرے کا ایک تاریخی پس منظر ہے اور وہ یہ کہ اس کا تعلق پتھر کے زمانے کے انسان سے ہے۔ اس زمانے کا انسان جب شکار پر نکلتا تو جنگلی جانوروں کو دھوکہ دینے کے لئے ماسک استعمال کرتا۔ لہٰذا ماسک کی تاریخ کا سرا تاریخ انسانی کے اولین ادوار سے ملتا ہے۔

قدیم یونان اور روما کی تہذیبیں ہماری تاریخ کا ایک اہم ترین حصہ ہیں۔ ان قدیم معاشروں میں جنگ کے موقع پر فوجیں دشمن کو مرعوب کرنے اور اسے ڈرا کے بھگانے کی غرض سے ماسک پہنا کرتی تھیں۔

دنیا کی مختلف تہذیبوں میں ماسک کی ثقافتی اور مذہبی حیثیت مسلّم ہے۔ خاص خاص تہوار پر اس کو پہننے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک مثلاً یورپ کے بعض خطوں میں بھی ماسک لوک رقص اور تماشوں کا ایک لازمی جز ہے۔

ماسک کی تیاری میں دھاتوں، کھالوں، کپڑے، لکڑی، کاغذ، چمڑے، مٹی، پروں، سینگوں اور حتیٰ کہ ہاتھی کے دانت تک کا استعمال مروج رہا ہے۔ آج کل فلم، ٹی وی اور تھیٹر کی دنیا میں جو ماسک استعمال کئے جاتے ہیں وہ عموماً ایک خاص قسم کی ربر سے بنتے ہیں اور ان کی تیاری صنعتی سطح پر کی جاتی ہے۔ خوف ڈر اور سائنس فکشن کے فلموں مثلاً اسٹار وارز، ایلین، اسٹار ٹریک وغیرہ کی تیاری میں ماسک کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ کچھ سالوں پہلے ٹی وی پر دکھائی جانے والی فلم سیریز "پلانیٹ آف دی ایپس" کے تو تمام کردار ہی بن مانسوں کے گیٹ اپ میں تھے۔ یہ بھی ماسک کا کمال تھا۔

ماسک کی تیاری ایک مرحلہ وار عمل ہے۔ اس میں سب سے پہلے ڈھلائی کے مخصوص فرمے بنائے جاتے ہیں۔ دوسرے مرحلے میں ربر کی ایک قسم لیٹکس کو مائع حالت میں ان فرموں میں بھرا جاتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد لیٹکس کو باہر انڈیل لیا جاتا ہے۔ اس عمل میں ربر کی ایک پتلی سی تہہ فرمے کے ساتھ چپکی رہ جاتی ہے جسے سوکھ جانے پر ماسک کی شکل میں حاصل کر لیا جاتا ہے۔

خوفناک غزل

شاھنواز فاروقی

خوف کی اک اور وادی کا سفر
ہو رہا ہے آپ کے اصرار پر

اس سفر میں حادثے پیش آئیں گے
ہر قدم پر آپ کو کاٹے گا ڈر

آپ کے بستر پہ سوئے گی چڑیل
دیکھ لینا روز گھوڑے بیچ کر

آپ کی مردوں سے ہوگی دوستی
آ چڑھے گا جن کا بچّہ آپ پر

ایک سایہ آئے گا چپکے سے اور
کاٹ کر لے جائے گا تم سب کے سر

خون کے پیالے پیو گے تم سبھی
اور ناگن کھاؤ گے تم بھون کر

دیکھتے ہی دیکھتے کالا پہاڑ
بھر بھرا کر گر پڑے گا آپ پر

گفتگو فرمائے گی رستے کی دھول
اور ہاتھی جائے گا چوہے کے گھر

مختصر یوں ہے کہ یہ پورا سفر
لمحہ لمحہ خوف میں ہوگا بسر

ہاں مگر ان حادثوں کے باوجود
آپ سب لوٹیں گے زندہ اپنے گھر

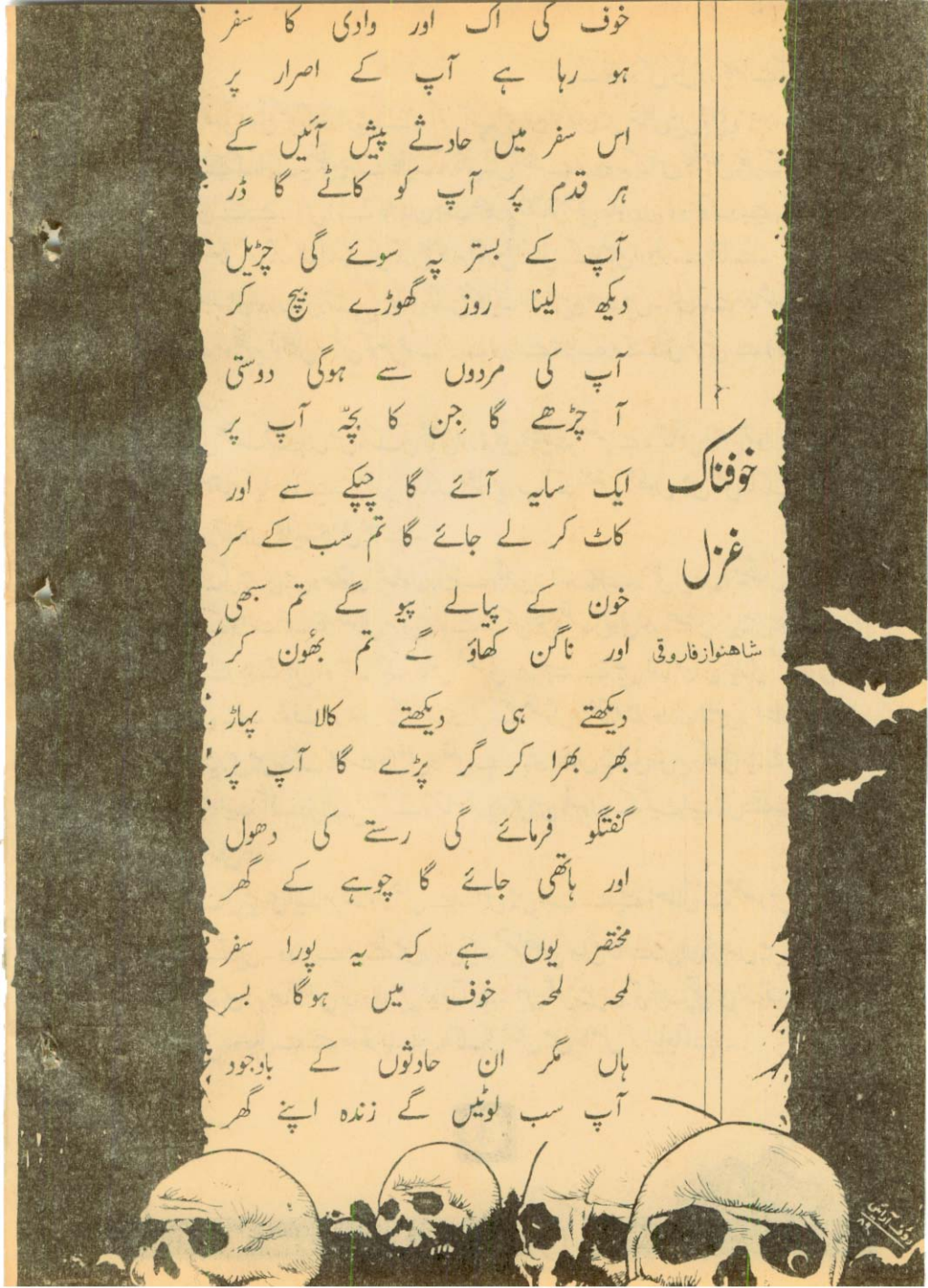

پُراسرار قلعہ

مُحمّد ادریس قریشی

وہ آسیب زدہ قلعہ کا راز جان لیتے مگر ....

"راشد! تم نے آج کا اخبار پڑھا ہے" ۔ ساجد نے کہا۔

"نہیں..... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو" ۔ راشد بولا۔

"آج اس میں ایک خبر چھپی ہے" ۔

"لو! اور سنو..... بھئی اخبار میں اگر کوئی خبر چھپی ہے..... تو اس میں انوکھی بات کیا ہے..... اخبار میں تو روزانہ ہی سیکڑوں خبریں چھپتی رہتی ہیں" ۔

"نہیں بھئی! تم نہیں سمجھے..... دراصل یہ خبر ہمارے مطلب کی ہے" ۔ ساجد مسکرایا۔

"ہمارے مطلب کی خبر کیسی ہوتی ہے؟" راشد بولا۔

"جاسوسی، قسم کی" ۔

"اوہ اچھا..... میں سمجھ گیا..... اچھا بتاؤ کیا خبر ہے" ۔

"لو تم خود ہی پڑھ لو" ۔ ساجد نے اپنے بستے میں سے تہہ کیا ہوا اخبار نکال کر راشد کو دے دیا۔

"تو تم مجھے دکھانے کے لئے آج اخبار اسکول میں ہی لے آئے" ۔

"ہاں! اب جلدی سے یہ خبر پڑھو....." ۔ ساجد نے اخبار پر انگلی رکھ کر بتایا۔ اور راشد پڑھنے لگا۔

"آسیبی قلعے نے دو افراد کی جان لے لی۔"

"قصبہ نور پور سے کچھ فاصلے پر ایک دو سو سال پرانا آسیبی قلعہ ہے..... اس کے اندر داخل ہونے والا کوئی شخص آج تک زندہ باہر نہیں آیا..... کل نور پور کے لوگوں کے منع کرنے کے باوجود دو سر پھرے مسافر قلعے کے اندر داخل ہو گئے..... اور چند گھنٹے بعد ہی ان کی لاشیں قلعے سے کچھ فاصلے پر پائی گئیں۔ مرنے سے پہلے ان دونوں کی آنکھیں خوف کے مارے حلقوں سے باہر نکلی پڑی تھیں۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے..... اس سے پہلے بھی اس قسم کے کئی واقعات ہو چکے ہیں..... اور پولیس کی ایک تفتیشی ٹیم بھی قلعہ کے اندر جانے کی وجہ سے ہلاک ہو گئی تھی" ۔

یہ خبر پڑھ کر راشد نے اخبار ڈیسک پر رکھا..... اور بولا۔

"بھئی! تم تو کہہ رہے تھے کہ کوئی جاسوسی، قسم کی خبر ہے لیکن یہ تو....."

"ہاں ہاں کہہ دو کہ یہ تو آسیبی قسم کی خبر ہے" ۔ ساجد نے اس کی بات پوری کی اور کہنے لگا۔

"لیکن میرے بھولے بادشاہ یہ آسیب واسیب کوئی چیز نہیں ہوتی..... یقیناً اس قلعے میں کوئی جرم ہو رہا ہے..... اور مجرموں نے لوگوں کو قلعے سے دور رکھنے کے لئے آسیب کا چکر چلا رکھا ہے..... اب تم ذرا سوچو کہ ہم اگر قلعے میں جائیں اور....."

"یعنی کہ ہم..... ہم قلعے میں جائیں" ۔ راشد اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"واہ بھئی! ڈرپوک خان..... تم تو ابھی سے ڈرنے لگے پھر وہاں جا کر تو کیا تیر مارو گے" ۔

"نہیں نہیں..... میں ڈرپوک نہیں ہوں..... میں ضرور جاؤں گا قلعے میں" ۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر ہم اس قلعے میں جائیں..... اور وہاں پر ہونے والے جرم اور مجرموں کو بے نقاب کر دیں..... تو یہ ہمارا کتنا بڑا کارنامہ ہو گا..... ذرا سوچو! ہماری تو دھوم مچ جائے گی" ۔

"ہاں! یہ تو ٹھیک ہے لیکن فرض کرو کہ وہاں پر آسیب نہیں ہے مجرموں کا پھیلایا ہوا کوئی جال

ہے..... لیکن ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے" ۔

"ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا..... میں اپنے انکل جبران سے ریوالور لے لوں گا..... بارہ گولیوں کے چیمبر والا ہے" ۔ ساجد نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے..... پھر کب کا پروگرام بنائیں" ۔ راشد بولا۔

"کل سے گرمیوں کی چھٹیاں ہو رہی ہیں..... تین ماہ کے لئے ہمارے اسکول بند رہیں گے..... لہٰذا پرسوں یعنی بدھ کا دن ٹھیک ہے..... ویسے بھی قصبہ نور پور زیادہ دور نہیں ہے..... صرف یہاں سے چالیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہی تو ہے" ۔

"اور والدین سے اجازت کس طرح لیں گے" ۔ راشد نے پوچھا۔

"بالکل آسانی سے" ۔

"وہ کس طرح" ۔

"بھئی! سیدھی سی بات ہے..... ہم انہیں یہ بات بتائیں گے ہی کب..... کہ ہم کسی پراسرار قلعے میں جا رہے ہیں..... ہم تو سیر کا بہانہ کریں گے" ۔

"اوہ ویری گڈ! تو پھر پروگرام پکا" ۔

"ہاں پکا" ۔

"اور وہ ریوالور لانا نہ بھولنا" ۔ راشد بولا۔

"وہ تو میں آج ہی لے لوں گا" ۔ ساجد ہنسا۔

راشد اور ساجد دسویں کے طالب علم تھے..... جاسوسی ناول بہت شوق اور کثرت سے پڑھتے تھے..... ساجد خود کو کرنل فریدی اور راشد خود کو عمران سمجھتا تھا۔ ساجد کی نسبت راشد ڈرپوک تھا..... اسکول میں چھٹی ہوئی تو وہ سارے راستے قلعے کے بارے میں سوچتا رہا..... ویسے تو وہ قلعے میں جانا نہیں چاہتا تھا..... لیکن ساجد کے سامنے اپنی بہادری جتانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

بس سے اتر کر وہ دونوں قصبے میں داخل ہو گئے..... شام کے پانچ بج رہے تھے..... ایک دوکان سے انہوں نے ٹھنڈی بوتلیں لیں۔ بوتل پیتے ہوئے ساجد نے دوکاندار سے پوچھا۔ "یہ آسیبی قلعہ کہاں کو ہے جناب" ۔

"کک کیوں..... تم کیوں پوچھ رہے ہو" ۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"اسے دیکھیں گے اور کیا" ۔ ساجد بولا۔

"کیوں! کیا اس دنیا سے تنگ آ گئے ہو بچو..... ابھی تو تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں..... قلعے کو دیکھ کر کیوں اپنی موت کو آواز دیتے ہو" ۔

"کیوں کیا اس قلعے کو باہر سے دیکھنے سے بھی ہم مر جائیں گے" ۔

"نہیں صرف اندر جانے سے" ۔

"تو بس پھر ہم تو باہر سے ہی دیکھیں گے..... اندر تھوڑا ہی جائیں گے ہم" ۔ ساجد بولا۔

"ہاں اور کیا..... ہمیں کیا خود سے دشمنی ہے" ۔ راشد نے کہا۔

دو کاندار نے انہیں قلعہ صرف باہر سے دیکھنے کی تاکید کرتے ہوئے راستہ سمجھا دیا..... اور پھر بوتلوں کے پیسے ادا کرنے کے بعد وہ قلعے کی طرف چل پڑے..... اور تقریباً دس منٹ بعد وہ قلعے کے سامنے کھڑے تھے..... قلعہ بہت بڑا تھا..... یوں تھا کہ جیسے کوئی جن چادر اوڑھے کھڑا ہو..... قلعے کا پھاٹک لکڑی کا تھا..... اور قلعے کی مناسبت سے وہ بھی بہت بڑا تھا..... پھاٹک پر لوہے کی موٹی موٹی کیلیں لگی ہوئی تھیں جو اب زنگ آلود ہو چکی تھیں.....

"یہ تو بند ہے..... اب اسے کھولیں کیسے" ۔ راشد بولا۔

"کھلا ہی ہو گا..... ذرا دھکا تو مار کر دیکھو" ۔ ساجد نے کہا۔

"مم..... میں..... یعنی کہ میں" ۔ راشد ہکلایا۔

"ہاں بھئی! تم کونسے ڈرپوک ہو..... میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا" ۔ ساجد بولا۔

"اور میں بھی تمہیں ڈرپوک نہیں سمجھتا تھا" ۔ راشد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اچھا تو یوں کرتے ہیں..... دونوں مل کر دروازے کو دھکا لگاتے ہیں..... ایک سے تو یہ ویسے بھی نہیں کھلے گا" ۔ ساجد بولا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے" ۔ راشد نے کہا۔

اور دونوں نے مل کر دھکا لگایا..... لکڑی کا بہت بڑا پھاٹک چوں..... چراں کی آوازیں نکالتا ہوا کھل گیا..... سامنے اینٹوں کا فرش دور تک جا رہا تھا..... آگے برآمدے میں قطار در قطار کمرے تھے..... وہ دونوں ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہو گئے..... چند لمحے وہ وہیں کھڑے رہے..... جیسے سوچ رہے ہوں کہ آگے جائیں یا نہ جائیں..... اور پھر وہ حوصلہ کر کے آگے بڑھ ہی گئے..... اینٹوں کے فرش

پر چلتے ہوئے وہ برآمدے تک آ گئے..... ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی..... اب ان کا حوصلہ بڑھا..... وہ دو سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں داخل ہو گئے..... ساجد نے ایک کمرے کا دروازہ اندر کی طرف دھکیلا..... دروازہ کھلتے ہی کوئی زوردار چیز اس کے ماتھے سے ٹکرائی..... اس نے زوردار چیخ ماری..... راشد سر سے پاؤں تک کانپ گیا..... اور پھر دونوں ہی ہنسنے لگے..... وہ ایک چمگادڑ تھی..... جو ساجد کے سر سے ٹکرائی تھی..... انہوں نے کمرے میں ہر طرف نظر دوڑائی..... کمرہ گرد و غبار اور کاٹھ کباڑ سے اٹا پڑا تھا..... چھتوں پر لمبے لمبے جالے لٹک رہے تھے..... کئی چمگادڑیں چھت پر الٹی لٹکی ہوئی تھیں.....

"اس کمرے میں تو کوئی جن بھوت نہیں ہے..... آؤ دوسرا کمرہ دیکھیں" ۔ ساجد بولا۔ اور وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھے..... اسی وقت ایک زوردار آواز گونجی "دھڑام" ۔

"بھاگو" ۔ ساجد چلایا..... اور راشد کا ہاتھ پکڑ کر پھاٹک کی طرف بھاگا..... اور پھر ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی..... پھاٹک بند ہو چکا تھا..... جب کہ وہ کھلا چھوڑ کر گئے تھے.....

"ہو گیا جنوں کا کام شروع..... پکڑ لو اب مجرموں کو" ۔ راشد خوف سے کانپتا ہوا بولا۔

"حوصلہ مت ہارو..... آؤ کھول کر دیکھتے ہیں" ۔ ساجد بھی ڈری ڈری آواز میں بولا۔ اور پھر انہوں نے لوہے کا بڑا سا کنڈا پکڑ کر کھینچا..... مگر پھاٹک ٹس سے مس نہ ہوا.....

"یہ تو ایسا لگتا ہے..... جیسے باہر سے کسی نے بند کر دیا ہو" ۔ ساجد نے کہا۔

"اب کیا ہو گا..... باہر تو دور دور تک کوئی نہیں تھا" ۔ راشد بولا۔

"ڈرنے سے کچھ نہیں ہو گا..... آؤ اندر چلیں..... پھاٹک تو بند ہو ہی چکا ہے..... قلعہ تو اچھی طرح دیکھ لیں" ۔ ساجد بولا۔

"تم ہی دیکھتے پھرو قلعہ..... میں تو یہی کھڑا رہوں گا" ۔ راشد نے لوہے کے کنڈے کو مضبوطی سے پکڑ لیا..... وہ تھر تھر کانپ رہا تھا..... اسی وقت انہوں نے اپنے پیچھے خوفناک آوازیں سنیں۔

ہاہاہاہا..... ہی ہی ہی ہی..... ہے ہے ہے ہے..... ہو ہو ہو ہو.....

ان دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا..... تو خوف کے مارے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... ایک جن ان کی طرف آ رہا تھا..... جن کے جسم پر ہر طرف آگ کے شعلے دہک رہے تھے..... آنکھیں سرخ انگارے جیسی تھیں..... اس جن نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے ہوئے تھے..... دونوں ہاتھوں کے ناخن نوکیلے، مڑے ہوئے اور تقریباً چھ، چھ انچ لمبے تھے.....

ہاہاہاہاہا..... قہقہہ قہقہہ..... ہی ہی ہی ہی..... وہ بے اختیار قہقہے لگا رہا تھا..... راشد اور ساجد کو شدید گرمی کا احساس ہوا..... جن ان کے بالکل قریب آ چکا تھا..... وہ دونوں بلند آواز میں چیخے..... اور پھر تڑپ کر نیچے گرے..... انہیں کوئی ہوش نہ رہا.....

سب سے پہلے راشد کی آنکھ کھلی..... اس نے اپنے ارد گرد دیکھا..... وہ ایک ستون کے ساتھ رسیوں سے بندھا ہوا تھا..... اسی ستون کے ساتھ ساجد بھی بندھا ہوا تھا..... وہ ابھی تک بے ہوش تھا..... راشد نے ساجد کو آوازیں دیں..... چند لمحوں بعد وہ بھی ہوش میں آ گیا..... یہ ایک بہت بڑا ہال تھا.....

"یہ..... یہ کیا ہوا" ۔ راشد ہکلایا۔

"ہم قید کر لئے گئے ہیں" ۔ ساجد بولا۔

"اف..... کتنا خوفناک جن تھا..... کیا تمہیں ابھی بھی یقین نہیں آیا..... کہ یہ قلعہ آسیب زدہ ہے" ۔ راشد نے اختیار جھرجھری لی۔

"اور وہ بیگ نہ جانے کہاں ہے..... جس میں ریوالور، ٹارچ اور کھانے پینے کا سامان تھا" ۔ ساجد نے کہا۔

"جن کے پاس ہی ہو گا..... اور....." ۔ راشد کی بات درمیان میں ہی رہ گئی..... اسی وقت ان کے سامنے والی دیوار درمیان میں سے پھٹی..... ایک خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی..... درمیان میں سے دیوار پھٹنے کے بعد دائیں بائیں سرک گئی..... اب سامنے ایک خلاء نظر آ رہا تھا..... پھر اس میں سے دو نہایت ہی کریہہ الصورت چڑیلیں نکلیں..... ان کے گلے میں کھوپڑیاں لٹک رہی تھیں..... اور پاؤں میں گھنگھرو بندھے ہوئے تھے..... وہ چیخ رہی تھیں..... اچھل رہی تھیں..... قہقہے لگا رہی تھیں..... گھنگھروؤں کی خوفناک چھن چھن کی آواز کان پھاڑ رہی تھی اور ان کے ڈراؤنے قہقہے دل دہلا رہے تھے۔ اور پھر وہ دونوں چڑیلیں ستون کے ارد گرد دائرے میں ناچنے لگیں..... ناچتے ناچتے وہ

اپنے پنجے جو نہایت خوفناک تھے یکدم آگے بڑھا دیتیں..... راشد اور ساجد بے اختیار چیخ رہے تھے..... اور پھر دیوار کے خلاء میں سے وہی جن قہقہے لگاتا باہر نکل آیا..... اسے دیکھ کر چڑیلوں نے اپنا منحوس ناچ بند کر دیا..... "میری پیاری بیویو..... جاؤ دیوتا کی مقدس تلوار لے آؤ..... اب مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہو رہی" ۔ جن کی آواز بہت کھردری اور عجیب سی تھی..... چڑیلیں فوراً ہی ناچتی ..... گاتی اور اچھلتی ہوئے ہال کے ایک کونے کی طرف بڑھیں..... وہاں ایک پتھر کا مجسمہ پڑا تھا..... چڑیلوں نے مجسمے کے جسم سے بندھی ہوئی ایک تلوار اتار لی..... تلوار سے خون ٹپک رہا تھا..... خون زمین پر گرتا اور چھن کی آواز سے غائب ہو جاتا..... چڑیلوں نے تلوار جن کے حوالے کر دی جن آگے بڑھا..... اور تلوار سر سے بلند کر لی اور پھر یک دم راشد اور ساجد کے سروں پر دے ماری..... راشد کی چیخ بہت بلند تھی.....

"کیوں چیخ رہے ہو..... کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے" ۔ راشد کو اپنے بڑے بھائی کی آواز سنائی دی..... راشد نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور بڑبڑایا ۔ "اوہ تو میں خواب دیکھ رہا تھا" ۔ اور پھر باقی رات راشد آرام سے سویا.....

اس نے فیصلہ کر لیا تھا..... کہ صبح اٹھ کر ساجد سے دوٹوک کہہ دے گا..... کہ میں قلعے میں نہیں جاؤں گا..... تم جاؤ یا نہ جاؤ.....

آج منگل تھا..... اسکول میں تین ماہ کی چھٹیاں ہو رہی تھیں..... راشد کو اسکول میں داخل ہوتے ہی ساجد نظر آ گیا..... ابھی راشد کچھ بولا بھی نہیں تھا..... کہ ساجد بول اٹھا..... "اب ہم قلعے میں نہیں جا سکتے" ۔ "ارے! وہ کیوں" ۔ راشد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لئے کہ وہ کل والی خبر جھوٹی تھی..... لو یہ آج کا اخبار دیکھو" ۔ راشد نے جلدی سے اخبار پر نظریں دوڑائیں..... اور ایک خبر پر نظریں آ کر ٹھہر گئیں..... لکھا تھا..... "نمائندے کو جرمانے کی سزا" ۔ کل پراسرار قلعے کے بارے میں شائع ہونے والی خبر جھوٹی ثابت ہو گئی ہے..... یہ خبر ارسال کرنے والے نمائندے کو ملازمت سے معطل کر دیا گیا ہے اور اخبار کے مدیر نے اپنے قارئین سے معذرت کی ہے۔

خبر پڑھ کر راشد مسکرا دیا۔ سب سے زیادہ اطمینان تو اسے اس بات کا تھا..... کہ ساجد کے سامنے اس کی بزدلی کا پول نہیں کھلا تھا.....

manhattan PAKISTAN

سمندر کے بھوت

نادیہ امتیاز

چند سچے خوفناک واقعات

سترھویں صدی کے ایک ولندیزی جہازراں کیپٹن کارنیلئس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ضدی، خود سر اور سخت گیر آدمی تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود سے بھی منکر تھا اور یہ بات اس کے لئے عذاب الٰہی کا سبب بن گئی۔ ایک ایسے عذاب کا جو ابد تک جاری رہے گا۔

ایک مرتبہ اس کا جہاز بٹاریہ سے ہالینڈ کے لئے روانہ ہوا تو باد مخالف اس کے لئے بہت بڑی رکاوٹ بن گئی۔ ان دنوں بادبانوں والے جہاز ہوا کرتے تھے اور انھیں اپنا سفر طے کرنے کے لئے

موافق ہوا در کار ہوتی تھی۔ کیپٹن کارنیلئس سمندر کے بیچوں بیچ نو ہفتوں تک باد موافق کا انتظار کرتا رہا۔ مگر جب موافق ہوا نہ چلی تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا اور مدد کی درخواست کرتا مگر وہ الثا قدرت کو کوستے ہوئے کہنے لگا "میں خدا کے سامنے گڑ گڑانے کی بجائے قیامت کے دن تک موسم سے لڑتا رہوں گا"۔

یہ رات کا وقت تھا۔ اچانک اندھیرے میں آسمان سے ایک روشن ہیولا نیچے آتا دکھائی دیا۔ بالآخر یہ روشن ہیولا جہاز کے عرشے پر آرکا۔ جہاز کے حیرت زدہ ملاح اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے مگر کیپٹن کارنیلئس تن کر کھڑا رہا۔ اس نے نہ صرف وہی الفاظ دہرائے بلکہ اپنی پیٹی میں اڑسا ہوا پستول نکال کر اسی ہیولے پر گولی بھی چلا دی مگر ہیولے پر گولی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تب اس ہیولے نے کہا۔

"کیپٹن کارنیلئس! تم نے کہا ہے کہ خدا کے سامنے گڑ گڑانے کی بجائے تم روز حشر تک موسموں سے لڑتے رہو گے۔ تمہارے ساتھ ایسا ہی ہو گا۔ تم نہ کھا سکو گے، نہ پی سکو گے، نہ سو سکو گے اور نہ ہی کبھی اپنی سرزمین وطن پھر دوبارہ دیکھ سکو گے۔ تم قیامت کے دن تک سات سمندروں میں گھومتے رہو گے"۔

یہ کہہ کر وہ ہیولا غائب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ کیپٹن کارنیلئس کا جہاز آج بھی لوگوں کو بادبانوں کے سہارے مختلف سمندروں میں سفر کرتا دکھائی دیتا ہے اور یہ اسی جہاز کا بھوت ہے۔

جہاز کا بھوت

شہنشاہ برطانیہ جارج پنجم نے فلائنگ ڈچ مین نامی ایک جہاز کا بھوت دیکھا تھا۔ جاج پنجم ہندوستان کا بھی حکمراں تھا۔ (کراچی میونسپل کارپوریشن کی عمارت اسی کی سلور جوبلی کے موقع پر تعمیر کی گئی تھی۔ یہ سلور جوبلی ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی۔)

"انگلستان کے بادشاہوں کو آج بھی بحریہ کی تربیت کے لئے جہازوں پر جانا بلکہ عملی طور پر کام کرنا پڑتا ہے۔ جارج پنجم نے بھی یہ تربیت حاصل کی تھی۔ جب اس نے فلائنگ ڈچ مین کا بھوت دیکھا تھا، وہ بکانتے ( ) نامی جہاز پر تھا جو ۱۸۸۱ء میں ملبورن سے سڈنی جا رہا تھا۔ اسی سفر میں جارج پنجم اور بارہ ملاحوں نے اسے دیکھا تھا۔ پھر ۱۹۱۱ء میں وہیل مچھلیوں کا شکار کرنے والے ایک

جہاز نے بھی اسے دیکھا تھا۔ فلائنگ ڈچ مین کا یہ بھوت شکاری جہاز سے ٹکرانے ہی والا تھا کہ اس کے اندر سے تین بار گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی اور وہ دوسری جانب مڑ کر غائب ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ جہاز ہر سات برسوں کے بعد کسی ساحل پر لنگر انداز ہوتا ہے اور کچھ عرصے بعد پھر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو جاتا ہے"۔

کولمبس کے ساتھی کا بھوت

مشہور جہازراں سلوکم نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک ملاح کی حیثیت سے کیا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ اعلیٰ پائے کا جہازراں بن گیا اور اس نے ایک چھوٹا سا جہاز خرید لیا مگر شومئی قسمت سے وہ جہاز تباہ ہو گیا تو اسے بوسٹن شپ یارڈ میں ملازمت کرنا پڑ گئی۔ دو سال بعد یعنی ۱۸۹۲ء میں وہیل مچھلیوں کا شکار کرنے والے جہاز کے ایک نرم دل کیپٹن نے سلوکم کو ایک کشتی دے دی جو سات برسوں سے ناکارہ پڑی تھی۔ سلوکم نے "اسپرے" نامی اس کشتی کو از سر نو بنایا اور یکم جولائی ۱۸۹۵ء کو میسا چوسیٹس کی ایک بندرگاہ یارماؤتھ سے تن تنہا دنیا کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس نے اس سفر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میں اپنی بادبانی کشتی میں جب بہت زیادہ تنہائی محسوس کرتا تو ایک فرضی ساتھی سے باتیں کرنے لگتا۔ میں اپنے فرضی ساتھی سے کوئی سوال کرتا اور خود ہی اس کی طرف سے جواب دیتا۔ اس طرح میں جزیرہ خیالی بحر مردہ خیال پہنچ گیا جہاں میری ملاقات ایک نوجوان خاتون سے ہوئی۔ وہ قلیل معاوضے پر کھانا وغیرہ پکانے اور میرا ہاتھ بٹانے کے لئے میرے ساتھ سفر کرنا چاہتی تھی مگر میں نے انکار کر دیا کیونکہ اس طرح میں اپنے فرضی ساتھی سے باتیں نہ کر پاتا۔

جب میں جبرالٹر کی طرف روانہ ہونے لگا تو اسی خاتون نے مجھے کچھ پھل اور بہت سا سفید پنیر تحفے میں دے دیا۔ وہ پنیر اتنا مزے دار تھا کہ میں نے خوب کھایا مگر اسے ہضم نہ کر سکا اور مجھے پیچش شروع ہو گئی۔ میری حالت اتنی خراب ہوئی کہ میں کشتی میں لیٹا تو بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو کشتی طوفانی لہروں میں یوں ڈول رہی تھی جیسے الٹنے والی ہو۔ اسے سنبھالنا بہت ضروری تھا ورنہ وہ غرق ہو جاتی اور لہریں مجھے نگل جاتیں۔ میں بہ مشکل تمام اوپر آیا تاکہ بادبانوں کا رخ درست کروں اور پتوار سنبھالوں لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک

آدمی نے پتوار سنبھال لیا تھااور کشتی کو طوفانی لہروں سے بچانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایااور بولا۔ "فکر نہ کرو دوست۔ میں کشتی کو سنبھال لوں گا۔ آخر پرانااور تجربہ کار جہاز راں ہوں۔ میں اس بیڑے میں شامل تھاجو کولمبس کی سربراہی میں ۱۴۹۲ میں اسپین سے نئی دنیا کی طرف روانہ ہوا تھا"۔

میں یہ سن کر ہکابکا سارہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چار سو برس پہلے کا جہاز راں میری کشتی پر کہاں سے کیسے آگیا اتنے میں وہ بولا "تم اپنے کیبن میں جاکر آرام کرو۔ جب تک تم خود کشتی سنبھالنے کی قابل نہیں ہو جاتے، اسے میں سنبھالتا رہوں گا اور ہاں، آئندہ پنیر اور پھل بہ یک وقت مت کھانا"۔

میں کچھ متعجب اور کچھ پریشان سا اپنے کیبن میں چلا گیا۔ دوسرے دن جب میں اوپر آیا تو چار سو برس پہلے کا وہ جہاز راں غائب تھا۔ میں نے ڈوب جانے والے جہازوں اور ملاحوں کے بارے میں بہت سی کہانیاں سنی تھیں مگر ان پر یقین نہیں آیا تھا لیکن اس نیک دل بھوت کو بہ چشم خود دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کے بعد میں ان کہانیوں کو سچ سمجھنے پر مجبور ہوں۔

بھوت نے تباہی سے بچالیا

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں تو اس سے زیادہ عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک بار ایک برطانوی آب دوز معمول کے پٹرول پر گئی تو واپس نہ آئی۔ اس آبدوز کا کپتان ریان بڑا ہر دلعزیز افسر تھا۔ جب آبدوز تین ہفتوں تک واپس نہ آئی تو ایک اور آب دوز اس کی تلاش میں بھیجی گئی۔ آب دوز رات بھر زیر آب چلتی رہی صبح اس کے کپتان نے پیری اسکوپ بلند کرنے کا حکم دیا۔ سیکنڈ آفیسر نے پیری اسکوپ سے سطح سمندر کا جائزہ لیا تو بے اختیار چلا اٹھا۔ "ارے! وہ ریان ہے۔ وہ ہاتھ ہلا رہا ہے۔ شاید ہماری مدد کا طالب ہے" آب دوز کو فوراً سطح آب پر لایا گیا تاکہ ریان کو ڈوبنے سے بچایا جاسکے۔ آب دوز نے اسے بہت تلاش کیا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیا پھر بھی آب دوز کافی دیر تک اس حصے میں گھومتی رہی اور اسے تلاش کرتی رہی۔ کپتان کو خدشہ تھا کہ کہیں دشمن کے طیارے آبدوز کو نہ دیکھ لیں لہٰذا اس نے آبدوز کو دوبارہ زیر آب لے جانے کی تیاریاں کرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں انھیں کچھ فاصلے پر کوئی سیاہ چیز سطح آب پر دکھائی دی۔ انھوں نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ وہ ایک نہیں،

دوبارودی سرنگیں تھیں جو آبدوز سے ٹکراتیں تو وہ تباہ ہو جاتی۔ کیونکہ آب دوز سیدھے اسی راستے پر جارہی تھی۔ اگر آبدوز ریان کو تلاش کرنے کے لئے چکر نہ کاٹتی تو اس کا سرنگوں سے ٹکرا جانا یقینی تھا۔ گویا ریان کے بھوت نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر کے آبدوز کو تباہ ہونے سے بچالیا تھا۔

بھوت بن کر آنے کا وعدہ

پہلی عالمی جنگ کے دوران میں امریکی بحریہ کے ایک افسر مرتون گھیلا نے بستر مرگ پر اپنے ساتھیوں سے کہا تھا "میرے ساتھیو! تم ہمیشہ میرے ساتھ احترام و محبت سے پیش آئے ہو۔ میں تم سے جدا نہیں ہونا چاہتا مگر موت اٹل ہے۔ پھر بھی بعد از مرگ میری کوشش ہوگی کہ میری روح تمہارے پاس آتی رہے اس لئے میرا کیبن خالی رکھنا"۔

وہ یک چشم اور سرخ داڑھی والا افسر جہاز کے کیبن نمبر ۲ میں رہتا تھا چنانچہ اس کی موت کے بعد کچھ عرصے تک کیبن خالی رکھا گیا مگر پھر اسے جہاز کے نوجوان بے ماسٹر کو الاٹ کر دیا گیا۔ اس وقت جہاز جنوبی امریکہ جارہا تھا۔ یہ سفر بہ خیر و خوبی ختم ہو گیا۔

واپسی کے سفر میں ایک رات کیبن نمبر ۲ سے بے ماسٹر کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ عملے کے کچھ لوگ کیبن کی طرف دوڑے تو انھوں نے بے ماسٹر کو کیبن کے دروازے پر بے ہوش پڑا ہوا پایا۔ جب اسے ہوش میں لایا گیا تو اس نے بتایا۔ "میرے کیبن کی برتھ پر سرخ داڑھی والے کسی یک چشم آدمی کی لاش پڑی ہے"۔

عملے کے لوگوں کو مرتون گھیلا کی بات یاد آ گئی جو اس نے مرتے وقت کہی تھی۔ بے ماسٹر نے انھیں تفصیل بتاتے ہوئے کہا "میں گہری نیند سو رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے برابر کوئی لیٹا ہوا ہے جس کا پورا وجود برف کی طرح یخ ہے۔ میں نے اس کے منہ سے چادر ہٹائی تو مجھے سرخ داڑھی اور ایک آنکھ والے آدمی کی لاش دکھائی دی۔ اس کی داڑھی میں سمندری گھاس بھی الجھی ہوئی تھی"۔

عملے کے لوگ کیبن میں گئے تو برتھ خالی تھی مگر بستر گیلا تھا اور کچھ سمندری گھاس بھی برتھ کے نیچے پڑی تھی.....

اِک نیا کمال
اِک نیا معیار

نئے دَور کی نئی پینسل

Goldfish
DELUXE PENCIL

شاہ سنز لمیٹڈ
ڈی ۸۸ - ایس - آئی - ٹی - ای - کراچی
فون: ۲۹۳۴۵۱، ۲۹۳۴۵۲

Midas Khi

ADARTS

Scanner AFI·2/86

موت کی وادی

سیّد خورشید عالم

آپ میں سے اکثر ساتھیوں نے چترال، سوات اور کاغان کی سرسبز و شاداب وادیاں یقیناً دیکھی ہوں گی۔ ان وادیوں میں زندگی اپنے بھرپور رنگ اور تاثر کے ساتھ نظر آتی ہے۔

مگر ایک وادی ایسی بھی ہے جہاں زندگی کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ جہاں ہر طرف موت کا بسیرا ہے۔ ہولناک سناٹا ہے۔ ریت کے اُڑتے ہوئے بگولے جب گزرتے ہیں تو محسوس یہ ہوتا ہے جیسے کوئی بدروح چیختی چلاتی گزر رہی ہو۔ یہاں دُور دُور تک سبزے کا وجود نہیں ہے۔ یہاں آسمان اور زمین دونوں سے آگ برستی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پھر ہر پتھر پر موت کا پیغام لکھا ہے۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ ایسی وادی کون سی ہے جہاں موت اپنی تمام تر ہیبتناکیوں سمیت موجود ہے۔ یہ وادی تین ہزار مربع میل کے رقبے پر مشتمل ہے اور یہ جنوب مشرقی کیلی فورنیا میں واقع ہے

کہا جاتا ہے کہ ۱۸۴۹ء میں ایک شخص نے اس وادی کو عبور کر لیا۔ جب وہ اپنے سفر کے اختتام پر پہنچا تو اُس نے پلٹ کر وادی کو غور سے دیکھا اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُس نے موت کا نہ صرف سامنا کیا ہے بلکہ اس سے دو بدو جنگ بھی کی ہے۔ زندہ بچ جانے کے باوجود اس وادی میں گزارے ہوئے شب و روز اس کی آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ کافی دیر وادی کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک بہت ہلکی مگر تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی، پھر وہ بول اُٹھا۔

یہ وادی شمالی امریکہ کی خشک ترین اور گرم ترین وادیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ عام طور پر یہاں کا درجۂ حرارت ایک سو بیس درجے فارن ہائیٹ یعنی انچاس (۴۹) درجے سینٹی گریڈ ہو جاتا ہے۔ اس وقت آسمان سے آگ برسنے والا محاورہ اپنی عملی تعبیر بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اس وادی کی لمبائی ایک سو چالیس میل ہے۔ جب کہ اس کی چوڑائی پانچ سے لے کر پندرہ میل تک ہے۔ یہ چاروں طرف اونچے اونچے سنگلاخ پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔

۱۸۶۸ء میں پہلی بار اس علاقے کے بارے میں ایک چھوٹا سا مضمون شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں یہاں باقاعدہ کان کنی کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں کان کن یہاں آکر آباد ہوتے گئے۔ انہوں نے یہاں سخت ترین حالات کا سامنا کیا۔ سخت گرمی اور پانی کی شدید قلت ان کا سب سے بڑا مسئلہ تھی۔ سخت گرمی کی ایک سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ علاقہ سطح سمندر سے دو سو بیاسی فٹ نیچا ہے۔

بڑی تصویر میں آپ کو وادی میں پتھر کی ایک قبر نظر آرہی ہوگی۔ یہ ویل نولن نامی ایک شخص کی قبر ہے جو ۱۹۳۱ء میں فوت ہوا تھا۔ جب کان کن یہاں آنے لگے تو آہستہ آہستہ ان کا چھوٹا سا شہر بن گیا۔ جس کی آبادی دس ہزار تھی۔ اس جگہ دس ہوٹل، ایک تھیٹر اور ایک سوئمنگ پول بھی بن گیا تھا۔ اس تصویر میں جن عمارتوں کے کھنڈرات نظر آرہے ہیں ان میں سے اونچی سی عمارت بینک کی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں سونے کی دریافت کے بعد اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ایک اور تصویر میں نظر آنے والا سیف بھی اسی دور کی یادگار ہے۔

آج کے جدید دور میں موت کی اس وادی میں رینجرز کا ایک دستہ ہر وقت گشت پر رہتا ہے تاکہ بھولے بھٹکے مسافروں کو موت کے بھیانک پنجے میں جانے سے بچا سکے۔ اصل بات کی حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے مگر کہا جاتا ہے کہ آج بھی ان کھنڈرات سے چیخنے اور چلانے کی آوازیں آتی ہیں۔ جیسے یہ آوازیں اپنی بستی کے برباد ہو جانے پر نوحہ کناں ہوں۔

ہمارے ایک دوست کے امتحانات شروع ہوئے۔ جب وہ پہلا پیپر دے کر گھر آئے تو ان کے ابو نے پوچھا بیٹا کتنے سوال کر کے آئے ہو، کہنے لگے "ابو پہلے دو سوالات اور آخری تین اور درمیان کے دو سوالات کو چھوڑ کر سارا پیپر کیا ہے" "لیکن بیٹے اس میں تو کل سات سوال ہیں" اباجان نے پوچھا "ابو کچھ سوال چھوڑنے بھی تو ہوتے ہیں" انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔

(مرسلہ۔ منیر منصوری۔ کراچی)

علم وادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:۔ ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:۔ ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:۔ ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:۔ ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:۔ ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:۔ ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون:۔ ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار وہاڑی
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد فون:۔ ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بک اسٹال۔ گجرات فون:۔ ۰۴۳۳۱	مسلم بک ڈپو۔ سرائے عالمگیر
سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:۔ ۲۴۱۴	

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینیجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲، نورس روڈ، سائٹ، کراچی ۱۶

آدھی رات کا سفر

نیّر ندیم

وہ دونوں ہر لمحہ کسی خوفناک حادثے کے منتظر تھے

"کیا یہاں سے سچ مچ تیس چالیس میل کا فاصلہ ہے؟" مرناف نے پریشانی اور حیرت کے عالم میں اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا۔ وہ ابھی ابھی ریل گاڑی سے اترا تھا اور اس اسٹیشن پر اترنے والا واحد مسافر تھا۔

"جی جناب تقریباً اسی قدر فاصلہ ہے۔ آپ بیٹھ تو جایئے"۔ اسٹیشن ماسٹر نے اپنی میز پر کھلے ہوئے رجسٹر کو بند کر دیا جس میں اس نے ریل کے آنے اور جانے کے اوقات تحریر کیئے تھے۔

"غالباً اس مضافاتی علاقے میں آپ پہلی دفعہ آئے ہیں؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے بعض تجارتی معاملات ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہاں سے کوئی نہ کوئی سواری ضرور مل جائے گی، ورنہ میں کوئی انتظام کر کے آتا یا بالکل نہ آتا"۔ مرناف پر عجیب سی جھنجلاہٹ طاری ہوگئی، عجیب و غریب علاقہ تھا۔ سنسان اسٹیشن، چند مکانات جو ریلوے کے ملازمین کے تھے اور آس پاس پچاس ساٹھ گھر جو مقامی کسانوں کے تھے۔

"بات یہ ہے"۔ اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ "جس گاؤں میں آپ کو جانا ہے وہاں جانے کے لئے یہ لائن آپ نے غلط منتخب کی۔ اگر آپ مغربی لائن کی ٹرین پکڑتے تو وہ چند میل کے فاصلے پر آپ کو چھوڑتی"۔

"مگر اب تو میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ کیا کوئی ایسا شخص نہیں مل جائے گا جو ذرا زیادہ معاوضہ لے کر مجھے کسی طور وہاں پہنچا دے؟"

"اس کا امکان کم ہے"۔ اسٹیشن ماسٹر نے قلم سے اپنا کان کریدا، اور پھر باہر نگاہ ڈالی جہاں دن ڈھلنے کے آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا اور ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ "بات یہ ہے جناب کہ راستہ سنسان ہے۔ دونوں طرف گھنے جنگل ہیں۔ لوگ توہم پرست تو نہیں ہیں البتہ راستے میں لوٹ مار کا خوف رہتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے، شاید دن میں کوئی آپ کو لے جانے کے لئے تیار ہو جائے"۔

مرناف نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے بہر صورت رات ہی میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اگر فاصلہ کم ہوتا تو وہ پیدل ہی چل پڑتا۔ اس کے پاس تھا ہی کیا! بس ایک چھوٹا سا بریف کیس جس میں ادائیگی کے لئے نوٹوں کی شکل میں رقم تھی۔ ادائیگی اسے اسی دن کرنی تھی ورنہ دوسری صورت میں اسے بہت زیادہ مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا اور ساکھ الگ جاتی۔ "یہ جو آس پاس کسان رہتے ہیں کیا ان میں سے کوئی تیار نہیں ہو سکتا؟" مرناف نے پوچھا۔

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ آپ وہ مکان دیکھ رہے ہیں نا؟" اسٹیشن ماسٹر نے کھڑکی سے ایک لال کھپریل والی چھت کے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ہاں"۔ مرناف کو قدرے امید افزا صورت نظر آئی۔ "وہ مکان نا جس کی کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی جھلک رہی ہے"۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔

"وہاں چلے جایئے۔ وہاں ایک کسان ہے۔ بھلا سا نام ہے اس کا" ۔ اسٹیشن ماسٹر نے اس کا نام یاد کرنے کی کوشش میں دو مکے اپنے ماتھے پر مارے ۔"ہاں یاد آگیا، اس کا نام ہے کم، وہ شاید آپ کی مدد کر دے۔ میرا نام لے دیجئے گا" ۔

مرناف بجلی کی طرح اٹھا۔ وہ اس موقع سے جلد از جلد فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اسے اپنی بداخلاقی پر افسوس ہوا کہ وہ اسٹیشن ماسٹر کا شکریہ ادا کئے بغیر ہی اٹھ گیا تھا۔ وہ رکا اور اس نے پلٹ کر اسٹیشن ماسٹر کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن عین اسی وقت اس کی چھٹی حس نے اسے شک میں ڈال دیا۔ اسٹیشن ماسٹر کی نگاہ اس کے بریف کیس پر جمی ہوئی تھی۔ اس نے بریف کیس کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ نے مجھے بڑی مشکل سے بچالیا" ۔

"کوئی بات نہیں۔ ذرا راستہ سنسان اور ویران ہے" ۔

"آپ اس کی پروانہ کریں" ۔ مرناف نے کہا۔ "میرے اس بریف کیس میں بھرے ہوئے پستول موجود ہیں، اور میرا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا" ۔ مرناف نے دیکھا کہ یہ سن کر اسٹیشن ماسٹر کے چہرے کا رنگ ذرا بدل گیا۔ مرناف دل ہی دل میں اپنی بروقت چالاکی پر محفوظ ہوا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ایسے سنسان مقامات پر لوٹ مار کے واقعات ملی بھگت سے ہوتے ہیں، اس نے اپنی ذہانت سے اسٹیشن ماسٹر کو تو خوف زدہ کر ہی دیا تھا۔

مرناف اسٹیشن سے نکل کر پختہ سڑک سے ہو کر اسٹیشن ماسٹر کے بتائے ہوئے مکان کی طرف چل پڑا۔ وہ وہاں اجنبی تھا اس لئے چکراتا اور بھٹکتا ہوا وہاں پہنچا۔ جب وہ مکان کے قریب پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اسی مکان سے باہر نکل رہا ہے جس کا راستہ وہ اتنی دیر سے ڈھونڈ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد جب وہ دونوں آمنے سامنے ہوئے تو اسٹیشن ماسٹر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ "ارے آپ ادھر سے گھوم کر آئے" ۔ اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ "معاف کیجئے گا مجھے کچھ خیال نہیں رہا تھا۔ ورنہ قریب کا راستہ وہ ہے جدھر سے میں آیا ہوں" ۔

"ہاں میرے لئے تو اجنبی راستہ تھا" ۔ مرناف نے غور سے اسٹیشن ماسٹر کو دیکھا اور اس کے دل میں شک کا معمولی سا پودا مزید بڑا ہو گیا۔

"نہیں، آپ کا شکریہ" ۔ مرناف نے کہا اور اسٹیشن ماسٹر خدا حافظ کہہ کر اگلے موڑ پر غائب ہو گیا۔ مگر مرناف کے ذہن نے پوری کہانی بن لی تھی۔ ایک خیال اسے آیا کہ جان بوجھ کر خطرے

میں پڑنا غیر مناسب ہے۔ مگر دوسرے لمحے اس نے خود کو ہمت اور شرم دلائی۔ "اگر شہر والے ان دیہاتیوں کو بیوقوف نہ بنا سکے تو بات ہی کیا ہوئی۔ دیکھوں گا کہ اس چالاک اسٹیشن ماسٹر اور گنوار کسان نے کونسی سازش کی ہے"۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کی گرفت اپنے بریف کیس پر اور مضبوط ہو گئی۔ اس نے بڑھ کر مکان کے دروازے پر دستک دی۔

کسان کم دوسری دستک پر باہر نکل آیا۔ وہ موٹا تازہ مضبوط اور ہٹا کٹا تھا۔ قد میں مرناف سے دو انچ نکلتا ہوا اور جسامت میں دگنا تھا۔ اس کے جوتے پھٹے ہوئے تھے اور وہ ایک خاکی رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ معمولی سے معاوضے پر راضی ہو گیا اور چند منٹ کے بعد گاڑی تیار کر کے لے آیا۔

"یہ کیسی گاڑی تم نے رکھ چھوڑی ہے جس کے بارے میں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کا اگلا حصہ کونسا ہے اور پچھلا حصہ کونسا!" مرناف نے قدرے جھنجلا کر کہا۔

"اندازہ نہیں ہوتا؟" کم نے حیرت سے دہرایا۔ "جدھر گھوڑا بندھا ہوا ہے وہ اگلا حصہ ہے اور جہاں آپ بیٹھے ہیں وہ پچھلا حصہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مگر اس نے اپنی نشست اتنی ترچھی ضرور رکھی کہ اس کی نگاہ بیک وقت مرناف اور سڑک دونوں پر رہ سکے۔

گھوڑا کمزور اور لاغر تھا۔ جب کوچوان نے اس کو ہلکی سی چابک لگائی تو گھوڑے نے آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کی بجائے ایک جھرجھری لی اور خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ دوسری چابک پر گھوڑا کسمسایا اور گاڑی کے ہلنے سے مختلف قسم کی چوں چوں اور کھڑکھڑاہٹ کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ جیسے گاڑی کے کل پرزے اس بے وقت سفر پر بڑبڑا رہے ہوں۔ تیسرے چابک پر گاڑی ذرا آگے بڑھی اور چوتھے چابک پر آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

"اگر یہی رفتار رہی تو وہاں پہنچتے پہنچتے ہمیں صبح ہو جائے گی۔ مجھے تو جلد از جلد وہاں پہنچنا ہے"۔ مرناف بے حد کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"نہیں جناب"۔ کوچوان نے ایک چابک سڑاک سے گھوڑے کی پشت پر لگایا۔ "گھوڑا ذرا کمزور ہے اور سفر بے وقت ہے۔ ایک ذرا رفتار پکڑنے دیجئے پھر ہوا ہو جائے گا۔ اور آپ یوں اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے"۔ لفظ یوں، پر کوچوان نے چٹکی بجائی۔ اس کا انداز تضحیک آمیز قسم کا تھا اور منزل، پر اس نے عجیب طرح ہونٹ دبائے تھے۔ مرناف نے کوچوان کی طرز نشست اور طرز

گفتگو دونوں کا نوٹس لیا اور ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کوچوان اگلی سیٹ پر ذرا ترچھا بیٹھا ہوا تھا اور کن انکھیوں سے کبھی کبھی مرناف کو دیکھ لیتا تھا۔

انہوں نے اندھیرے میں سفر کا آغاز کیا تھا۔ آسمان پر تاروں کی دھندلی روشنی میں سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے ٹیلے اور گھنا جنگل دیوار کی طرح نظر آرہا تھا۔ سامنے بھی دور تک کوئی چیز نظر آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اندھیرے میں مرناف کی نگاہیں چند گز تک ہی دیکھ سکتی تھیں، البتہ گھوڑا اپنے جانے پہچانے راستے پر جارہا تھا۔

"بہت ویران علاقہ ہے"۔ مرناف نے اپنے کوٹ کے کالروں سے اپنے کان چھپالئے۔

"دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے کیا؟"

"جناب یہ سارا علاقہ بالکل ویران ہے۔ اس سڑک پر بھی کبھی بھی کوئی سرکاری اہلکار یا ہم لوگ سفر کرتے ہیں۔ سڑک بھی سنسان ہی رہتی ہے۔ اب تو رات کا وقت ہے۔ دن میں بھی یہی عالم رہتا ہے۔"

"واقعی بے حد ہولناک ویرانی ہے"۔ مرناف نے دل ہی دل میں سوچا۔ "دور دور تک آدم نہ آدم زاد، ایسے میں اگر کوئی ڈاکو، رہزن یا چور لوٹنا چاہے تو بیچارہ شکار لٹ جانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے"۔ یہ سوچ کر اس نے کوچوان پر نگاہ ڈالی جو چہرے مہرے کی درشتی اور بدن کی بناوٹ سے کسان سے زیادہ رہزن معلوم ہورہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اسٹیشن ماسٹر کا چہرہ بھی یاد آگیا۔ عجیب سا چہرہ تھا، ریلوے کے ملازمین سے زیادہ کسی جرائم پیشہ گروہ کے رکن جیسی مونچھیں اور چوڑی سی ٹھوری۔

"دوست تم کیا سوچ رہ ہو"۔ مرناف نے کوچوان کو مخاطب کیا"۔ ذرا یہ تو بتاؤ، یہ علاقہ خطرناک تو نہیں ہے۔ کبھی کوئی لوٹ مار ڈاکا وغیرہ تو ادھر نہیں پڑا؟"

"نہیں جناب! بھلا اس علاقے میں رہزنی کیا ہوگی مسافر ہی نہیں، کوئی لوٹے گا کسے؟" کوچوان کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"ٹھیک ہے، میں نے یونہی پوچھ لیا۔ ویسے میرے پاس تین بھرے ہوئے پستول موجود ہیں، بالکل تیار"۔ مرناف نے رک کر اپنی غلط بیانی اور جھوٹ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مزید کہا۔ "ایک پستول دس ڈاکوؤں پر بھاری ہوتا ہے اور میرا نشانہ اتنا اچھا ہے کہ آواز پر نشانہ لگا سکتا ہوں۔"

یکایک گاڑیوں کے پہیوں میں کڑکڑاہٹ پیدا ہوئی اور وہ ایک طرف کو مڑ گئی۔ سڑک سیدھی بھی جا رہی تھی مگر گاڑی جس طرف مڑی وہ بھی سڑک ہی تھی۔ "آخر یہ بدمعاش مجھے ادھر کہاں لے جا رہا ہے"۔ مرناف نے دل میں سوچا۔ "یکایک گاڑی کو بائیں جانب موڑنے سے اس کا کیا مقصد ہے! کسی جھاڑی واڑی میں لے جا رہا ہے کیا!"

پھر مرناف نے ذرا خود پر قابو پا کر کہا۔ "تم تو کہتے ہو کہ اس علاقے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مجھے تو ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ اگرچہ میں دبلا پتلا ہوں مگر طاقت میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ ایک بار میں نے تین ڈاکوؤں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔"

کوچوان نے گھوم کر مرناف کو غور سے دیکھا، مرناف اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔ "مجھے خود نہیں معلوم کہ مجھ میں مقابلے کے وقت طاقت کہاں سے آجاتی ہے۔ تمہارے جیسے ہاتھ پاؤں والے کو تو میں ایک ہی ٹکر میں گرا دیتا ہوں"۔

کوچوان نے ایک بار پھر مڑ کر مرناف کا جائزہ لیا اور زور سے ایک چابک گھوڑے کو لگائی جیسے اس نے مرناف کی تمام لاف زنی کو جھٹک دیا ہو۔

"ہاں میرے دوست تو میں کہہ رہا تھا"۔ مرناف نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کہ آج تک کوئی بھی رہزن جو میرے مقابلے پر آیا ہے، ہڈی پسلی تڑوائے بغیر نہیں گیا۔ پھر عدالت میں بھی میرے وکیل ایسا مضبوط مقدمہ بناتے ہیں کہ رہزن کو موت کی سزا ہی ملتی ہے۔ خود میں سرکاری افسر ہوں، اس لئے حکومت میری حفاظت کے خصوصی انتظامات رکھتی ہے اور دوران سفر خاص طور سے میری حفاظت کا اہتمام ہوتا ہے تاکہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے"۔ اس کے بعد مرناف نے دور ویہ جھاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کیا خبر کہ محکمہ پولیس کے کتنے افسران جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہیں جو میری حفاظت پر مامور ہیں۔ ارے..... ٹھہرو!" مرناف یکایک چلایا۔ "یہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ یہ تو گھنی جھاڑیاں ہیں۔"

"آپ دیکھ نہیں رہے۔ راستہ ہی یہ ہے"۔ کوچوان نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے"۔ پھر مرناف نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ ناحق ہی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ "میرے اس طرح چلانے سے اس پر یہ بات ظاہر ہو گئی ہوگی کہ میں خوف زدہ ہوں۔ جب ہی

تو یہ مجھے سارے راستے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا ہے تاکہ میرے دل کے خوف کو میرے چہرے سے پڑھ سکے اور کسی خاص موقع پر کام دکھائے۔ اس کا گھوڑا جو پہلے دو قدم نہیں چل رہا تھا، اب کیسے دوڑ رہا ہے"۔

"ارے بھائی تم اپنے گھوڑے کی رفتار تو کم کرو اسے اتنا تیز کیوں دوڑا رہے ہو"۔ اس نے بہ آواز بلند کوچوان سے کہا۔

"جناب میں نہیں دوڑا رہا۔ یہ خود دوڑ رہا ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ جب یہ چل پڑے گا تو ہوا سے باتیں کرنے لگے گا"۔

"میں کچھ نہیں جانتا"۔ مرناف زور سے بولا"۔ اس کی لگام کھینچو اور رفتار کم کر دو"۔

"کیوں جناب آپ کو تو جلدی پہنچنا تھا اور اب آپ....." کوچوان کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر مرناف نے اس کی بات کاٹ دی"۔ میرے چار دوست اسٹیشن سے میرے پیچھے پیچھے اپنی سواری میں آرہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اس طرح سفر آسانی سے کٹے گا۔ وہ چاروں بہت مضبوط ڈیل ڈول کے ہیں اور ان کے پاس بھی ایک ایک پستول ہے..... اور ہاں یہ تم بار بار مڑ مڑ کر مجھے کیوں دیکھتے ہو۔ اس بریف کیس میں پستول ہیں اور ایک پستول میری جیب میں بھی ہے۔ دکھاؤں؟" یہ کہہ کر مرناف نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی جیب میں چابیوں کے ایک گچھے کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا وہ تو محض کوچوان کو مزید رعب میں لانا چاہتا تھا۔

مگر عین اسی لمحے ایک عجیب و غریب واقعہ ظہور پذیر ہوا جس کی توقع مرناف کو ذرا بھی نہ تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ کوچوان اچانک چلتی گاڑی سے کود گیا۔ اس کے کودنے سے گاڑی کا توازن بگڑا مگر گھوڑے نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ مرناف حیرت زدہ رہ گیا۔ کوچوان "مدد۔ مدد" چیختا ہوا قریبی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ مرناف کی سمجھ میں صورت حال نہیں آئی۔ تھوڑی دیر تک تو کوچوان کے قدموں کی آواز آئی، پھر سناٹا چھا گیا۔ مرناف نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ کر گاڑی روک لی۔

"تو وہ مجھ سے خوف زدہ ہو گیا۔ بیوقوف کہیں کا"۔ مرناف نے دل میں سوچا۔ "مجھے تو راستہ بھی نہیں معلوم اور جنگل میں تو میں رات بھر راستہ ڈھونڈتا ہی رہوں گا"۔ یہ سوچ کر اس نے آواز دی۔ "کم میرے دوست!" مگر اس کی آواز ہی پلٹ کر آگئی۔

"تو کیا میں اس اندھیرے جنگل میں جنگلی جانوروں کے درمیان جاگ کر رات گزاروں گا"۔
یہ سوچ کر اس کا دل لرز گیا اور پھر اس نے آواز دی۔ "کم! تم کہاں ہو؟ واپس آجاؤ یار!"
اس بار بھی اس کی آوازیں لوٹ آئیں۔ کم کا کہیں اتا پتا نہیں تھا البتہ اس کے آواز دینے پر جنگل کا شور چند لمحے کے لئے رکا اور اس کے بعد جنگل ایک بار پھر مخصوص آوازوں سے آباد ہو گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد جھاڑیوں میں آہٹ ہوئی۔ "کم کیا یہ تم ہو؟" مرناف نے ڈرتے ڈرتے زور سے کہا حالانکہ اس کا خیال تھا کہ کوئی جنگلی جانور ہے جو اس پر حملہ کرنے کی تاک میں ہے۔
"تم میری گاڑی لے جاؤ مگر مجھے مت مارو، مجھے پستول سے مت مارو"۔ جھاڑیوں سے کم کی لرزتی ہوئی آواز آئی۔
"نہیں کم!" کم کی آواز سن کر مرناف کی جان میں جان آئی۔ "میں تو صرف مذاق کر رہا تھا۔ میری بات پر یقین کرو میں ایک شریف آدمی ہوں، کوئی ڈاکو یا رہزن نہیں ہوں۔ میرے پاس پستول کہاں ہیں۔ میں تو تم سے خوفزدہ تھا اس لئے خواہ مخواہ تم پر رعب ڈال رہا تھا۔"
"مجھے یقین نہیں آتا۔ تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو"۔ کم کی آواز کسی جھاڑی کے پیچھے سے آئی۔ وہ خوف کی وجہ سے سامنے نہیں آرہا تھا۔
"بالکل یقین کرو۔ میرے پاس پستول نام کی کوئی چیز نہیں، مجھے تو پستول چلانا بھی نہیں آتا۔ آجاؤ ہم چلیں۔ میں تو سردی سے ٹھٹھرا جارہا ہوں۔" مرناف کے لہجے میں اس قدر نرمی اور خلوص تھا کہ کوچوان کے دل سے خوف کم ہوا اور وہ نکل کر گاڑی کے قریب آگیا۔
"احمق کہیں کے۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم سچ مچ ڈر گئے"۔ مرناف نے کہا۔
"جناب مجھے تو آپ نے سارے راستے خوف زدہ کیئے رکھا۔ میں تو اسی ڈر میں رہا کہ بھرا ہوا پستول معلوم نہیں کب چل جائے"۔
مرناف ہنسا۔ کوچوان نے گھوڑے کو ایک چابک لگائی۔ حسب سابق تین چابکوں کے بعد چوتھی چابک پر گھوڑا چلا اور آہستہ آہستہ اس نے دوبارہ رفتار پکڑ لی۔
اب گاڑی کے دونوں مسافر ایک دوسرے سے خوفزدہ نہیں تھے اور سنسان سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز مسلسل آرہی تھی۔

خوفناک نمبر پڑھنے کے بعد

محمد نوید مرزا

طے کیا جب خوف کا پہلا سفر
کانپ اٹھے قصر دل کے بام و در

سامنے آئے ہیں رستے خوفناک
چھا گیا ہے مجھ پہ ان دیکھا خطر

خوف کی بھٹی میں دل جلنے لگا
خوف کے انگارے برسے سوچ پر

خواب میں آنے لگے چہرے مہیب
جاگتے میں لگ رہا ہے خود سے ڈر

جنگلوں میں اس قدر ڈوبا شعور
شہر کے منظر سے گھبرائی نظر

جسم کیا آیا پسینہ روح کو
سر سے ایڑی تک ہوا میں تر بہ تر

میں یہ سمجھا آگیا ہے کوئی بھوت
آہٹیں آئیں ہواؤں کی اگر

گھورتے سائے نظر آنے لگے
گر گیا ہوں فرش پر میں گھوم کر

گھر گیا ہے مردہ ڈھانچوں میں خیال
بھول بیٹھا زندگی کا کر و فر

حال کیا بچوں کا ہو گا اے نوید
اس کو پڑھ کر خوف ہوں میں سر بسر

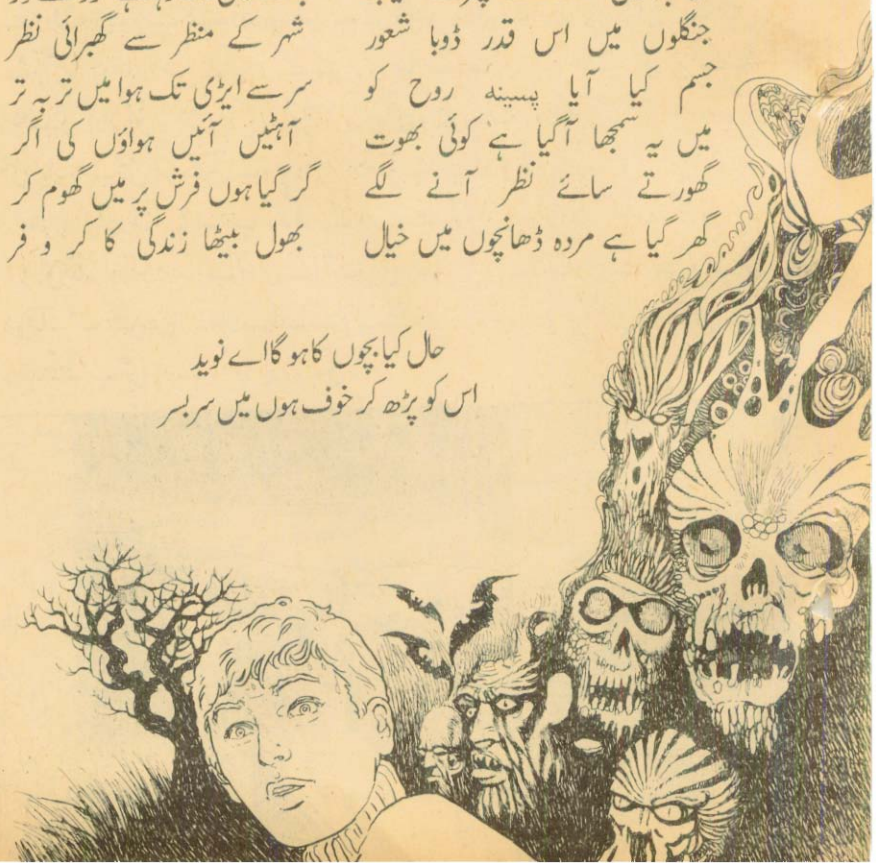

یادگار رات

وہ رات جسے خوفناک پھڑ پھڑاہٹ نے یادگار بنا دیا

خیر محمد خان کوہاٹی

بارہ اگست ۱۹۸۷ء بدھ کی رات تھی۔ میں دودھ لینے باڑے کی طرف جا رہا تھا۔ باڑا ہماری گلی کے آخر میں تھا۔ میں نے تقریباً آدھا راستہ طے کیا ہو گا کہ مجھے کریم صاحب کے گھر کے ساتھ زمین پر ایک سایہ دکھائی دیا اور کسی چیز کے پھڑپھڑانے کی آواز آئی۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ مجھے نظریں اوپر اٹھانے کی جرات نہیں ہوئی۔ میں نے وہیں سے دوڑ لگا دی۔ ہانپتے کانپتے دودھ کے باڑے میں پہنچا۔ جلدی سے دودھ لیا اور واپس آنے لگا میں نے تقریباً آدھا راستہ طے کیا تو مجھے پھر کریم صاحب کے گھر کے سامنے کسی چیز کے پھڑ پھڑانے کی آواز آئی۔ زمین پر بھی کوئی چیز ہل رہی تھی۔ میں نے پھر دوڑ لگا دی۔ تھوڑا سا دودھ گر بھی گیا۔ جب میں گھر کے قریب پہنچا تو مڑ کر دیکھا تو بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میرا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا کیونکہ کریم صاحب کے گھر کے اوپر چھت پر قومی پرچم لہرا رہا تھا۔ کیونکہ اگلے دن یوم آزادی تھا۔ اور کریم صاحب کو دن کے وقت ڈیوٹی پر جانا پڑتا اس لئے ایک دن پہلے رات کو جھنڈا لگا دیا تھا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ ہمارے ملک کے لوگ کتنے پیار اور خوشی سے یوم آزادی مناتے ہیں۔ وہ رات مجھے اب بھی یاد ہے۔ اور یاد رہے گی۔

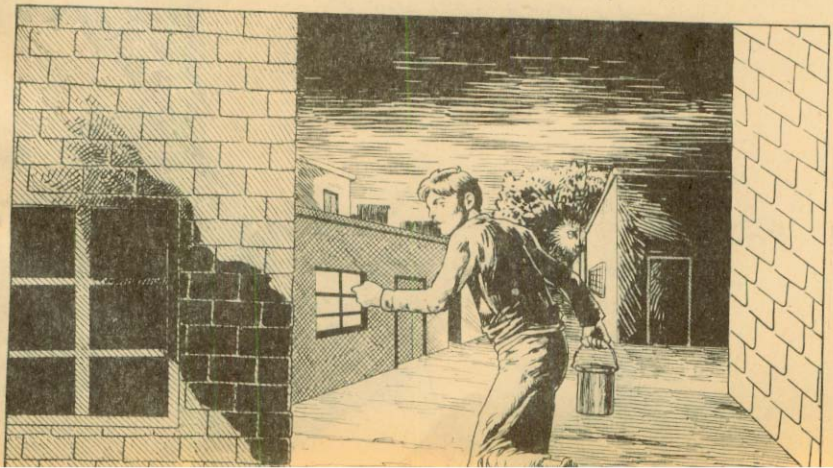

ڈ---ڈ---ڈر کک---کک کیوں لگتا ہے؟

ذیشان بن صفدر

خوف کے بارے میں ایک معلوماتی مضمون جسے آپ بے خوف ہو کر پڑھ سکتے ہیں

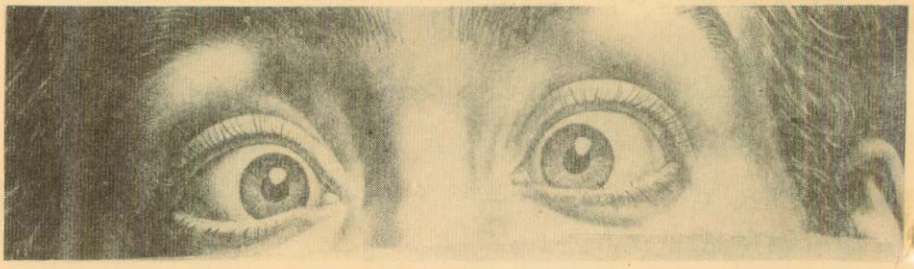

خوف کیا ہے..... ہم کیوں ڈرتے ہیں..... ڈر صرف بچوں کو لگتا ہے، یا بڑے بھی ڈر جاتے ہیں، لڑکیاں جلد خوف زدہ ہو جاتی ہیں یا لڑکے۔ یہ مختلف سوال ہیں جن پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

نیل آرمسٹرانگ چاند پر پہلا قدم رکھنے والے پہلے انسان تھے۔ چاند پر قدم رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب وہ چاند کی زمین پر اپنا پہلا قدم رکھنے والے تھے تو خوف کی ایک لہر نے ان کے سارے جسم میں سنسنی سی پیدا کر دی تھی..... نہ صرف اس وقت ایک انسان تاریخ کا ایک نیا باب رقم کرنے جا رہا تھا بلکہ تجربات اور معلومات کے نئے در بھی کھول رہا تھا۔ انہیں خوف تھا کہ نجانے چاند کی زمین پر قدم رکھتے ہی کیا ہو..... کہیں کوئی دھماکا تو نہیں ہو جائے گا۔ کہیں چاند پر تنہا رہنے کا خوف بھی تھا۔ کہیں وہ واپس زمین پر دوبارہ پہنچ ہی نہ سکیں..... اپنے عزیزوں، دوست احباب کی شکلیں، صورتیں بھی دوبارہ دیکھ سکیں گے یا نہیں.....

جہاں تک ڈر اور خوف کا تعلق ہے تو یہ ہر ایک کو ہی محسوس ہوتا ہے..... اس کی کوئی ایک صورت

مقرر نہیں۔ سب ہی اپنے اپنے طور پر اپنے، اپنے انداز میں خوف محسوس کرتے ہیں، تم کہیں جارہے ہو اور اچانک پیچھے سے کوئی بے تکلف دوست قریب آکر زور سے "ہو" کر دے تو تم ڈر جاؤ گے۔ ایک لمحے کے لئے تو تم سمجھ بھی نہ سکو گے کہ یہ ہوا کیا..... بعد میں ہوش و حواس بحال ہوتے ہی جب احساس ہوتا ہے کہ یہ کسی دوست کی شرارت تھی تو خوف زدہ چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ خوف امتحان کے بعد نتیجہ کے آنے اور خدانخواستہ فیل ہو جانے کا بھی ہوتا ہے۔ کسی نازیبا حرکت پر اساتذہ سے سزا پانے یا والدین سے پٹنے کا احساس بھی خوف کی ہی ایک شکل ہے۔ خوف کے وقت یا خوف کا احساس ہونے پر ہمارے دل و دماغ اور جسم میں کیا تبدیلی رونما ہوتی ہے کیا تمہیں معلوم ہے.....؟

ہمیں ڈران سب ہی چیزوں سے لگتا ہے جن سے ہمارا ذہن یا احساس یہ سمجھتا ہے کہ اس چیز سے، اس بات سے، اس عمل سے ہمیں جسمانی طور پر کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے..... جیسے ہی کوئی ہمیں اچانک چیخ کر ڈراتا ہے ہمارے ذہن کو نامعلوم خطرے کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی جسم کے اندر دونوں گردوں کے عین اوپر ایڈری نل غدود ایڈرینلن اور نان ایڈرینلن نامی ہارمونز کا اخراج شروع کر دیتی ہیں..... خوف کی وجہ سے پسینہ آنا اور سانس کی آمد و رفت تیز ہو جاتی ہے۔ یہ سب انہیں ہارمونز کے اخراج کی وجہ سے ہوتا ہے..... شدید خوف کے احساس سے دل کی حرکت بند ہو جانے سے موت بھی واقع ہو جاتی ہے..... جبکہ خوف کے اس سے کم احساس کی صورت میں آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتی ہیں اور چہرہ سفید ہو جاتا ہے..... اس کے ساتھ ساتھ جب کچھ دیر بعد ہم صورت حال کو سمجھ جاتے ہیں تو یہ دونوں ہارمونز ہمارے جسم میں زیادہ قوت پیدا کرنے لگتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اندرونی شریانوں، نسوں اور اعصابی نظام کو پرسکون و مطمئن کر کے انہیں پھر سے کام کرنے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں خوف زدہ شخص خطرہ کا سامنا کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے.....

خوف ہر چھوٹے، بڑے، عورت، مرد کو محسوس ہوتا ہے کچھ لوگ بہت زیادہ ڈرپوک واقع ہوتے ہیں ذرا سی آہٹ پر ڈر جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ہمت اور مضبوط اعصابی نظام کے مالک ہوتے ہیں کچھ ایڈونچر زپسند..... جنہیں خوف اور خطرے والے کاموں میں حصہ لے کر خوشی اور بہادری محسوس کرتے ہیں۔

گزشتہ سال آنکھ مچولی کے پہلے خوفناک نمبر میں جناب طاہر مسعود صاحب نے خوف کے نفسیاتی اسباب بتائے تھے، اور اس میں انہوں نے خوف کی دو بڑی قسموں کا ذکر کیا تھا۔ اول معلوم کا خوف، دوئم نامعلوم کا خوف۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ ایک خوف ماحول کا بھی ہوتا ہے۔ شعوری اور غیر شعوری خوف کے ساتھ ساتھ ماحول کا خوف بھی نفسیاتی طور پر انسان کو متاثر کرتا ہے خوف کا تعلق عام طور پر انسان کے اپنے ماحول، اس کی تربیت، اور ذاتی زندگی کے مشاہدات سے بھی ہوتا ہے..... اگر بچپن سے ہی کسی بچے کو اللہ بابا سے ڈرایا جائے تو یہ خوف اس کے ذہن میں اس طرح جم کر بیٹھتا ہے کہ سن شعور کو پہنچنے کے بعد بھی وہ اللہ بابا سے ڈرتا رہتا ہے۔ یا وہ اللہ بابا کو خوفناک چیز ہی سمجھتا ہے۔ اسی طرح جنگلوں کے ارد گرد رہنے والوں میں اکثر جنگلی جانوروں کا خوف بالکل نہیں ہوتا..... کیوں کہ حالات انہیں ڈرنے کے بجائے مقابلہ کرنا سکھا دیتے ہیں۔ سپیرے، سرکس میں کام کرنے والے رنگ ماسٹر، موت کے گولے میں موٹر سائیکل چلانے والے اور سرجنوں کے لئے اپنے اپنے پیشوں میں کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا جبکہ تماشہ دیکھنے والے اکثر خوف سے چیخ اٹھتے ہیں سرجن کو بڑے سکون کے ساتھ آپریشن کرتے یا کسی مردہ شخص کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرتے دیکھ کر لوگ خوف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور انہیں (سرجن کو) احساسات سے عاری شخص تک قرار دے ڈالتے ہیں.....

بہت زیادہ بلندی گہرا پانی، آگ اور جنگلی جانور جیسی بہت سی چیزیں ہیں جن سے ڈر جانا کوئی معمولی بات نہیں مگر بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو ان سے کمتر چیزوں سے بھی ڈر جاتے ہیں خوف کی وجہ سے کانپنے لگتے ہیں یا بیہوش ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کھیل کود کے میدان سے ڈرتے ہیں جسے ایگرو فوبیا کا نام دیا گیا ہے۔ کچھ لوگ بند کمروں کی تنہائی سے ڈرتے ہیں اسے کلاسٹرو فوبیا کہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خوف سے نجات دلانے کے لئے اعصابی علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایسے لوگ بھی ملیں گے جو اپنے جسم کے کسی حصے ہاتھ، یا پیر میں کسی بھی قسم کے درد سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ انہیں دل کی بیماری تو نہیں ہو گئی طبّی اصطلاح میں یہ احساس کارڈیو فوبیا کہلاتا ہے۔ کچھ اعصابی مریض ایسے بھی ہیں جو کسی بھی جسمانی شکایت کو کینسر سمجھ لیتے ہیں انہیں کینسر فوبیا کے مریض کا نام دیا جاتا ہے اور ان کا علاج ممکن ہے اس قسم کے خوف کا تعلق بچپن میں پیش آنے والے کسی نہ کسی حادثے سے ہوتا ہے، جیسے کسی قریبی عزیز یا دوست کو

کینسر کی شکایت ہو گئی ہو اور وہ اسی میں جاں بحق ہو گیا ہو..... یا کسی کا ہارٹ فیل ہونے سے انتقال ہو گیا ہو تو یہ خوف مشاہدہ کرنے والے کے ذہن سے چمٹ جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا کہ بہت سے لوگوں کو تنہائی سے ڈر لگتا ہے اس قسم کے خوف کا تعلق بھی ابتدائی عمر سے ہوتا ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ ابتدا ہی سے خوف زدہ بچے کو کسی قسم کی سزا نہ دی جائے۔ اور نہ اس کے خوف زدہ ہونے اور ڈرنے پر ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کی جائے۔ بلکہ اس کے خوف کو سمجھ کر اسے دل سے نکالنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔ مثلاً اگر کوئی بچہ اندھیری گلی یا سڑک پر جانے سے ڈرتا ہے تو اسے اپنے ساتھ لے جا کر بتائیں کہ دیکھو، یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا، میری ایک مرحومہ پھوپی بچپن میں بہت ڈرپوک تھیں، گرمی کے دنوں میں ہم سب چھت پر سویا کرتے تھے، اور سونے سے قبل چھت پر چھڑکاؤ کر دیا جاتا جس سے چھت ٹھنڈی ہو جاتی۔ پھوپی کی باری جب اوپر چھت پر پانی چھڑکنے کی آتی تو وہ کسی نہ کسی کو ساتھ لے کر ضرور جاتیں۔ ایک بار انہیں دیوار پر کوئی سایہ نظر آگیا وہ چیخ مار کر نیچے کی طرف بھاگیں۔ مگر ساتھ میں آئے بڑے بھائی (میرے انکل) نے انہیں پکڑ لیا۔ دلاسہ اور تسلی دی۔ پھر وہ سایہ دکھا کر (جس سے وہ ڈر گئی تھیں) انہیں حقیقت بتائی۔ وہ سایہ دیر تک وہاں موجود رہا۔ پھر وہ بہت ہنسیں۔ اور زندگی بھر پھر کبھی انہیں خوف محسوس نہیں ہوا۔

والدین، بڑے بھائی بہن اور دوسرے عزیزوں کو اپنے مشاہدات ایسے انداز میں بچوں کو سنانے چاہئیں جس سے ان کے اندر کا خوف اپنی موت آپ مر جائے۔ اور انہیں زندگی کے حقائق سے مقابلہ کرنے کی امنگ و لگن پیدا ہو۔

اب سے نصف صدی قبل تک رات کو گھر سے نکلنے والے لوگ اپنے ہاتھ میں لاٹھی، بید یا واکنگ چھڑی رکھتے تھے، اس طرح انہیں کبھی تنہا ہونے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ خود اعتمادی بڑھتی تھی۔ اب کچھ نہیں تو آپ کم از کم کسی انجانے خطرے کے وقت اپنا جوتا تو استعمال کر ہی سکتے ہیں۔ جبکہ خود اعتمادی سے بڑھ کر آپ کا ساتھی اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ قصہ مختصر یہ کہ خوف ہمارے احساس کا ہی ایک نام ہے۔ جس طرح ہم خوش خبری پر خوش ہوتے ہیں بری بات پر افسردہ اسی طرح جان کے خوف کا احساس ہمیں ڈرا دیتا ہے۔ ڈرنا ہو تو ضرور ڈرو، مگر بلا سبب ڈرنا بری بات ہے۔ ہوش و حواس درست ہوں اور خود اعتمادی ساتھ ہو تو خوف کوئی چیز نہیں.....۔

لطف - لذّت - ذائقہ
ہوئیسٹ ®
ڈراپس
گلے کی خراش میں
بیحد مفید
گلے میں خراش۔ہوئیسٹ کی تلاش
اور سب ٹھنڈا ٹھنڈا
HOEST DROPS
TIPOO ENTERPRISES FAISALABAD
MASS

خوف کے مارے ہوئے ہر چیز سے ہارے ہوئے
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

ضروری نہیں کہ خوف کی یہ تمام قسمیں ہمارے معاشرے میں بھی پائی جاتی ہوں، البتہ یورپ اور امریکہ میں یہ خوف عام ہے خوف کی ان اقسام کو دیکھئے آرٹسٹ نے کس طرح محسوس کیا۔؟

کروما فوبیا

پاگل کہیں کا دیکھو رنگوں سے ڈر رہا ہے

ٹریس کیڈیکا فوبیا

۱۳ کے ہندسے کا خوف یورپ اور امریکہ کی عام بیماری

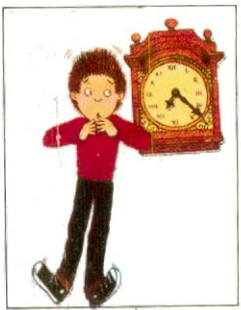

کرونو فوبیا گھڑیوں اور ان کی آوازوں کا خوف

ایوسو فوبیا بستر سے نکلنے کا خوف، دوسرے لفظوں میں نکلتے لوگوں کا خوف

اماتھو فوبیا
گرد و غبار کا خوف
اس خوف سے ہم بالکل عاری ہیں

چیونو فوبیا

برف باری کا خوف

یہ بھی ایوسو فوبیا کی ایک قسم ہے۔ گویا بستر میں دبکے رہنا۔
یا بستر سے باہر آنے کا خوف

میکرو فوبیا قطار میں لگنے کا خوف
کہیں یہ خوف ہم میں بھی تو نہیں پایا جاتا

ف ف ... فوبیا

محمد صالح ارشاد

مغربی ممالک کے احمقانہ اور عجیب و غریب خوف کا احوال

ہر شخص کسی نہ کسی چیز سے ڈرتا ہے، کچھ لوگ بے ضرر سے لال بیگ سے ڈرتے ہیں، کچھ لوگ چوہوں سے ڈر کے میزوں پر چڑھ جاتے ہیں، حتیٰ کے کچھ لوگ تو رنگوں، کھانوں اور کپڑوں تک سے ڈرتے ہیں، چیزوں سے ڈرنا ایک اچھی بات ہے یہ ایک طرح سے قدرتی دفاع ہے ان چیزوں کے خلاف جو آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہیں، جیسے کہ بلندی کا خوف، خطرناک جانوروں کا خوف، آگ کا خوف وغیرہ۔

خوف کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں، ایک قسم کو ہم فوبیا کہتے ہیں، فوبیا دراصل ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ڈر یا خوف کے ہیں۔

یہاں ہم فوبیا کی چند ایسی اقسام کا ذکر کر رہے ہیں جو شاید آپ نے آج سے پہلے نہ سنی ہوں۔

فوبیا کی یہ اقسام دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مضحکہ خیز بھی ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے زیادہ تر خوف کا شکار یورپ اور امریکہ میں بسنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

(۱) ۔ ٹرس کیڈیکا فوبیا۔ آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ یہ فوبیا جن لوگوں کو لاحق ہوتا ہے وہ تیرہ نمبر سے، جی ہاں نمبر ۱۳ سے ڈرنے لگ جاتے ہیں اور اس نمبر کو دیکھ کر ایسے خوفزدہ ہو جاتے ہیں جیسے کوئی شیر دیکھ لیا ہو۔ مغرب میں یہ خوف بہت عام ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۳ کے ہندسے کو منحوس سمجھا جاتا ہے اور اکثر عمارتوں میں تیرہویں منزل نہیں ہوتی بلکہ بارہ کے بعد ایک دم چودھویں منزل شروع ہو جاتی ہے۔

(۲) ۔ چیونو فوبیا۔ اس قسم کے فوبیا میں لوگ برف باری سے ڈرتے ہیں اور اس سے دور بھاگتے ہیں۔

(۳) ۔ کرونو فوبیا۔ آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ لوگ گھڑیوں سے بھی ڈرتے ہیں، فوبیا کی اس قسم میں کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

(۴) ۔ کرومافوبیا یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ خوبصورت اور پیارے پیارے رنگوں کی وجہ سے ہی دنیا خوبصورت نظر آتی ہے۔ اگر کائنات

میں رنگ ہی نہ ہوں تو کیسا عجیب لگے لگا۔ بالکل ایسا ہی لگے گا کہ جیسے کوئی ٹی وی پروگرام رنگین کے بجائے بلیک اینڈ وہائٹ دیکھا جائے۔ لیکن کچھ احمق لوگ رنگوں سے بھی ڈرتے ہیں اور ان سے دور بھاگتے ہیں۔ ہے نا حیرت کی بات۔

(۵) ۔ اماتھوفوبیا کچھ لوگ گرد و غبار وغیرہ سے بھی خوف کھاتے ہیں، ویسے ایک طرح سے دھول مٹی سے خوف کھانا بھی چاہئے۔ کیونکہ دھول میں جانے سے اچھا بھلا آدمی بھی بھوت بن جاتا ہے۔

(۶) ۔ یوسوفوبیا یہ فوبیا ان لوگوں کو ہوتا ہے جو کاہل اور نکمے ہوتے ہیں، بس بستر پر لیٹے رہنے کا شوق ہوتا ہے، صبح جب سورج اس بات کا پیغام لئے طلوع ہوتا ہے کہ چلو سب اپنے اپنے کام پر جاؤ تو کچھ کاہل لوگ صبح کی روشنی سے لطف اٹھانے کے بجائے ڈر جاتے ہیں۔ ہے نا شرم کی بات۔

(۷) ۔ میکروفوبیا دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں نظم و ضبط اور سلیقہ بالکل نہیں ہوتا۔ کام کو فوراً ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر کبھی لائن میں لگنا پڑ جائے تو ان کی جان نکلنی شروع ہو جاتی ہے کہ لائن میں کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ فوبیا ایسے ہی لوگوں کو ہوتا ہے حالانکہ لائن تو اس لئے لگتی ہے کہ ہر آدمی اپنی باری آنے پر اپنا کام اطمینان اور سکون سے کر سکے۔ لائن میں کھڑے ہو کر اپنا کام انجام دینا ایک بہت اچھی بات ہے۔ اس میکروفوبیا کا شکار غالباً ہم لوگ سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم میں نظم و ضبط کی بھی کمی ہے اور ہم قطار بنانے میں تو سخت کاہلی محسوس کرتے ہیں۔

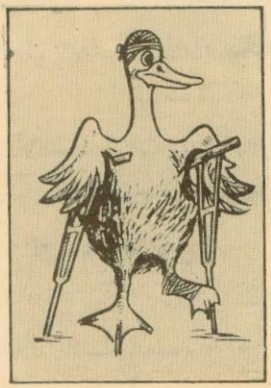

پرندوں کو نہ ماریئے

پرندے ہماری کائنات کا حسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

اِنھیں نہ ماریئے

انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

ادارہ آنکھ مچولی

ساحلی جھیل کا بھوت

شین فاروقی

ایک بہادر لڑکے کی کہانی جس نے اپنے بھالے سے بھوت کو ہلاک کر دیا

بورابورا نام کا جزیرہ ماکو کا وطن ہے۔ یہ جزیرہ ہمارے ملک سے بہت دور بحرالکاہل میں واقع ہے۔ رقبہ کے اعتبار سے یہ کوئی بڑا جزیرہ نہیں ہے آپ کشتی کے ذریعہ ایک دن میں آسانی کے ساتھ اس کا چکر لگا سکتے ہیں۔ جزیرہ کا درمیانی اور اہم ترین حصّہ سطح سمندر سے خاصا بلند ہے۔ دور سے دیکھنے پر یہ حصّہ ایک قلعہ کی مانند نظر آتا ہے۔ اس حصّہ کی ڈھلوان چٹانوں پر آبشار سفید سفید پگڈنڈیاں سی بناتے ہوئے گرتے ہیں۔ اگر آپ نظر اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو بہت سی پہاڑی بکریاں ادھر ادھر قلانچیں مارتی نظر آئیں گی۔

مکاؤ اسی جزیرہ کے اس حصہ میں پیدا ہوا تھا جو سمندر سے بہت قریب ہے۔ مکاؤ کے دن کا بیشتر وقت ساحلی جھیل کے آس پاس گزرتا۔ اس جھیل کو جزیرہ کے دو کٹے ہوئے بازو نما حصّوں نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ مکاؤ کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے بڑا ہنر رکھا تھا۔ اس نے وہیل وغیرہ کے شکار کے لئے پانچ نوکیلے برچھوں والا ہتھیار بنایا ہوا تھا۔ مکاؤ کے پاس ایک چھوٹی سی کشتی بھی تھی، یہ کشتی بھی مکاؤ نے ایک درخت کے تنے کو درمیان سے ہلکا سا کھود کر خود ہی تیار کی تھی۔ کشتی کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے مکاؤ نے کشتی کے ایک طرف بانس نما ایک چیز باندھ رکھی تھی۔ مکاؤ کی یہ کشتی بس اتنی بڑی تھی کہ وہ خود اور اسکا پیارا کتا افا اس میں آسانی کے ساتھ بیٹھ سکتا تھا۔

پورا جزیرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ اچانک سمندر میں جوار بھاٹا آگیا اور سمندر کی موجیں جزیرے کی چٹانوں سے سر ٹکرانے لگیں۔ مکاؤ اس وقت چٹائی پر لیٹا ہوا اپنے دادا کی باتیں سن رہا تھا۔

مکاؤ کے دادا اس وقت ساحلی بھوت ٹوپا کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ مکاؤ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ اس خطرناک بھوت کے بارے میں طرح طرح کے قصے سن رہا تھا۔ جزیرہ کے مچھیرے ایک ساتھ بیٹھتے تو اسی بھوت کے بارے میں باتیں کرتے۔ بستی کے بڑے بوڑھے سرد راتوں میں جب الاؤ کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ تاپتے تو وہ بھی اس بھوت کے کبھی نہ ختم ہونے والے قصوں کو دہراتے۔

ٹوپا کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ساحلی جھیل کو اپنا گھر سمجھتا ہے۔ جزیرے کے باشندے ٹوپا کو خوش کرنے کے لئے اکثر راتوں کو جھیل کے کنارے بکری، بھیڑ، یا کھانے پینے کی کوئی اور چیز رکھ دیتے۔ لوگ صبح اٹھ کر دیکھتے تو کھانے کی یہ چیزیں پراسرار طور پر غائب ہو جاتیں۔ یہ دیکھ کر لوگ مطمئن ہو جاتے اور سوچتے کہ یقیناً ٹوپا ہی نے انہیں کھا لیا ہے۔ تاہم اس کے باوجود بھی جزیرے کے مچھیروں کے جال اکثر کٹے پھٹے پائے جاتے اور ان کی مچھلیاں غائب ہو جاتیں۔ ''لگتا ہے ٹوپا بہت ہی بھوکا ہے؟'' جزیرے کے لوگ اس پر تبصرہ کرتے۔

جزیرے کے بہت کم لوگوں نے ٹوپا کو دیکھا تھا۔ مکاؤ کے دادا ان لوگوں میں سے ایک تھے۔

''آخر وہ ہے کیسا؟'' مکاؤ نے اپنے دادا سے شاید سوویں مرتبہ پوچھا۔

مکاؤ کے دادا نے پوتے کا سوال سن کر خاموشی سے سر کو ہلایا۔ آتشدان میں شعلے بھڑکے اور

مکاؤ کے دادا کے سفید بال ان کی روشنی میں چمک اٹھے۔

"ٹوپا چٹانوں کے سلسلہ میں واقع ایک غار میں رہتا ہے۔ اس کا قد اس کے گھر سے بڑا ہے۔ اس کی کمر پر ایک بادبان ہے۔ یہ بادبان اگرچہ بہت بڑا نہیں ہے لیکن دیکھنے میں یہ انتہائی خوفناک ہے کیونکہ اس میں سے سفید آگ کے شعلے بلند ہوتے رہتے ہیں۔ ایک بار میں رات کو جھیل میں مچھلیاں پکڑ رہا تھا تو میں نے ٹوپا کو ایک دوسری کشتی کی جانب آتے دیکھا....."

"پھر کیا ہوا؟" مکاؤ بے تابی کے ساتھ کہنیوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولا۔ مکاؤ نے یہ قصہ پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

اس کے دادا کی آواز مدھم ہوتے ہوتے سرگوشی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"ٹوپا نے اس کشتی کو پانی میں ڈبو دیا۔ مجھے یاد ہے اس وقت جھیل کا پانی اس کے جلتے ہوتے بادبان سے کھول اٹھا تھا۔ اس کشتی میں سوار تینوں مچھیرے ڈوب کر مر گئے۔ اگرچہ وہ تینوں بہت اچھے تیراک تھے۔"

اتنا کہہ کر مکاؤ کے دادا نے افسوس اور خوف کے عالم میں اپنے سر کو ہلایا اور بولے۔ "ٹوپا کے بارے میں بات کرنا بھی خطرناک ہے۔ اس کے تو نام میں بھی نحوست اور دہشت پوشیدہ ہے۔"

"مگر بادشاہ اوپونائی نے تو اس کی گرفتاری پر نقد انعام کا اعلان کر رکھا ہے" لڑکے نے نشاندہی کی۔

"ہاں اس کے علاوہ تیس ایکڑ زرخیز زمین اور ایک عمدہ کشتی کا بھی" بوڑھے آدمی نے کہا۔

"مگر تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی نے بھوت کو گرفتار کیا ہو"؟

"تیس ایکڑ زرخیز زمین اور ایک عمدہ کشتی۔ میرے خدا! اگر میں یہ انعام جیت لوں تو مزا آجائے" مکاؤ بدبدایا اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

دادا نے اگرچہ مکاؤ کے اس منصوبہ کے بارے میں کچھ نہ کہا لیکن مکاؤ کی ماں نے سختی کے ساتھ مکاؤ کو اس احمقانہ حرکت سے باز رہنے کو کہا۔ "اب چپ ہو جاؤ اور جا کر سو جاؤ تم نے سنا نہیں تمہارے دادا نے کیا کہا؟ ٹوپا کا نام لینا بھی نحوست کی بات ہے۔ آہ! ہم پہلے ہی ایک دکھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ تمہارے والد....." مکاؤ کی ماں یکایک کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"میرے والد کو کیا ہوا تھا......" ؟ مکاؤ نے تیزی کے ساتھ چٹائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"آپ ہی بتائیے اسے" ماں نے دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔
دادا نے گلا صاف کیا اور آتشدان کی کم ہوتی ہوئی آگ میں پھونک ماری۔ آتشدان میں شعلے بلند ہوئے اور تھوڑی دیر کے لئے کمرہ روشن ہو گیا۔
"تمہارا باپ" دادا نے بیان شروع کیا۔ "ان تینوں مچھیروں میں سے ایک تھا جن کی کشتی کو ٹوپا نے ڈبو یا تھا" دادا کے الفاظ ہوا میں یوں گرے جیسے پتھر گہرے کنویں میں گرتے ہیں۔
مکاؤ کو جھرجھری آ گئی۔ اس نے اپنے ماتھے پر پڑے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے درست کیا۔ اور پھر تیز آواز میں بولا۔ "میں ٹوپا کو ہلاک کر کے بادشاہ کا انعام ضرور جیتوں گا" یہ کہہ کر وہ اپنے گھٹنوں کے سہارے بیٹھ گیا۔ اس کا دبلا جسم سخت ہو گیا تھا، اور اس کی آنکھیں آتشدان کی مدھم روشنی میں چمک رہی تھیں۔
"خبردار جو تم نے ایسی الٹی سیدھی باتیں کیں۔ اب جا کر سو جاؤ کیا تم ہمیں بھی مروانا چاہتے ہو" مکاؤ کی ماں بھڑ گئی۔
مکاؤ ماں کی ڈانٹ سن کر چٹائی پر لیٹ گیا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ناریل کے پیڑ طوفانی ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔
مکاؤ اگلے روز دیر سے سو کر اٹھا۔ وہ ساری رات ٹوپا کے متعلق طرح طرح کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ اس وقت دوپہر ہو رہی تھی۔ مکاؤ نے اپنے پیارے کتے افا کو آواز دی اور اسے ساتھ لے کر جھیل میں نہانے کے لئے چل پڑا۔ وہ دونوں نہا کر لوٹے تو مکاؤ کی ماں ان کا انتظار کر رہی تھی۔
"یہ کیلوں کا آخری گچھا ہے" ماں نے مکاؤ کو بتایا "اب تم دوپہر کے بعد چٹانوں پر جانا اور کل کے لئے مزید کیلے لے کر آنا۔" مکاؤ نے ہاں میں گردن ہلا دی۔ بھلا وہ اس بات سے خوش کیوں نہ ہوتا۔ اسے چٹانوں کے اس حصہ کی طرف جانے کا موقع مل رہا تھا جو اس کا من پسند علاقہ تھا۔ اس علاقے میں سنگترے اور کیلے کثیر مقدار میں پیدا ہوتے تھے۔ یہ علاقہ ساحل سے آدھا میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔
"آؤ افا...... ہم ایک مہم پر جا رہے ہیں" مکاؤ نے چلّا کر افا کو آواز دی۔ پھر اس نے اپنا لمبا سا چاقو

اور نوکیلے برچھوں والا بھالا اٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کشتی میں اپنے کتّے سمیت سوار ہو کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ افاخوشی سے اپنی دم ہلا رہا تھا۔ مکاؤ کی ننھی کشتی جھیل کے پانی کو یوں چیرتی چلی جا رہی تھی جیسے تیز چھری خربوزے کو چیرتی ہے۔ جھیل کا پانی اس وقت اس قدر صاف تھا کہ مکاؤ پانی کی سطح سے چالیس فٹ اندر موجود پیڑ پودوں کو آسانی کے ساتھ دیکھ سکتا تھا۔

مکاؤ تیزی کے ساتھ چپّو چلا رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ٹوپا کا خیال بجلی کی طرح کوندا۔ بھری دوپہر میں بھوت وغیرہ کے بارے میں سوچنا ذرا احمقانہ سی بات لگتی ہے۔ سورج کی تیز دھوپ اس طرح کے خیالات کو بھاپ بنا کر اڑا دیتی ہے۔ اور انسان سوچتا ہے کہ بھوت وغیرہ کے قصّے بوڑھے لوگوں کے دماغوں کی پیداوار ہیں۔

مکاؤ اپنے بھالے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے گزشتہ رات والا وعدہ یاد آیا۔ مگر کیا ایک بھوت کو بھالے سے ہلاک کیا جا سکتا ہے؟ "کیوں نہیں" اس کے اندر سے آواز آئی۔ مکاؤ کی گرفت چپّو پر سخت ہو گئی۔

مکاؤ کنارے سے دور ہوا تو اسے جھیل کے پانی میں تیرتے ہوئے مونگے نظر آنے لگے۔ مکاؤ کو مونگے بہت پسند تھے۔ اچانک اس کی نظر ایک سفید مونگے پر پڑی لمبا اور پتلا سا یہ مونگا شارک کی طرح لگ رہا تھا۔ یہ مونگا پانی کی سطح سے تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کے پشت پر ایک ابھری ہوئی پٹی تھی جس سے مکاؤ کو اندازہ ہوا کہ وہ تیرتا ہوا پر ہے۔ اس کے آگے کی طرف دو گہرے سوراخ تھے جو آنکھوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

مکاؤ نے اپنے بھالے کو تیار کر لیا ایسے جیسے وہ اس پر حملہ کرنے والا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ شارک کی کمزور ترین جگہ اس کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ مکاؤ نے سوچا اگر میں یہ برچھا چلاؤں تو میرا برچھا مونگے کو ادھر ادھر سے چھوئے بغیر اس کی آنکھوں کے آر پار ہو گا۔ مکاؤ نے اپنے تئیں مونگے کو ٹوپا کا نام دے دیا تھا۔

آج صبح ہی جب وہ کیلے لانے کے لئے روانہ ہوا تھا اس نے گھر سے باہر آ کر ایک زوردار آواز میں ٹوپا کو چیلنج کیا تھا "میرا انتظار کرنا، میں بس ذرا کیلے لے کر واپس آ رہا ہوں۔ واپس آ کر میں تمہارا کام تمام کر دوں گا" مکاؤ نے جب زوردار آواز میں یہ کہا تھا تو اس کے پیارے کتے افا نے اسے جوش میں دیکھ کر زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

بالآخر مکاؤ کی ناؤ نے اس جزیرے کی ریت کو چھوا جہاں کیلے اگتے تھے۔ افا بھونکتا ہوا جنگل کی طرف دوڑ پڑا۔ اس کے بھونکنے کی آواز سن کر جنگلی چڑیوں کے جھنڈ پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔

مکاؤ نے کشتی کنارے لگائی اور کیلے کاٹنے والا چاقو لے کر افا کے پیچھے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگل میں روشنی اتنی گہری اور ہری تھی کہ مکاؤ کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ پانی کے اندر سفر کر رہا ہے۔ درختوں کی ٹہنیوں نے بہت اوپر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک چھت سے بنائی ہوئی تھی۔ مکاؤ کے جنگل میں داخل ہوتے ہی بگلوں کا ایک غول زمین سے اڑ کر درختوں پر جا بیٹھا۔ تبھی نہ جانے کہاں سے ایک جنگلی سور نکل کر بھاگا۔ افا بھونکتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔ مکاؤ کے پاس اس وقت اپنی حفاظت کے لئے صرف کیلے کاٹنے والا چاقو تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں جنگلی سور لوٹ کر اس پر حملہ نہ کر دے مگر افا اسے بہت دور بھگا آیا تھا۔

تھوڑے فاصلے پر کیلوں کے بہت سے درخت تھے جن پر کیلے لدے ہوئے تھے۔ مکاؤ نے بہت سے کیلے توڑے۔ پھر اسے خیال آیا کہ کیوں نہ تھوڑے سے سنترے بھی توڑ لئے جائیں۔ اس جگہ کے سنترے بورابورا کے سنتروں سے زیادہ رسیلے اور مزیدار تھے۔ چنانچہ اس نے کچھ سنترے بھی توڑے۔ اس دوران افا کہیں دور کھڑا بھونکتا رہا۔ افا عام طور پر کسی مچھلی، چڑیا یا سور کو دیکھ کر بھونکتا تھا۔

مکاؤ سنترے توڑنے میں ایسا مگن ہوا کہ اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اسے خیال آیا تو اس وقت جب اسے یکایک اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے کا احساس ہوا۔ اس طرح کے جزیروں پر رات اچانک ہی آجاتی ہے۔

مکاؤ نے جلدی جلدی کیلوں اور سنتروں کی ٹوکریاں اٹھائیں اور کنارے کی سمت بڑھنے لگا۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے ان کو جلدی سے کشتی میں ڈالا۔ پھر اس نے سیٹی بجا کر افا کو بلایا۔ افا دُم ہلاتا ہوا جنگل سے بر آمد ہوا اور کشتی میں سوار ہو گیا۔

اندھیرا تیزی کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا۔ دور بورا پورا کے جزیرے پر چولہوں میں جلنے والی آگ کی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد رات کا پہلا ستارہ اندھیری چٹانوں پر چمکنے لگا۔ مکاؤ کی کشتی اپنی منزل کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

جھیل کا سیاہ پانی فاسفورس کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ مکاؤ کی چھوٹی سی کشتی یوں لگتا تھا جیسے پیلی

آگ کے سلسلے کو چیرتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ مکاؤ کے چپو کی ہر حرکت سے روشنی کی بہت سی لہریں پیدا ہوتی تھیں۔ مکاؤ کی کشتی جب اس مونگے کے پاس پہنچی جو اسے دوپہر جاتے ہوئے ملا تھا تو مکاؤ نے زور سے چلا کر کہا۔

"اوٹوپا! آج مجھے دیر ہوگئی ہے لیکن تمہیں سبق سکھانے کے لئے میں کل پھر آؤں گا" شارک نما مونگا تاریکی میں جھلملایا۔

عین اسی وقت اچانک مکاؤ کا سانس اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ بے جان ہوگئے۔ مکاؤ نے دیکھا کہ اس مونگے سے ذرا فاصلے پر ایک اور عظیم الشان پَر موجود تھا۔ مکاؤ نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ پر حرکت کر رہا تھا۔

مکاؤ نے چپو چلانا بند کر دیا اور اپنی آنکھوں کو زور سے ملا کہ شاید یہ اس کی نظر کا دھوکہ ہو۔ افا خوفناک طریقے سے بھونکنے لگا تھا۔ سفید رنگ کا بادبان جیسا بڑا سا پر فاسفورس کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ مکاؤ کو احساس ہوا کہ وہ ٹوپا ہے..... اصلی ٹوپا..... ساحلی جھیل کا بھوت۔

اسے اپنے پاؤں کانپتے محسوس ہوئے۔ اس نے چلّانے کی کوشش کی مگر اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ عظیم الجثہ شارک مکاؤ کی ننھی کشتی کے چکر لگانے لگی۔ ہر چکر کے ساتھ وہ کشتی کے قریب ہوتی جارہی تھی۔ اب مکاؤ شارک کے جسم سے نکلنے والی فاسفورس کی روشنی کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ اور قریب ہوئی تو مکاؤ کو اس کی پیلی آنکھیں اور بڑے بڑے جبڑے نظر آئے مکاؤ کے سر سے پاؤں تک سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بھوت اس کے سامنے چکر کاٹ رہا تھا۔

اچانک افا خوف زدہ ہو کر کشتی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف کودا۔ مکاؤ نے آگے جھک کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اسے غصہ سے ہلایا۔ مکاؤ اور کتے کے ایک طرف آجانے سے کشتی کا توازن بگڑ گیا مکاؤ نے یہ دیکھتے ہی کشتی کا توازن برقرار رکھنے کے لئے دوسری طرف جھکنے کی کوشش کی اسی لمحے افا اس کی گود سے نکل کر جھیل کے پانی میں جا گرا۔

مکاؤ نے غصہ سے افا کو گھورا۔ کتا کشتی کی طرف تیرنے کے بجائے کنارے کی طرف جارہا تھا۔ شارک اس سے تھوڑے فاصلے پر کشتی کا چکر لگا رہی تھی۔

"افا..... افا..... واپس آؤ، واپس آؤ" مکاؤ چلایا مکاؤ کی آواز سن کر کتا دوبارہ کشتی کی طرف

تیرنے لگا۔ مکاؤ افا کو پکڑنے کے لئے کشتی کے ایک طرف جھک گیا۔ ''کیا افا کشتی تک پہنچ سکے گا''؟

مکاؤ کے ذہن میں خیال آیا۔ اچانک مکاؤ نے اپنا بھالا اٹھالیا۔ اور کھڑا ہو گیا۔ اب وہ اپنے آپ کو طاقت ور محسوس کر رہا تھا۔ اس کا ساتھی اس کا پیارا کتا یقینی موت کی گرفت میں آنے والا تھا۔

افا کشتی کی طرف تیزی سے تیر رہا تھا۔ شارک نے کشتی کے اطراف میں چکر لگانا بند کر دیا تھا شاید وہ اب حملہ کے لئے تیار تھی۔ مکاؤ نے بھالا تان لیا اس کے چہرہ سے اس کے ارادہ کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ اچانک شارک کشتی پر حملہ آور ہوئی اسی لمحے مکاؤ کا بھالا پوری طاقت کے ساتھ شارک کی طرف لپکا۔ بھالا اپنے درست نشانے پر لگا تھا۔ شارک کی ایک آنکھ بے کار ہو چکی تھی۔ تکلیف اور غصہ سے بھر کر شارک پانی میں تڑپنے لگی۔ مکاؤ کی کشتی دائیں بائیں لہروں پر جھولنے لگی۔ مکاؤ بڑی مشکل سے اپنا توازن قائم رکھ پا رہا تھا۔

اسی اثناء میں افا کشتی تک پہنچ گیا۔ مکاؤ نے جھک کر اسے اپنے گود میں لے لیا۔ اور پھر اسے لمحہ بھر میں کشتی میں چھوڑ کر دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ شارک دوبارہ کشتی پر جھپٹی۔ مکاؤ کا بھالا ایک بار پھر ہوا میں سنسناتا ہوا اپنے نشانے پر جا لگا۔ شارک اپنی دوسری آنکھ سے بھی محروم ہو چکی تھی۔ اندھے پن اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کے باعث ٹوپا ایک کروٹ ہو کر پانی پر لیٹ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مر چکا ہے۔

مکاؤ کو معلوم تھا کہ شارک کتنی چالاک ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد مکاؤ آہستہ آہستہ کشتی چلاتا ہوا شارک کی طرف بڑھا۔ وہ شارک کے قریب گیا تو اسے شارک کی بڑی سی دم دھیرے دھیرے ہلتی نظر آئی۔ شارک ابھی زندہ تھی۔ مکاؤ کو معلوم تھا کہ شارک کی ہلکی سے حرکت سے اس کی ناؤ الٹ سکتی ہے جس کے نتیجے میں وہ خود اور اس کا کتا جھیل میں جا گریں گے یہ ایک خطرناک بات ہو سکتی تھی۔

تھوڑے انتظار کے بعد بالآخر مکاؤ نے شارک پر آخری حملہ کی تیاری کی۔ اس نے اپنا بھالا ہوا میں تانا اور شارک کے گلپھڑے میں پیوست کر دیا۔

کچھ وقفے بعد شارک پانی پر تیرنے لگی۔

ٹوپا مر چکا تھا۔

یہ دیکھتے ہی مکاؤ نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ شارک کی دُم کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر مکاؤ نے بورابورا کے ساحل کی جانب ناؤ کھینی شروع کی۔ شارک کا پرفاسفورس کی روشنی بکھیرتا چلا جارہا تھا۔

لوگ باگ خوشی سے چیختے چلاتے بورابورا کے ساحل کی طرف دوڑے اور پھر کشتیوں میں بیٹھ کر مکاؤ کی کشتی کی جانب چل دیئے۔ ان کی آوازیں مکاؤ تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"مکاؤ نے ساحلی جھیل کے بھوت کو مار دیا ہے"۔

اس رات تھکا ہارا مکاؤ چٹائی پر لیٹا ہوا سمندر کی لہروں کے شور کو سن رہا تھا۔ اس نے اپنے دادا کو ایک نیا گیت گاتے سنا۔ یہ وہی گیت تھا جو اگلے دن بادشاہ اوپونائی کی اس ضیافت میں گایا جانے والا تھا جو مکاؤ کے اعزاز میں دی جارہی تھی۔ مکاؤ کی ماں چولہے کی آگ میں پھونکیں مار رہی تھی۔ ستارے زمین کے قریب آکر دوستوں کی آنکھوں کی طرح جھل مل کر رہے تھے۔ مکاؤ تک اس کے دادا کی آواز اب بہت دور سے آرہی تھی وہ گا رہے تھے۔

"تمیں ایکڑ دھرتی اور ایک عمدہ کشتی....."

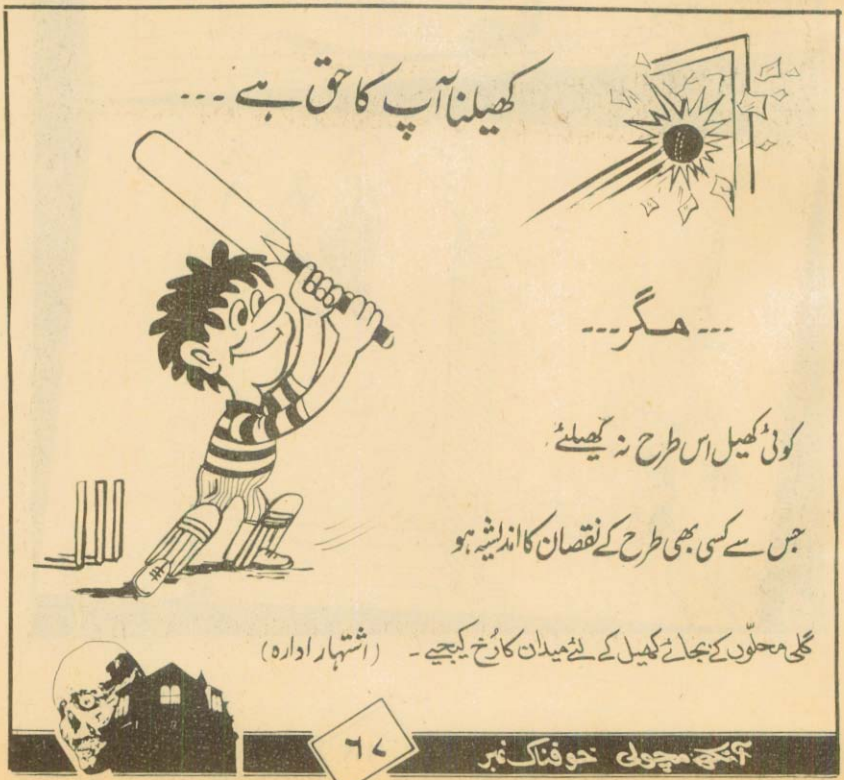

خزانے کی تلاش

روح نے نوکری بچالی

س ۔ م ۔ دانش

ایک اصول پسند روح کی کہانی

"آج سے تمہیں ہیڈ کانسٹیبل کے عہدے پر ترقی دی جاتی ہے، مجھے پوری امید ہے کہ تم ماضی کی طرح مستقبل میں بھی اپنے فرائض اسی محنت، لگن اور ذمے داری کے ساتھ ادا کرتے رہو گے"۔

سپاہی شہاب الدین کو اس کی بہادری، احساس ذمہ داری اور لگن پر خصوصی انعام سے نوازتے ہوئے ایس۔ پی چودھری نے کہا۔

سپاہی شہاب الدین نے کھٹاک سے دونوں ایڑیاں آپس میں ملائیں پوری چستی سے صاحب کو محکمانہ سلیوٹ کیا، اور سپاہیانہ انداز میں سینہ تانے چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا، ابھی، ابھی ملنے والی ترقی اور صاحب کے تعریفی کلمات سے وہ بہت خوش تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا، کون کہتا ہے کہ ایمانداری، محنت اور لگن سے فرائض انجام دینے کا انعام نہیں ملتا، پھر وہ نپے، تلے قدم اٹھاتا، پولیس لائین میں ملنے والے اپنے رہائشی کوارٹر کی طرف چل دیا۔

کل سے اسے نئے فرائض سنبھالنے تھے اس کی ڈیوٹی ولا راؤنڈ ایریا میں لگائی گئی تھی۔

شاداب نگر پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا ایک سرسبز و شاداب شہر تھا۔ یہاں کی قدرتی آب و ہوا، خوبصورت اور دلکش مناظر اپنی مثال آپ تھے۔ سبزے سے لدی ہوئی خوبصورت پہاڑیوں پر سے شہر کا منظر اور بھی حسین محسوس ہوتا۔ شہر کے عین وسط میں مرکزی بازار تھا، جہاں ہر قسم کی چیزیں آسانی سے مل جایا کرتی تھیں۔ صاف ستھرا، شہر اور صحت مند تندرست و توانا لوگ اس شہر کی شناخت تھے۔ اس شہر میں ایک قبرستان بھی تھا۔ گورا قبرستان کے متعلق بتایا جاتا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی مختلف لڑائیوں میں حصہ لینے والے انگریز سپاہیوں اور افسروں کی قبریں اسی قبرستان میں تھیں۔ شہاب الدین کو اس کے محکمے کے ایک ساتھی قیصر نے بتایا تھا کہ "یہ علاقہ دس بجے رات کے بعد سے سنسان ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ رات کی ڈیوٹی دیتے ہوئے طویل خاموشی اور تنہائی کے احساس سے کبھی دل بری طرح گھبرانے بھی لگتا ہے"۔

"بھائی۔ تو فکر مت کر..... مجھے خاموشی یا تنہائی سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہوتا"، شہاب الدین نے بڑی بے پروائی سے اپنے دوست کو جواب دیا تھا۔ قیصر نے شہاب الدین کو گورا قبرستان میں ایک انگریز افسر کی قبر دکھا کر بتایا تھا کہ وہ کسی لڑائی میں مارا گیا تھا اور اس کی انگریز بیوی نے اس کے مرنے کے کچھ عرصے بعد دوسری شادی کر لی تھی تب سے اس کی روح برابر بھٹکتی پھر رہی ہے۔ سنا ہے، بہت ہی اصول کا پابند شخص تھا اور بے اصول لوگوں سے تو بہت بری طرح پیش آتا تھا۔

شہاب الدین نے ساری باتیں خاموشی سے سن تو لیں، مگر اسے یقین نہیں آیا۔

دوسری رات سے اس کی ڈیوٹی شروع ہوگئی، وہ گشت لگاتا ہوا قبرستان تک پہنچتا اور غیر ارادی طور پر اس کی نظریں پرانی قبروں کی طرف اٹھ جاتیں۔ ایک ہفتہ آرام سے گزر گیا اسے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہوئی۔ چیڑھ کے درختوں کی آواز بھی اس کے کانوں سے ٹکراتی، اور ہڈیوں کو کپکپا دینے والی سرد ہوائیں بھی چلتیں۔ مگر شہاب الدین معمول کے مطابق اپنی ڈیوٹی دیتا رہتا۔

آج شام ہی سے شہاب الدین کافی تھکاوٹ سی محسوس کر رہا تھا۔ دو دن قبل گاؤں سے اس کے والدین ملنے آئے تھے۔ دن میں خاطر مدارات اور ان سے باتیں کرنے کی وجہ سے اس کی نیند بھی پوری نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے ڈیوٹی کا نصف وقت تو بڑی کامیابی سے گشت لگاتے پورا کر لیا۔ مگر اس کے بعد نیند اس پر غالب آنے لگی۔ وہ بار بار اپنے آپ کو ڈیوٹی کے لئے آمادہ کرتا۔ آج تک وہ کبھی اپنے فرائض کی انجام دہی سے غافل نہیں ہوا تھا، لیکن یہ آج اسے کیا ہو رہا تھا اسے کیا معلوم تھا کہ عین اسی وقت ایک پولیس جیپ اسے چیک کرنے کے لئے ولاراؤنڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

شہاب الدین نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی، تین بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے سوچا کچھ دیر کے لئے کسی درخت کے موٹے تنے سے پیٹھ لگا کر اونگھ لیا جائے۔ پھر وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے وہ مستعد اور ہوشیار کھڑا ہو۔

جیپ موڑ پر آکر رک گئی..... اور پولیس وردی میں ملبوس ایک شخص اتر کر دھیرے، دھیرے آگے بڑھنے لگا، اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھی جس کی روشنی وہ ادھر، ادھر ڈال کر جائزہ لے رہا تھا۔

سوا تین بجے تک شہاب الدین کی آنکھیں پوری ہوشیاری کے ساتھ کھلی ہوئی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ نیند کے خمار سے جھپکنے لگیں..... یہاں تک کہ ساڑھے تین بجے وہ پوری طرح غنودگی کے عالم میں ڈوب گیا۔ اور نیند نے اس کے ہوش و حواس پر پوری طرح غلبہ پالیا۔

پولیس آفیسر برابر اپنی ٹارچ سے اطراف کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ولاراؤنڈ میں ڈیوٹی دینے والے سپاہیوں کی اپنی فرائض سے غفلت مشہور تھی۔ اکثر رات کو ڈیوٹی دینے والے سپاہی سوتے اور اونگھتے ہوئے پائے گئے تھے جس کی وجہ سے چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ سپاہیوں کو چوکنا رکھنے کے لئے محکمہ کی طرف سے ان لوگوں کی خصوصی نگرانی کی جاتی تھی۔ اس وقت شہاب الدین بھی آنے والے لمحے کی نزاکت سے قطعی بے خبر تھا۔

عین اسی وقت جیسے کسی نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ شہاب الدین ہڑبڑا کر ہوشیار ہو گیا۔ اور آنکھیں

پھاڑ پھاڑ کر اپنے جھنجوڑنے والے کو دیکھنے لگا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ نیند کا خمار دور کرنے کے لئے اس نے اپنی دونوں آنکھیں مل ڈالیں پھر ادھر، ادھر دیکھا مگر وہاں کوئی ہوتا تو نظر آتا۔ فضاء میں ایک گنگناتی ہوئی سی آواز ابھری، انگریزی لہجہ اور گوراشاہی اردو "بے وکوف..... تم اپنی نوکری کھونا مانگتا ہے..... تمارا صاحب اڈر ہی آنا مانگتا ہے ہوشیاری سے اپنا ڈیوٹی ڈو....." شہاب الدین نے پھر آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا خوف کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی..... جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا اسے جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا..... اس نے اس سمت اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں، جدھر سے آواز آتی محسوس کی تھی..... فضا میں ہواؤں کی شوں، شوں اور پتوں کے آپس میں ٹکرانے کی ملی جلی آوازیں تیز ہو گئی تھیں..... اندھیرے میں درخت جھومتے ہوئے دیو سے لگ رہے تھے، سردی کا اثر بھی بڑھ گیا تھا..... اور ایک لمبی تڑنگی سفید رنگت کی شبیہ فوجی وردی میں ملبوس قبرستان کی طرف اڑتی ہوئی سی نظر آئی..... اور ایک قبر کے پاس جا کر غائب ہو گئی.....

شہاب الدین کے پاس حیران ہونے کا وقت قطعی نہیں تھا۔ ویسے ساری صورت حال پوری طرح اس کی سمجھ میں آ چکی تھی..... قیصر کے الفاظ اس کے کانوں میں بری طرح گونج رہے تھے کہ سنا ہے وہ بڑا اصول پسند تھا، بے اصولی تو قطعی برداشت نہیں کرتا، کتنے ہی لوگوں کو اس کی سزا بھی دے چکا ہے..... اس نے ایک بار پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اس قبر کی طرف دیکھا جہاں وہ شبیہ غائب ہو گئی تھی اور پھر گشت پر چل پڑا.....

ٹھیک اسی لمحے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی، "رک جاؤ کون ہو تم....." اس نے اپنی رائفل سے نشانہ لیتے ہوئے کڑک کر پوچھا..... روشنی میں ذرا سی حرکت ہوئی اور اگلے ہی لمحے تھانہ انچارج اس کے سامنے تھا..... شہاب الدین نے فوراً رائفل سیدھی کی، اور سلیوٹ دے مارا۔ "سر آپ..... یہاں اس وقت....." اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں شہاب الدین..... آج کی رات بہت سرد ہے..... ہوا بھی کتنی تیز ہے..... میں نے سوچا، دیکھوں تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں....."

"نہیں جناب..... پریشانی کیسی..... ؟ سب ٹھیک ٹھاک ہے" "بہت اچھے..... شاباش....." کہتے ہوئے انچارج نے اس کے شانے پر تھپکی دی اور مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔

اگلے دن انگریز افسر کی سفید پتھر والی قبر پر تازہ پھولوں کی چادر بچھی ہوئی تھی۔

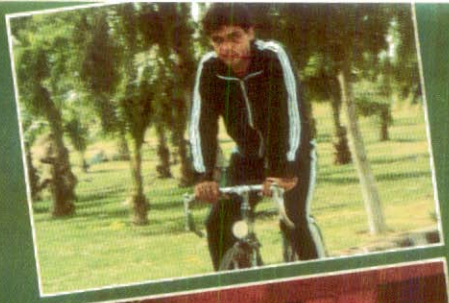

When you need a little pep-up along the way
The cool taste of
Paxy's®
Hacks will freshen your day
DROPS
Paxy's®
HACKS DROPS
HACKS®
mentholated drops
-to freshen your day.

لاوے سے بنے انساں ○ جو خوف کا تھے ساماں

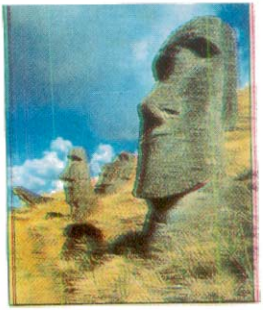

سلمیٰ سلیم

۱۷۷۲ء کا زمانہ ـــــ آسمان پر کالے بادل چھا جانے کے باعث رات اور زیادہ تاریک ہوگئی تھی ۔ سمندر میں اُٹھنے والی دیوہیکل لہریں یوں لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت دلندیزی مہم جُو کے ننھے سے جہاز کو کھا جائیں گی ۔ ۔ مُہم جُو کا جہاز لہروں کے خوفناک جبڑوں سے بچتا ہُوا بحرِ اوقیانوس کے ایک چھوٹے سے جزیرے کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ موت ہر لمحہ اُس کے تعاقب میں تھی ۔

بالآخر جہاز جزیرے کے ساحل سے جا لگا ۔ جہاز میں سوار مُہم جُو جہاز سے اُتر کر جزیرے کی طرف روانہ ہوا ۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ آسمان پر بجلی زور سے چمکی ۔ بجلی کی روشنی میں مہم جُو نے دیکھا کہ سامنے کی پہاڑی پر بہت سے دیوہیکل انسان کھڑے اُس کی جانب دیکھ رہے ہیں ۔ کسی انجانے خوف سے مُہم جُو کا دل اُچھل کر اُس کے حلق میں آگیا اور اُس کے تھکے ہوئے ذہن اور پیروں نے مزید چلنے سے انکار کر دیا ۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔ تبھی ساحل ہوا

کا ایک تیز جھونکا اسکے جسم پر ریت برساتا ہوا گزر گیا۔

صبح جب اسکو ہوش آیا تو اس نے پہاڑی کی طرف دیکھا اور اس کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ آکر گزر گئی۔ وہ اٹھا اور نقاہت کے ساتھ چلتا ہوا پہاڑی پر جا پہنچا۔ پہاڑی پر عجیب و غریب شکلوں والے بلند و بالا سینکڑوں مجسّمے موجود تھے۔ یہ وہی مجسّمے تھے جنہیں رات کو دیکھ کے مہم جو اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔ مہم جو دنیا بھر کے ماہرین آثار قدیمہ کے لئے ایک نئی اور دلچسپ جگہ دریافت کر چکا تھا۔

جلد ہی ان مجسّموں کو گرا کر ان پر تحقیق شروع کر دی گئی۔ طویل تحقیق کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ مجسّمے بحراوقیانوس کے کسی دوسرے جزیرے سے آکر یہاں آباد ہونے والے لوگوں نے ایک ہزار سال قبل بنائے تھے۔ یہ مجسّمے آتش فشاں کے خشک ہو جانے والے لاوے کی موٹی تہوں کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ یہ تمام مجسّمے ان لوگوں کے ان مذہبی پیشواؤں کے تھے جو مر چکے تھے اور جنہیں یہ لوگ عقیدت کے ساتھ یاد رکھنا چاہتے تھے۔

جزیرے پر ہونے والی دیگر تحقیقات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اس جزیرے کے رہنے والے افراد لکڑی اور دیگر قدرتی ذرائع کا استعمال جانتے تھے۔ تاہم جیسے جیسے جزیرے کی آبادی بڑھتی گئی وہاں کے لوگوں کے باہمی جھگڑے بڑھتے گئے۔ بالا آخر خانہ جنگی ہوئی اور بڑے پیمانے پر قتل عام کے بعد بہت سے لوگ وہاں سے ہجرت کر گئے۔ ان مجسّموں میں کچھ ادھورے مجسّمے بھی شامل تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے بنانے والے خانہ جنگی کے باعث انہیں مکمل نہ کر سکے۔

گذشتہ برسوں میں ٨٠٠ مجسّموں کو ان کے انہی مقامات پر نصب کر دیا گیا ہے جہاں وہ گرائے جانے سے قبل نصب تھے۔ ان مجسّموں میں چھ فٹ سے لے کر ٣٣ فٹ اونچائی رکھنے والے مجسّمے شامل ہیں۔ آج کل ماہرین کے سامنے اہم ترین سوال یہ ہے کہ ان کے بنانے والے اس قدیم زمانے میں جب کہ کرین وغیرہ موجود نہیں تھی ان بھاری بھر کم مجسّموں کو جزیرے کے میدانی علاقوں سے اٹھا کر پہاڑی پر کیسے لائے ہونگے؟ شاید ان ماہرین کو یہ معلوم نہیں کہ اگر انسان کے اندر محبت اور عقیدت کا جذبہ موجود ہو تو اس کے لئے بھاری سے بھاری چیز بھی پھول کی طرح سے ہو جاتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر پھول بھی پہاڑ کے وزن کا ہو جاتا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔

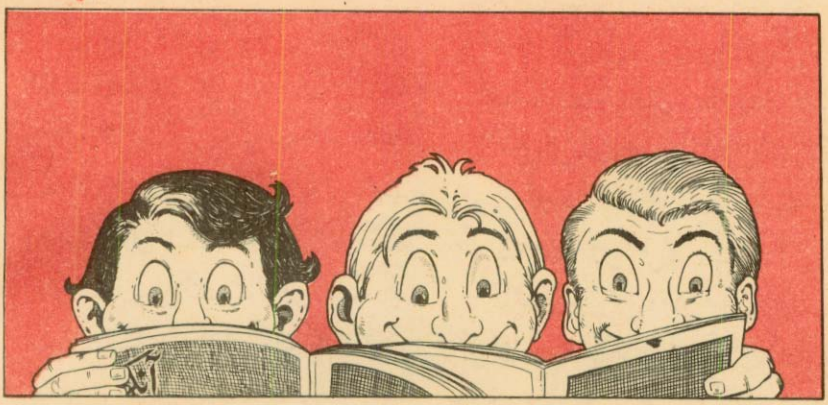

کھٹے میٹھے

انعامی لطیفہ

ایک زخمی شخص سڑک کے کنارے پڑا چلّا رہا تھا۔
"ہائے میں مر گیا، ہائے میں مر گیا۔"
ایک راہ گیر نے پوچھا "کیا ہوا بھائی کیوں اتنا چلّا رہے ہو؟"
زخمی شخص "ہائے کیا بتاؤں ایک ویگن مجھے ٹکر مار گئی۔ جان تو بچ گئی مگر...... ہائے......"
راہ گیر "مگر کیا ہوا؟"
زخمی شخص "مگر جب میں نے مڑ کر جاتی ہوئی ویگن کو دیکھا تو پیچھا لکھا تھا "دوست پھر ملیں گے۔"

رقیہ آرزو کوئٹہ

شاہد...... (اکبر سے) "تمہارے سر پر پٹی کیوں ہے؟"
اکبر...... "تمہیں وہ سیڑھیاں نظر آ رہی ہیں"؟
شاہد:۔ "ہاں"
اکبر:۔ "مجھے وہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔"
مشتاق احمد بروہی۔ منگھو پیر کراچی

ایک دوست:۔ (اپنے دوست کے نوکر سے)

اگر تم انٹر میں کامیاب ہوگئے تو میں تمہیں نئی موٹر سائیکل خرید کر دوں گا۔ مگر افسوس تم ناکام ہوگئے۔ آخر تم نے سارا سال کیا کیا؟"

میں سارا سال موٹر سائیکل چلانا سیکھتا رہا۔" بیٹے نے جواب دیا محمد عاقل احمد خان..... پرانا سکھر

شوکت تھانوی کی جب پہلی غزل چھپی تو انہوں نے رسالہ کھول کر میز پر رکھ دیا تاکہ آنے جانے والے کی نظر اس پر پڑے۔ مگر شامت اعمال سب سے پہلے ان کے والد صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی۔ انہوں نے غزل پڑھتے ہی ایسا شور مچایا جیسے چور پکڑ لیا ہو۔ والدہ محترمہ کو بلا کر کہا آپ کے صاحب زادے فرماتے ہیں:۔

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
تیرے کوچے میں جاکر ہم ذلیل و خوار ہوتے ہیں

"میں پوچھتا ہوں یہ جاتے ہی کیوں ہیں اور کس سے پوچھ کر جاتے ہیں"؟

والدہ بے چاری سہم کر رہ گئیں اور خوفزدہ آواز میں بولیں "ہائے ہائے بے چارا غلطی سے چلا گیا ہوگا۔

قیصر محمود۔ مانسہرہ

ایک صاحب پان کی دکان پر پہنچے اور اٹھنی دے کر بولے۔ "بھئی میرے پان میں لونگ، الائچی، سونف اور قوام بھی ڈال دینا۔ مسالے اور کھوپرا تو ڈالنا ہی اور ساتھ میں زردہ اور سپاری بھی"۔ پان والا جل کر بولا۔ "آپ نے جو اٹھنی دی ہے کہئے وہ بھی پان میں ڈال دوں؟

محمود اعجاز خان۔ بابر زئی

اپنی صحت کے متعلق ہر وقت وہم کرنے والے کی قبر پر لکھا تھا۔ "دیکھا میری تشویش بے سبب نہیں تھی"

عامر زیدی۔ حیدر آباد

فقیر:۔ "بیگم صاحبہ! آپ کے پاس کسی بھوکے کے لئے کچھ ہے؟"

بیگم صاحبہ:۔ "ہاں ہے لیکن وہ بھوکا ابھی دفتر سے نہیں آیا۔"

صبا ناز۔ جگہ نامعلوم

ایک شخص ہانپتا کانپتا پولیس اسٹیشن پہنچا۔ اور انسپکٹر سے کہنے لگا۔

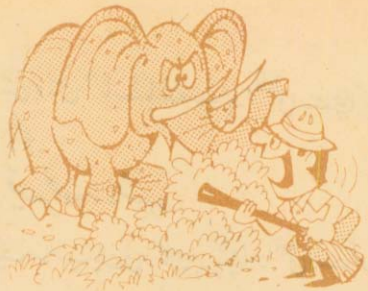

"کیا صاحب گھر پر ہیں"؟

نوکر:۔ "جی نہیں وہ کراچی گئے ہیں"

دوست:۔ "آرام و تفریح کی غرض سے گئے ہوں گے"؟

نوکر۔ "جی نہیں وہ بیگم صاحبہ کو بھی ساتھ لے گئے ہیں۔"

سلمان نقی۔ کراچی

"انسپکٹر صاحب مجھے جیل بھیج دیجئے میں نے اپنی بیوی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا"

انسپکٹر تیزی سے کھڑا ہوا۔ "کیا وہ مر گئی؟"

"یہی تو فکر کی بات ہے، وہ بچ گئی ہے" آدمی نے جواب دیا۔

قلب عباس گیلانی۔ پسرور

چچا نے بیٹے کو چھڑی مارتے ہوئے کہا۔

"بھتیجے رو مت، میں تمہیں اس لئے مار رہا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

لڑکے نے آنسو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کاش میں بھی اتنا بڑا ہوتا کہ آپ کی محبت کا جواب محبت سے دے سکتا۔"

شمس الدین..... کراچی

استاد (ناصر سے) "تمہارا مضمون بہت اچھا ہے۔ مگر لفظ بہ لفظ انعام کے مضمون سے ملتا جلتا ہے۔ اس سے میں کیا نتیجہ اخذ کروں۔"

ناصر:۔ "یہی کہ انعام کا مضمون بھی اچھا ہے۔"

امجد حسین ثانی..... لانڈھی کراچی

شمیم:۔ "میں ایک جادوگر کو جانتا ہوں۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ سے روپیہ غائب کر دیتا ہے۔"

ظفر:۔ "اس میں جادو کی کیا بات ہے؟ میری بیوی یہ کام نہایت عمدگی سے کرتی ہے"۔

طلحہ سلیم..... گلشن اقبال کراچی

ایک سارجنٹ نے پل سے دریا میں کود کر خودکشی کرتے ہوئے شخص کو پکڑ لیا اور بولا، "اگر تم نے دریا میں چھلانگ لگائی تو مجبوراً تمہیں بچانے کیلئے مجھے بھی پانی میں کودنا پڑے گا۔ سردی کا موسم ہے اور دریا کا پانی برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہے۔ جب میں تمہیں باہر نکال کر لاؤں گا اور ایمبولنس کی آمد کا تمہارے ساتھ کنارے پر لیٹ کر آدھے گھنٹے انتظار کروں گا تو

ایک دیہاتی نے کسی مولوی سے پوچھا
"جناب کیا جنت میں حقے بھی ملیں گے؟"
مولوی صاحب نے جواباً کہا "کیوں نہیں بھائی ضرور ملیں گے، مگر ان کے لئے آگ دوزخ سے لانا پڑے گی"

عمر اختر..... پشاور کینٹ

ہم دونوں کو ڈبل نمونیا ہو چکا ہو گا۔ ہسپتال تک پہنچنے سے پہلے ہم دونوں دم توڑ چکے ہوں گے۔ اس لئے تم گھر جاؤ اور پنکھے میں رسی ڈال کر لٹک جاؤ، شاباش"۔

محمد عظمت اللہ ملک۔ اورنگی ٹاؤن

باپ بیٹے سے۔ "میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ

ننھے نے اسکول سے آتے ہی اپنی ماں سے کہا "ممی پلیز کم ہیر" (یہاں آیئے) اس پر ماں نے خوش ہو کر کہا "واہ میرا بیٹا تو بہت اچھی انگلش بولنے لگا ہے"۔ اچھا یہ بتاؤ مجھے کمرے سے باہر بھیجنا ہو تو کیا کہو گے؟"

ننھے نے فوراً جواب دیا میں کمرے سے باہر جا کر کہوں گا "ممی کم ہیر"

سلمان اختر..... پشاور کینٹ

ایک عورت کے سر سے خون بہہ رہا تھا اس کا شوہر اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

"یہ کس طرح ہوا" ڈاکٹر نے پوچھا

اس کے شوہر نے جواب دیا "میری بیوی پیپر ویٹ سے دیوار پر کیل ٹھونک رہی تھی میں نے کہا کہ ذرا عقل سے کام لو اس کو رکھ دو اور کھوپڑی استعمال کرو۔" لیلیٰ حفیظ..... ملیر توسیعی کالونی کراچی

ایک ہوائی جہاز میں بہت سے پاگل سفر کر رہے تھے۔ فضا میں بلند ہونے کے تھوڑی دیر بعد جہاز ہلنے لگا۔ پائلٹ گھبرا گیا اور اپنے اسسٹنٹ سے بولا کہ اندر جا کر دیکھ کر آؤ کہ یہ جہاز کیوں ہل رہا ہے؟ اسسٹنٹ جب اندر گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سارے پاگل فٹ بال کھیل رہے ہیں صرف ایک پاگل بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ اس نے سارے حالات جا کر پائلٹ کو بتائے۔ پائلٹ بولا کہ جو

کتاب پڑھ رہا ہے اس سے کہو کہ اپنے ساتھیوں کو منع کرے ورنہ جہاز گر جائے گا۔ اسسٹنٹ نے جاکر اس کتاب پڑھنے والے پاگل سے جاکر کہہ دیا تھوڑی دیر بعد جہاز ٹھیک طرح چلنے لگا۔ پائلٹ بہت خوش ہوا اور اس نے اسسٹنٹ سے کہا کہ جاکر اس کا شکریہ ادا کرو۔ اسسٹنٹ اندر گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ کوئی پاگل نہیں ہے صرف وہی کتاب والا بیٹھا ہے۔

"باقی لوگ کہاں گئے؟" اسسٹنٹ نے اس پاگل سے پوچھا۔

"میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ باہر جاکر کھیلو ورنہ جہاز گر جائے گا" کتاب پڑھنے والے پاگل نے اطمینان سے جواب دیا۔

لبنیٰ جمال..... گلشن اقبال کراچی

ایک تاجر نے کاروبار کے سلسلے میں کسی دوسرے تاجر کے خلاف مقدمہ کیا، لیکن مقدمے کے فیصلے سے پہلے ہی اسے ملک سے باہر جانا پڑا اس نے اپنے وکیل کو ہدایت کی کہ وہ فیصلہ سنتے ہی اسے تار سے مطلع کردے۔ چند دن بعد اسے تار موصول ہوا جس میں لکھا تھا۔ "آخر سچائی نے فتح پالی"

"فوراً اپیل کردو" تاجر نے تار کے ذریعے اپنے وکیل کو اطلاع دی۔

سید اصغر علی شاہ بخاری لانڈھی نمبر ا کراچی

منیجر نے ملاقاتی سے پوچھا۔ "تم بغیر اجازت اندر کیوں چلے آئے۔"

اجازت لینے کے لئے ہی تو اندر آیا ہوں۔" ملاقاتی نے جواب دیا۔

شہزاد فیصل۔ گلشن اقبال کراچی

ایک شخص نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ "اس وقت میں ایک اعلیٰ ترین انسان ہوں۔ میں نہ سگریٹ پیتا ہوں اور نہ شراب کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ میں روز رات کو آٹھ بجے سو جاتا ہوں اور صبح پانچ بجے سے پہلے اٹھ جاتا ہوں۔ میں وقت پر کھانا کھاتا ہوں اور اپنا کام باقاعدگی سے کرتا ہوں۔ لیکن اب میں یہ سب کچھ باقاعدگی سے نہ کرسکوں گا۔ کیونکہ میں کل جیل سے رہا ہو رہا ہوں۔

ملک محمد فیصل..... ملتان

شاعر۔ (فخر سے) "لوگ میرا کلام سنتے ہیں

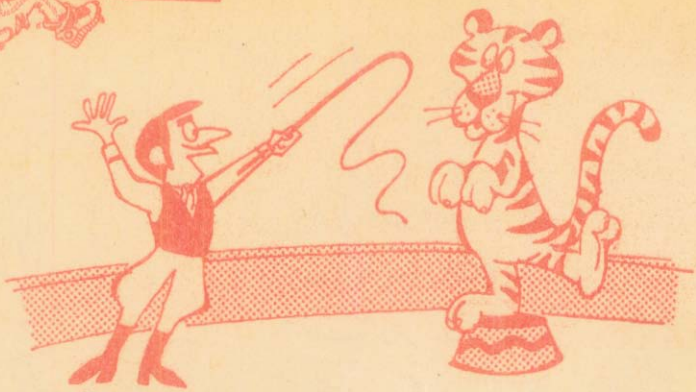

اور سر دھنتے ہیں۔"

"مگر کس کا؟؟؟" ایک منچلے نے پوچھا۔

سمیرا عارف۔ ملتان

ایک ڈاکٹر صاحب دعوت میں شریک تھے کھانا کھانے کے بعد وہ ٹہلنے کے لئے قریبی قبرستان کی طرف چلے گئے۔

"ارے بھئی ڈاکٹر صاحب کہاں گئے؟" ایک صاحب نے پوچھا۔

"اپنے پرانے مریضوں سے ملاقات کرنے" کسی دوسرے نے جواب دیا۔

محمد شاہد اکرام۔ ملتان

ایک آدمی گوشت کے ناغہ والے دن ہوٹل میں آیا اور بیرے سے بولا "ایک پلیٹ بھنا گوشت لاؤ۔"

بیرا:۔ "بھئی، آج تو ناغہ ہے۔"

"آدمی:۔ اچھا تو ایک پلیٹ ناغہ لاؤ۔"

محمد مشتاق قریشی۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

"غضب خدا کا تم اب میرے پاس آئے ہو۔" غصہ ور ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھ سے پہلے بھی تو کسی کو دکھایا ہو گا؟"

مریض "جی نہیں میں کیمسٹ کے پاس چلا گیا تھا"۔

ڈاکٹر "کھلی جہالت ہے۔ کیمسٹ ڈاکٹر تو نہیں ہوتا"۔ وہ علاج کرنا کیا جانے تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ خیر بتاؤ اس نے تمہیں کیا احمقانہ مشورہ دیا؟"

مریض "جی..... اس نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے"۔

مشہود شہزاد۔
نارتھ ناظم آباد کراچی

خوف کا سمندر

محمد امان خان دلؔ

ہر آنکھ رو رہی ہے حالاتِ حاضرہ پر
ہر دل میں موجزن ہے اک خوف کا سمندر

بچے جوان و بوڑھے اس بات سے پریشاں
جانے کدھر سے آئے گولی یا کوئی پتھر

لٹتے ہوئے گلی میں دیکھا سبھی نے ہم کو
لیکن کوئی پڑوسی نکلا نہ گھر سے باہر

اک بم پھٹا تو جتنے افراد زد میں آئے
کچھ مرگئے وہیں پر کچھ ہسپتال جاکر

اغواء قتل و ڈاکا اب عام سی ہیں باتیں
مظلوم و بے بسوں پر یہ ظلم ہے سراسر

ہے منشیات بھی تو اک خوفناک لعنت
اجڑے ہیں اس سے جانے کتنے بسے ہوئے گھر

جینا حرام کرتے ہر موڑ پر کھڑے ہیں کچھ
اجنبی لٹیرے کچھ آشنا ستمگر

عقل و خرد سے عاری پروردہ تیرگی کے
خوش ہو رہے ہیں کیسا اپنے دیئے بجھا کر

ہو خیر علم کی اب پروردگار میرے
طلبہ قلم کے بدلے رکھتے ہیں پاس خنجر

کچھ روز کی پڑھائی لڑکوں نے خود گنوائی
باقی دنوں میں اے دل ہڑتال پر ہیں ٹیچر

ہزار خوف ہیں دل میں

محمد صالح ارشاد

اکثر آپ نے یہ بات سنی ہوگی کہ فلاں شخص خوف سے پیلا پڑ گیا اور ہو سکتا ہے کہ یہ بات آپ کے مشاہدہ میں بھی آئی ہو کہ کوئی اتنا خوفزدہ ہوا ہو کہ بے ہوش ہی ہو گیا ہو۔ خوف دراصل کیا چیز ہے اور آدمی خوف کی حالت میں پیلا کیوں پڑ جاتا ہے آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

خوف دراصل انسانی جسم میں پیدا ہونے والے ان جذبات اور احساسات کو کہا جاتا ہے جو کسی خطرناک شے یا خطرناک حالات کے خلاف اپنے بچاؤ کے لئے پیدا ہوتے ھیں۔ خوف کی وجہ سے ہی انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اپنا بچاؤ اس جگہ سے بھاگ کر یا کسی اور طریقے سے کر سکے۔ انسانی جسم مختلف حالات اور واقعات کے حساب سے اپنا کام انجام دیتا ہے۔

مثلاً آنکھوں کی طرف پھینکی جانے والی مٹی سے بچاؤ کیلئے آنکھ مٹی داخل ہونے سے پہلے بند ہوجاتی ہے۔ انگلیاں اگر گرم چیز کو چھولیں تو فوراً وہاں سے ہٹ جاتی ہیں۔

یہ سب ایک ایسے نظام کے تحت ہوتا ہے جن میں ہمارے ارادے اور سوچ کا بہت زیادہ دخل نہیں ہوتا ہے۔ خوف سے پیلا پڑجانا بھی دراصل اس بات کی نشانی ہے کہ انسانی جسم آنے والے خطرات سے مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہے جب ہم خوفزدہ ہوتے ہیں تو ہمارا دماغ فوراً ہمارے دل کی رفتار کو تیز کردیتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسانی جسم میں خون کی گردش میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جسم میں آکسیجن کا استعمال بھی بڑھ جاتا ہے چہرہ پر موجود زیادہ تر خون جسم کے دوسرے حصوں کو بھیج دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے چہرہ پیلا پڑجاتا ہے۔

خون جسم میں اپنی گردش کے دوران جسم کے مختلف اعضاء میں توانائی پہنچاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے اندر زیادہ طاقت محسوس کرنے لگ جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر انسان اگر وہاں سے بھاگنا چاہے تو بھاگ جاتا ہے اور خطرہ سے لڑنا چاہے تو لڑ جاتا ہے اور یہ سب کچھ ہمارے ارادے اور سوچ کے بغیر ہوتا ہے یہ بات آپ ایک چھوٹی سی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی اندھیری رات میں کوئی بچہ سرپر ڈراؤنا ماسک پہن کر ڈرائے تو آپ وہاں سے سرپر پیر رکھ کر بھاگتے ہیں اور گھر پہنچ کر دم لیتے ہیں۔

زبان، ذہانت اور ظرافت؟

ہم آپ کی زبان، ذہانت اور ظرافت کا امتحان لے رہے ہیں

کوئی دلچسپ لطیفہ، کوئی ہنسانے والی بات، کوئی قہقہاتا واقعہ اس طرح لکھیے کہ پوری تحریر میں کہیں کوئی نقطہ نہ آنے پائے۔

بے نقطہ لطیفے پر ہم داد و تحسین کے علاوہ انعام بھی دیں گے۔ مگر شرط صرف یہی ہے کہ

لطیفہ دلچسپ ہو اظہار موزوں ہو

جملے محدود ہوں (کسی بھی لطیفے کے برابر) اور نقطہ کہیں آنے نہ پائے۔

"مقابلۂ لطیفہ" آنکھ مچولی۔ ۱۱۲۔ ڈی۔ سائیٹ کراچی

ایک خواب جس نے دُنیا کو ہلا دیا

خالد خلیل

اخبار "بوسٹن گلوب" کے خبروں کے وصولی کے کمرے میں نصب شدہ گھنٹے میں رات کے تین بج رہے تھے۔ اخبار کا رپورٹر بارٹن سام اچانک نیند سے ہڑبڑا کر اُٹھا اُس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ تاکہ وہ خواب کے اثر کو زائل کر سکے جو ابھی ابھی اُس نے دیکھا تھا۔

جب اُسے یقین ہو گیا کہ جو کچھ اُس نے دیکھا تھا محض خواب تھا تو اُس نے سکون کا سانس لیا۔ اُسے

ان لوگوں کی آہ وبکا اب بھی سنائی دی رہی تھی۔ جو سمندر کے کھولتے ہوئے پانی میں دھکیلے جارہے تھے۔ اسے وہ تمام مناظر اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ ہوا میں معلق ہو کر یہ سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ پگھلا ہوا لاوا اور چٹانیں پہاڑ اس کے پہلو میں واقع کھیتوں اور گاؤں کے لوگوں کے سروں پر گر رہے تھے۔ آتش فشاں پہاڑ کے ایک زبردست دھماکے نے جزیرہ پیرالیب کو ہوا میں اچھال دیا تھا۔ سام اخبار "بوسٹن گلوب" کے دفتر میں بیٹھا خواب کے متعلق گہرے خیالات میں غرق تھا اس نے سوچا کیوں نہ اس خواب کو بطور ریکارڈ محفوظ کیا جائے چنانچہ اس نے پنسل اٹھا کر خواب کی تفصیلات لکھنا شروع کر دیں۔ بائرن سام نے کاغذ کے اوپر "بہت ضروری" کے الفاظ بھی لکھ دیئے اور اسے اپنی میز پر چھوڑ دیا۔ اگلی صبح یہ کاغذ اخبار کے ایڈیٹر کو ملا۔ اس نے سوچا کہ یہ کوئی ایسی خبر ہے جو تار کے ذریعے سے موصول ہوئی ہے اور بائرن سام نے توجہ کے لئے اس پر "بہت ضروری" کے الفاظ لکھے ہیں۔ ایڈیٹر نے جلد از جلد یہ خبر اخبار کے سامنے والے صفحے پر دو کالمی سرخی کے ساتھ شائع کی اس خبر نے ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ "اخبار بوسٹن گلوب" دھڑا دھڑ فروخت ہو رہا تھا۔ کیونکہ یہ خبر صرف اس کے اخبار نے شائع کی تھی۔ ایڈیٹر نے یہ خبر ایسوسی ایٹڈ پریس کے حوالے کی جس نے اسے ساری دنیا میں پھیلا دیا۔

۲۹ اگست ۱۸۸۳ء کو دنیا کے تمام اخباروں کی اہم ترین خبر یہی تھی۔ لیکن یہ خبر "بوسٹن گلوب" کے لئے بھی دردسر بن گئی۔ کیونکہ کئی اخباروں نے اس خبر کی مزید تفصیلات مانگی تھیں۔ جو ایڈیٹر کے پاس موجود نہیں تھیں۔ جاوا کے جزیرے سے براہ راست رابطہ بھی قائم نہ تھا۔

اسی شام "بوسٹن گلوب" کا ایڈیٹر بائرن سام سے ملا جس نے نہایت شرمساری سے بتایا کہ وہ سنسنی خیز خبر دراصل ایک خواب تھا۔ وائس لائبریری نے بتایا کہ جاوا کے نزدیک پیرالیب نامی کوئی جزیرہ نہیں ہے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کو اپنی جان بچانی مشکل ہو گئی۔ اس نے ایک اعلیٰ سطح کی کانفرس طلب کی جس میں اس تکلیف دہ صورت حال سے نمٹنے اور کوئی قدم اٹھانے کے معاملے پر غور کیا گیا۔ اخبار بوسٹن گلوب نے اس خبر کی تردید کرنے اور معافی مانگنے کا فیصلہ کر لیا۔

ابھی اخبار "بوسٹن گلوب" نے تردید شائع نہیں کی تھی کہ امریکا کے ساحل پر ایک جہاز لنگر انداز ہوا اس نے بتایا کہ جاوا کے نزدیک "آبنائے سنڈا" میں کراماٹوا کا جزیرہ آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے سے سمندر میں غائب ہو گیا ہے۔ اور جزیرے کے تمام باشندے ہلاک ہو گئے ہیں۔ جوں ہی یہ

خبر ملی اخبار "بوسٹن گلوب" نے پچھلی خبر کی تردید کرنے اور معافی نامہ شائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کراماٹوا کے حالات ۲۷ اگست سے یہ خراب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اور یہ جزیرہ ۲۸ اگست کو اس وقت ڈوب گیا جب بائرن سام اپنے دفتر میں لیٹا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس جزیرے کے غائب ہونے کو ایک عظیم حادثہ قرار دیا گیا۔ آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے سے جو دھماکہ ہوا تھا وہ ساری دنیا کے زلزلہ پیما آلات پر ریکارڈ کیا گیا۔

لیکن بائرن سام کو تو خواب میں پیرالیب کا جزیرہ نظر آیا تھا۔ جبکہ ڈوبنے والے جزیرے کا نام کراماٹوا تھا۔ کراماٹوا اور پیرالیب کے ناموں میں کئی سال تک اختلاف رہا حتیٰ کہ ڈچ آسٹری سوسائٹی نے ایک نقشہ دکھایا جس میں کراماٹوا کا پرانا نام پیرالیب ہی درج تھا۔

اب مکھیاں آپ کو تنگ نہیں کریں گی

کیلگر اتھ کی کھوپڑیاں

عبّاس جلبانی

سولھویں صدی عیسوی کا ذکر ہے۔ امیر کبیر مائل فلپسن "انگلش لیک ڈسٹرکٹ" میں بہت بڑی جاگیر کا مالک تھا۔ مگر وہ زمین کی وسعت سے مطمئن نہ ہوتا اور ہمیشہ اپنی جائداد میں اضافہ کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا جھیل کے پاس ہی کراسٹر اور ڈوروتھی کک نامی جوڑے کا فارم تھا جو اس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ اس چھوٹے سے فارم کی زمین وہ اس عالیشان عمارت کے لئے حاصل کر کے رہے گا جس کی تعمیر کے منصوبے وہ مدتوں سے بنا رہا تھا۔

چونکہ کک خاندان کے پاس اپنے اس چھوٹے سے فارم کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا اس لئے وہ فلپسن کے ہاتھوں اسے بچنے پر تیار نہیں ہوئے۔ فلپسن کوئی ایسا ویسا آدمی تو تھا نہیں کہ انکا انکار سن کر خاموشی سے بیٹھ جائے۔ بس اس نے ایک منصوبہ بنایا اور غریب جوڑے کو کرسمس کے موقعے پر اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ وہ دونوں لذیذ کھانے اور قیمتی شرابیں دیکھ کر بہت مرعوب ہوئے۔ اس وقت تو انکی خوشی کی انتہا نہ رہی جب جاگیردار نے انہیں سونے کا وہ پیالہ رکھنے کو کہا جس کی وہ پہلے بہت تعریفیں کر رہے تھے۔

اگلی صبح، سپاہیوں نے اس غریب جوڑے کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور دونوں میاں بیوی کو گرفتار کر کے لے گئے۔ ایک ہفتے کے لئے ان کو علیحدہ علیحدہ رکھا گیا۔ ان کو پتہ تک نہیں تھا کہ گرفتار کیوں کیا گیا ہے؟ اپنے "جرم" کا پتہ انہیں عدالت میں آکر چلا۔ مائل فلپسن کے گھر سے سونے کے پیالے کی چوری۔ !! یہ تھا ان کا جرم۔ اس ناکردہ جرم کی سزا انہیں بھگتنی پڑی۔ مقدمے کا فیصلہ پہلے سے طے شدہ تھا کیونکہ جج کوئی اور نہیں بلکہ فلپسن خود تھا۔ جب اس نے ان دونوں کو موت کی سزا سنائی تو ڈور وتھی چلا اٹھی

"اپنے بارے میں خبردار رہنا۔ تم کبھی خوشحال نہیں رہو گے۔ وہ وقت آئے گا جب تمہارے پاس زمین کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہو گا۔ تم ہم سے کبھی بھی نجات حاصل نہیں کر سکو گے۔"

فلپسن کو ان کی دھمکیوں پر کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ مظلوم جوڑے کو عجلت میں تختہ دار تک لے جا کر، پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

چند ہی دنوں میں فلپسن نے ان کی زمین حاصل کر لی اور اپنے نئے عظیم الشان مکان پر، جس کا نام اس نے کیلگر اتھ ہال رکھا تھا، کام شروع کر دیا۔ جب مکان کی تعمیر ختم ہو گئی تو اس نے وہاں کرسمس کا پر تکلف جشن منانے کا اہتمام کیا۔

دوست احباب اور پڑوسی اس کے ارد گرد جمع ہوئے۔ نئے مکان میں میلے کا سا سماں تھا۔

پھر ایک ڈرا دینے والی چیخ سن کر، وہ تلواریں سونت کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ سیڑھیوں کے درمیان فلپسن کی بیوی کھڑی کانپ رہی تھی۔ اس کی نظریں ایک بھیانک منظر پر جمی ہوئی تھیں۔ سامنے طاقچے پر دو کھوپڑیاں رکھی تھیں دانت پیستی ہوئی کھوپڑیاں۔ فلپسن نے انہیں اٹھا کر باہر پھینک دیا اور قسمیں کھانے لگا کہ جس کسی نے بھی یہ بے مزہ مذاق کیا ہے، اس سے وہ انتقام لے

گا۔

مگر اس کی دھمکیاں اس کے مہمانوں کے دماغوں کو سکون پہنچانے میں ناکام رہیں۔ ان میں سے کئی ایک تو جلد ہی سونے چلے گئے۔ مگر صبح سویرے چیخوں کی آوازوں نے انہیں پھر جگا دیا۔ کھوپڑیاں پھر سے سیڑھیوں پر موجود تھیں۔

اگلے چند دنوں میں، اپنی معلومات کے مطابق فلپسن نے ہر ممکن کوشش کی، ان کھوپڑیوں سے چھٹکارا پانے کی۔ مگر جب بھی انہیں گھر سے باہر پھینک دیا جاتا یا دفن کر دیا جاتا یہ دوبارہ اس کے گھر آموجود ہوتیں۔

کرسمس کا جشن تباہ ہو گیا۔ ہر طرف ان واقعات کے متعلق خبریں پھیل گئیں۔ فلپسن کا کاروبار تباہ ہو گیا اور اس کی دولت ہوا ہو گئی۔ جب ایک قلاش آدمی کی حیثیت سے اس کا انتقال ہوا تو اسکا خوبصورت گھر ساری رات کھوپڑیوں کے خوفناک قہقہوں سے گونجتا رہا۔

ان دونوں عجیب و غریب نشانیوں نے اس کی موت کے بعد بھی، اس کے وارثوں کو پریشان کرنے کے لئے وہاں آنا جانا جاری رکھا۔ یہ کھوپڑیاں ہر کرسمس کے دن اور مظلوم میاں بیوی کی برسی والے دن ضرور ظاہر ہوتیں۔ جب فلپسن کا خاندان اتنا مفلس ہو گیا کہ ان کے لئے کیلگراتھ ہال میں رہنا ناممکن ہو گیا تو مجبوراً یہ مکان انہیں بیچنا پڑا۔ تب ہی ان کھوپڑیوں نے اس عمارت کو چھوڑا۔

بجلی کا ڈسا مانگے نہ پانی

بجلی کے ننگے تار اور پلگ وغیرہ

سانپ سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہیں۔ بجلی کے تاروں اور سوئچ بورڈ وغیرہ کو کھلونا نہ جانیئے۔ ان سب سے دُور رہیئے۔ بجلی کے سامان کو احتیاط سے استعمال کیجئے۔

—— س۔خ۔عالم ——

ڈراؤنی فلمیں ڈراؤنے کردار

رات بہت اندھیری تھی ۔ ایسے میں ایک شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک مکان کے صدر دروازے تک پہنچتا ہے۔ اس شخص نے سیاہ پتلون، سیاہ کوٹ اور سیاہ جرسی زیب تن کر رکھی ہے۔ تاریکی کے باوجود اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے سر کے بال درمیان سے اڑے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ اس نے اپنے بھاری ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ اس کے ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ اس کی بائیں آنکھ کے نیچے سیاہ حلقہ پڑا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اندر ایک شخص بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس شخص نے

جونہی ایک اجنبی کو اپنے سامنے پایا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کیوں کہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ وہ تیزی سے کرسی سے اٹھا اور بھاگنا چاہا مگر اجنبی نے اسے فرار ہونے کا موقعہ نہ دیا۔ اس آدمی کی ایک تیز چیخ بھی اسے نہ بچا سکی۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ اجنبی قاتل کون تھا؟ وہ فرینکسٹائن (FRANKENSTEIN) تھا۔

یہ خوفناک فلموں کا ایک بہت ہی مشہور کردار ہے۔ ایک ایسا کردار جسے اس کے خالق نے مختلف لاشوں کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا ہے۔ ۱۸۱۸ء میں پہلی بار اس کردار پر مبنی ایک کتاب شائع ہوئی۔

کتاب کی خالق میری وولسٹو نکرافٹ (MARY WOLLSTONECROFT) تھیں۔ یہ ایک سوئس طالب علم کا کردار تھا۔ جو فلکیات کا طالب علم تھا۔ اس طالب علم نے فرینکسٹائن کو تخلیق کیا اور کچھ عرصے بعد خود ہی اس کا نشانہ بن گیا۔ فرینک سٹائن پر پہلی فلم امریکہ میں ۱۹۳۱ء میں بنی۔ اس کردار پر بنائی گئی چند فلموں کے نام یہ ہیں۔

"فرینکنسٹائن کی دلہن" (۱۹۳۵ء)..... "فرینکسٹائن کا بھوت" (۱۹۴۱ء)
"فرینکن سٹائن کا انتقام" (۱۹۵۸ء) اور "فرینکنسٹائن فاتح عالم" (۱۹۶۹ء)

اس طرح برام اسٹوکر نے ۱۸۹۷ء میں اپنا مشہور ناول "ڈریکولا" لکھا۔ جس کا مرکزی کردار کاؤنٹ ڈریکولا تھا۔ خوفناک فلموں کا یہ مشہور ترین کردار ہے جس کی فلموں نے اربوں روپے کا بزنس کمایا۔ اور دنیا بھر کے لوگوں نے خوف سے کپکپانے کے باوجود اس کردار پر مبنی فلمیں دیکھیں۔ چنانچہ اسی لئے ڈریکولا کا کردار تمام تر خوف کے باوجود آج بھی دنیا کے ہر حصے میں ہر عمر کے آدمی کی اپنی طرف متوجہ کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ ڈریکولا پر پہلی فلم ۱۹۳۱ء میں بنی۔ فرضی کردار ہونے کے باوجود ایک زمانے میں یورپ اور امریکہ کے اسکول کے ہر بچے کو ڈریکولا کا کردار زبانی یاد تھا۔ ہر بچہ جانتا تھا کہ ڈریکولا سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ رات کو سوتے وقت اپنے گلے میں لہسن کا ہار پہن لیا جائے۔ یا پھر چھوٹی سی صلیب گلے میں لٹکا لی جائے۔ ڈریکولا کا حلیہ کچھ یوں تھا۔ لمبا قد۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس۔ سلیقے سے جمے ہوئے بال۔ بڑی بڑی چمک دار آنکھیں۔ لمبی ناک۔ بھنچے ہوئے ہونٹ۔ اگر ہونٹ کھلے ہوں تو دو تیز اور نوکیلے دانت نظر آتے ہیں جو شکار

کے گلے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔

ڈریکولا بھی رات کے وقت اپنے تابوت یا قبر سے نکلتا ہے۔ اور رات ہی میں اپنے شکار کا خون پی کر صبح کی پہلی روشنی سے قبل واپس اپنے تابوت یا قبر تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ سورج کی کرنیں اسے جلا ڈالیں گی۔ ڈریکولا پر بننے والی تمام فلموں میں یہی دکھایا جاتا ہے کہ اسے مارنے کے لئے ایک میخ اس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر ٹھونکنا لازمی ہے۔ خوفناک فلموں کا آغاز ۱۹۱۳ء سے ہو چکا تھا۔ ان فلموں میں ڈراؤنے اور مافوق الفطرت ماحول کی عکاسی کی گئی تھی۔ چنانچہ پہلی خوفناک فلم کا نام "دی اسٹوڈنیٹ آف پراگ" تھا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ خوف و دہشت پر مبنی فلموں میں ڈراؤنا ماحول ہوتا ہے۔ انہیں دیکھنے والا خوف سے جھرجھری لے کر رہ جاتا ہے۔ گو کہ یہ فلمیں صرف تخیل کا کرشمہ ہوتی ہیں مگر ان میں تجسّس، خوف اور دیگر عناصر مل کر فلم کو کامیاب کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ہم آپ کو سناتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں کراچی میں ایک ڈراؤنی فلم "ایگزارسسٹ" کی نمائش ہوئی۔ ہم نے بھی یہ فلم دیکھی۔ اس فلم میں مرکزی کردار ایک لڑکی نے ادا کیا تھا جس پر آسیب کا سایہ ہو جاتا ہے۔ اس لڑکی نے فلم میں غضب کی اداکاری کی تھی۔ فلم دیکھ کر نکلتے ہوئے اکثر خواتین و حضرات یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ

"ہائے! کتنی خوفناک فلم ہے۔" ..... "ارے اس لڑکی کو کیا بالکل بھی ڈر نہیں لگا؟" ..... "میں تو کبھی بھی ڈراؤنی فلم میں کام نہ کروں۔" ..... "بے چاری لڑکی شوٹنگ کے دوران کتنی ڈری ہوگی؟"

بات صرف اتنی سی ہے کہ ڈراؤنی فلم میں کام کرنے والا اداکار شوٹنگ کرتے ہوئے بالکل نہیں ڈرتا۔ مثال کے طور پر اگر ہیرو کو آدھی رات کے وقت قبرستان میں دکھایا جائے تو دیکھنے والوں کو تو ضرور ڈر لگے گا مگر ہیرو کو اس لئے ڈر نہیں لگے گا کیوں کہ اس کے آس پاس کئی کیمرہ مین۔ لائٹ مین۔ آواز ریکارڈ کرنے والے اور ڈائریکٹر اور ان کے معاونین ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اداکار کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس موضوع پر بننے والی فلم میں کام کر رہا ہے۔

ڈراؤنی فلم کو ڈراؤنا اور کامیاب بنانے میں اداکاری کے بعد جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ آواز کا صحیح وقت پر استعمال ہے۔ آپ کو اکثر ایسی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا جس میں

کوئی خوفناک آواز یا انسانی چیخ کو پوری قوت سے تیز کر دیا جاتا ہے اور سیٹ پر بیٹھا ہوا ہر شخص اچھل پڑتا ہے۔ اسی لئے ڈراؤنی فلم دیکھ کر تنہا آنے والے اکثر افراد اپنے پیچھے ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو اکیلے کمرے میں سوتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فرینکنسٹائن یا ڈریکولا کسی بھی لمحے ان کے کمرے میں داخل ہو کر ان کا سب سے قیمتی اثاثہ یعنی ان کی زندگی چھین لیں گے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے فرینکنسٹائن یا ڈریکولا جیسے کردار صرف انسانی ذہن کی کمزوری اور اس کے تصور کا کرشمہ ہوتا ہے۔ یہ سب توہمات کے زمرے میں آتے ہیں۔ کسی چڑیل، بدروح، سر کٹے یا ڈریکولا کا حقیقی زندگی میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ مرنے کے بعد ہر شخص کی روح عالم برزخ میں چلی جاتی ہے۔ جہاں نیک لوگوں کی ارواح اور برے لوگوں کی ارواح الگ الگ جگہوں پر تا قیامت موجود رہیں گی۔

بات یہ ہے کہ موت سے انسان ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ یہ ایک عارضی کیفیت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کی روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے۔ سورۃ السجدہ کی گیارہویں آیت میں اس بات کو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے۔

"ان سے کہو، موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے۔"

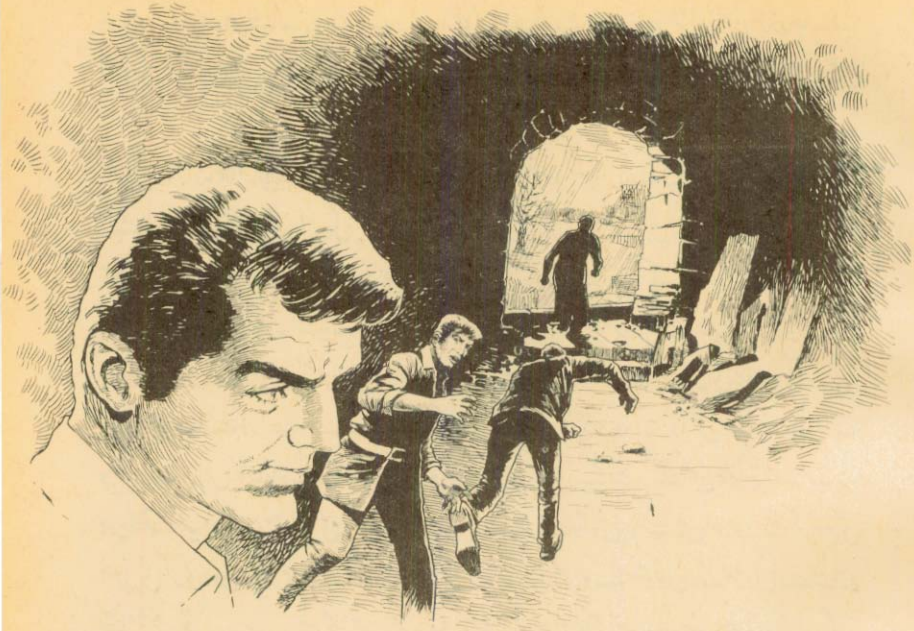

قصّہ چہار مسافر

سلمان غزالی

اُس مرحوم شخص کا قصّہ جس نے تین زندوں کے دلوں کو ہلا دیا

وہ ایک سرد اور تاریک رات تھی۔ شام سے ہی خنکی بڑھنے لگی تھی اور ہوا میں تیزی آگئی تھی۔ خشک پتے اڑ اڑ کر درختوں سے لپٹ رہے تھے۔ ہر چیز اندھیرے کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ ایسے میں ایک گھنے درخت کے نیچے سے ایک سایہ حرکت میں آیا۔ یہ سایہ کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں تھا۔ گھنے درختوں کے جھنڈ سے نکلتے ہی آسمان پر بجلی کڑکی تھی اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی جس میں وہ بھیگنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ میدان میں آیا تو بری طرح بھیگ چکا تھا۔ سرد رات، تاریکی، موسلا دھار بارش، سائیں سائیں کرتی ہوا، بادلوں کی گرج اور جنگل کا شور سب مل

کر ماحول کو ایسے ہیبت ناک بنائے دے رہے تھے کہ انسان اپنے ہی دل کی دھڑکن سن کر ڈر جائے۔ اجنبی کی آنکھوں میں پریشانی کے سائے لہرانے لگے تھے، وہ چاروں طرف کسی ٹھکانے کی تلاش میں

نظریں دوڑا رہا تھا کہ یکایک بجلی زور سے چمکی، اس نے خوفزدہ نظروں سے زمین کی طرف لپکتے ہوئے شعلے کو دیکھا اور پھر اچانک اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ لمحہ بھر کی روشنی میں اسے دور ایک عمارت نظر آئی۔ وہ تیزی سے اس سمت بھاگنے لگا تھوڑی دیر بعد اسے ایک عظیم الشان عمارت کے کھنڈر دکھائی دینے لگے۔ تاریک رات میں یہ کھنڈر کافی پراسرار نظر آرہے تھے۔ پراسرار حویلیوں کے بھوت، جنوں کے ویران مسکن، پراسرار اور ویران جگہوں پر روحوں اور چڑیلوں کی موجودگی..... یہ تمام خیالات اسے ڈرائے دے رہے تھے۔ کھنڈر کے پاس پہنچنے پر وہ اندر داخل ہونے کے بجائے وہیں رک کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ یہ پرانے وقتوں کی کسی حویلی کے کھنڈر تھے جن کا بیشتر حصہ اب تباہ ہوچکا تھا۔ یہ حویلی دو منزلہ تھی جس کی نچلی منزل کے کچھ حصے تو اچھی حالت میں موجود تھے مگر اوپری منزل کی گری ہوئی دیواریں ملبے کے ڈھیر اور ان کے ساتھ ٹکے ہوئے ستونوں کے ٹکڑوں سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ سب ملبے کا ڈھیر ہے یا کوئی اصلی حالت میں بھی موجود ہے۔ حویلی کے ارد گرد کبھی جنگل رہا ہوگا جس کے اب صرف آثار باقی تھے۔ اس کے اندر کچھ ٹنڈ منڈ سے ویران درخت تھے جا بجا جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور زرد اور سیاہ پتے بکھرے پڑے تھے۔ درمیان میں ایک تالاب تھا جس میں اب بارش کا پانی جمع ہو رہا تھا۔ پانی پر سبز کائی کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ تالاب کے کناروں پر اور ارد گرد بھی جگہ جگہ کائی پڑی تھی جو بارش سے پہلے یقیناً ایک دبیز تہہ کی صورت میں تالاب کے فرش پر موجود رہی ہوگی اور اب بارش سے صاف ہوتی جارہی تھی۔ یہ تمام چیزیں ایک الف لیلوی سا ماحول پیدا کر رہی تھیں جن کی مناسبت سے خوفناک بلاؤں، بھوتوں اور روحوں کے ہیولے اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے اور وہ ابھی اندر جانے کی ہمت کر ہی رہا تھا کہ اسے ایک دھکا سا لگا اور وہ لڑکھڑا گیا۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑا تو جنگل کی طرف سے آتے ہوئے تیز ہوا کے جھونکوں نے اسے ایک دفعہ پھر ہلا دیا، وہ کپکپا کر رہ گیا۔ حویلی کے اسرار میں کھو کر وہ اس بھیانک رات اور موسم کو بھول گیا تھا آندھی کے آثار بہت واضح ہوچکے تھے اور اب وہ زیادہ دیر تک کھلے آسمان کے نیچے نہیں گزار سکتا تھا، وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور حویلی میں داخل ہوگیا داخلی

دروازہ ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ دو کمروں سے گزر کر وہ ایک ہال میں آ گیا۔ سنگین پتھروں سے بنی ہوئی چھت اور دیواریں اب سیاہ پڑ چکی تھیں۔ ہال کی مشرقی دیوار میں ایک آتش دان بنا ہوا تھا جس کے اندر اور ارد گرد کافی تعداد میں سوکھی لکھڑی پڑی ہوئیں تھیں اور ساتھ ہی چقماق کے پتھر بھی دھرے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ حویلی پہلے بھی کسی کی پناہ گاہ بنی ہو۔ اس نے اپنا بیگ جس میں کافی قیمتی سامان موجود تھا، کاندھے سے اتار کر ایک کونے میں رکھا۔ لکڑیاں اور چقماق کے پتھر اٹھائے اور ہال کے وسط میں آگ روشن کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا اور اپنے کپڑے خشک کرنے لگا۔ ابھی اسے بیٹھے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا کمرے میں دو آدمی داخل ہوئے۔ وہ دونوں بھی اس رات اور موسم سے پناہ تلاش کرتے ہوئے یہاں آ گئے تھے۔ اپنے سامنے دو انسانوں کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ اس کے کہنے پر دونوں آدمیوں نے اپنا اپنا سامان اس کے سامان کے ساتھ ہی رکھ دیا اور آگ اس کے ساتھ آگ کے گرد بیٹھ گئے۔ ”میرا نام رضی الدین ہے اور میں ایک سیاح ہوں۔ ایک خوبصورت گاؤں میں شام گزارنے کے بعد وہاں سے چلا تھا کہ جنگل میں بھٹک گیا اور پھر اس آندھی سے بچنے کے لئے یہاں پناہ لے لی“ اتنا کہہ کر وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ”میرا نام فرہاد علی ہے۔ میں ایک شکاری ہوں اور شکار ہی کی تلاش میں جنگل میں گھوم رہا تھا کہ یکایک موسم خراب ہو گیا۔ میں کوئی جگہ سر چھپانے کی ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ جنگل کے کنارے مجھے یہ شخص بھی پریشان حالت میں مل گئے اور یوں ہم دونوں بھٹکتے، بھٹکتے یہاں تک پہنچ گئے اور اس افراتفری میں ابھی تک ہمارا ایک دوسرے سے تعارف بھی نہیں ہوا تھا“ دونوں آدمیوں میں سے لمبے قد والا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور پستہ قد والے آدمی نے بولنا شروع کیا ”میں ایک ماہر آثار قدیمہ ہوں۔ میرا نام اورنگزیب ہے اور میں ایک بہت پرانی تباہ شدہ بستی کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ گیا تھا“۔ ابھی تینوں آگے کچھ کہنے کے لئے سوچ ہی رہے تھے کہ ایک کھٹکا سا ہوا۔ تینوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا وہاں ایک غیر معمولی طور پر لمبا چوڑا شخص کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ تمام جذبات سے عاری تھا۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔

”لو بھئی ایک مسافر اور آ گیا لگتا ہے آج خوب محفل جمے گی اس ویرانے میں“۔ فرہاد علی نے

بڑی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا، رضی الدین اور اورنگزیب بھی مسکرادیئے مگر نووارد کا چہرہ ویسا ہی سپاٹ تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اپنا بیگ کاندھے سے اتار کر اس نے اپنے پاس ہی رکھ لیا اور آتش دان سے ہاتھ سینکنے لگا۔ اس کے خاموش رہنے پر پہلے تینوں نے اپنا تعارف کروایا اور پھر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے اپنی بلی جیسی چمکتی آنکھیں آگ کے الاؤ پر سے ہٹائیں ایک طائرانہ نظر ان تینوں پر ڈالی اور بولا "میرا تعارف کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ میری کوئی شناخت ہی نہیں ہے۔ ایک آوارہ سا آدمی ہوں، اصل نام تو یاد نہیں مگر میرے لوگ مجھے "مرحوم" کہہ کر پکارتے ہیں اتنا کہہ کر اس نے ایک دفعہ پھر اپنی نگاہیں آگ پر جمادیں۔ تینوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے، کتنا عجیب نام تھا اور خود بھی کتنا عجیب تھا۔ ان سب کو وہ بہت پراسرار لگا۔ اورنگزیب احمد جن کے بالکل ساتھ وہ اجنبی آکر بیٹھ گیا تھا ان کی ریڑھ کی ہڈی میں نجانے کیوں سنسناہٹ سی ہونے لگی وہ کھسک کر تھوڑا پرے ہوگئے۔ اسی وقت اچانک زوردار چیخ سنائی دی اور فضا میں عجیب سے آوازیں بکھرنے لگیں، ہال کی کھڑکی کے دونوں پٹ بری طرح آپس میں ٹکرائے اور ایک ابابیل چیختی ہوئی کھڑکی سے باہر نکل گئی۔ وہ ایک لمحے کو کانپ سے گئے سردی کا احساس کچھ زیادہ ہوگیا۔

"یہ آوازیں جنگلی جانوروں کی ہیں لگتا ہے آندھی بہت زور پکڑ گئی ہے"۔ فرہاد علی شکاری نے آوازوں کو غور سے سنتے ہوئے کہا۔

"اف توبہ کتنی بھیانک رات ہے"۔ رضی الدین نے ہاتھ آگ کے قریب لے جاکر مسلتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ لوگوں کے لئے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہونی چاہئے" چوتھے مسافر کی آواز کمرے میں گونجی تو تینوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

"میرا مطلب ہے، ایک شکاری، ایک سیلح اور ایک ماہر آثار قدیمہ پھر آپ کی ڈھلتی ہوئی عمریں اور قیمتی سامان وغیرہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ لوگوں نے بہت دنیا دیکھی ہوگی اور آپ کے ساتھ کئی دلچسپ اور خوفناک واقعات بھی پیش آئے ہوں گے۔ خصوصاً چودھویں کی رات کے حوالے سے جو ایسے خوفناک واقعات کے لئے مشہور بھی ہے۔"

"ہاں یہ بات تو تمہاری درست ہے میری زندگی بے شمار دلچسپ واقعات سے بھری پڑی

ہے"۔ اورنگزیب احمد نے اس کی بات سن کر فخر سے کہا۔

"بھئی اگر ایسی بات ہے تو پھر تو میں بھی آپ کو اسی رات کے حوالے سے ایک ایسا خوفناک واقعہ سنا سکتا ہوں جو یقیناً آپ لوگوں کے لئے دلچسپ ہو گا" رضی الدین بولے۔

"یہ ٹھیک رہے گا ہم سب باری باری اپنے ساتھ پیش آیا ہوا کوئی واقعہ سناتے ہیں۔ اس طرح وقت بھی دلچسپی سے کٹ جائے گا اور اس بھیانک رات کا احساس بھی کم ہو گا" فرہاد علی کی تجویز کو سب نے سراہا اور یوں سب سے پہلے رضی الدین نے کہنا شروع کیا۔

"یہ چند سال پہلے کی بات ہے۔ یہاں سے کافی دور ایک قصبہ ہے نور آبادی میں چند دنوں کے لئے وہاں رکا ہوا تھا۔ وہاں کے لگوا کثر ایک بہت ہی پرانے قبرستان کا ذکر کرتے تھے جس کے ساتھ بہت سی پراسرار باتیں منسوب تھیں۔ وہ درختوں کے ایک طویل سلسلے کی دوسری طرف تھا مگر وہاں جانے کی کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ لوگوں سے سن کر مجھے تجسّس ہوا اس کے بارے میں جاننے کا چنانچہ میں نے وہاں جانے کا پروگرام بنالیا۔ میرا ارادہ رات کے وقت صرف باہر سے کھڑے ہو کر اس کا جائزہ لینے کا تھا۔ میں نے اپنا کیمرہ اور دوسرا سامان ساتھ رکھ لیا۔ اس رات چودھویں کے چاند کی روشنی اچھی خاصی تھی میں قبرستان کی طرف چل دیا۔ میں کافی دیر چلتا رہا، درختوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور میدان شروع ہو گیا مگر قبرستان نظر نہ آیا تو میں پریشان ہو گیا اور کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر طرف میدان میں جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، رنگ و روپ سے بے نیاز ٹنڈ منڈ درخت کھڑے جھوم رہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ فضا میں ایک وحشت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ درختوں کی کھوکھلی ٹہنیوں میں سے جب ہوا گزرتی تو ایک عجیب سی سنسناہٹ پیدا ہوتی جو سرسراتی ہوئی جنگلی گھاس اور جھاڑیوں کے ساتھ مل کر بڑا خوفناک تاثر دیتی اور ایسے میں کوئی الو وحشت کے عالم میں چیختا تو دل دہل جاتا۔ مجھ پر خوف طاری ہونے لگا تھا۔ میں آگے بڑھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھ پر ایک نہایت ہی خوفناک انکشاف ہوا جس نے میرے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیئے۔ میں جسے میدان سمجھ رہا تھا وہ دراصل قبرستان تھا۔ بہت وقت گزرنے کی وجہ سے قبریں زمین میں دھنس گئی تھیں، کتبے گر چکے تھے اور ان پر مٹی کی اتنی تہیں جم چکی تھیں کہ وہ مٹی کا حصہ ہی معلوم ہوتے تھے۔ درخت بھی سب ویران ہو چکے تھے اور جنگلی گھاس اور جھاڑیوں نے زیادہ تر زمین کو چھپا رکھا تھا۔ ایسے میں سنگ مرمر کے ایک کتبے پر جس پر مٹی

توجہی ہوئی تھی مگر وہ گرا نہیں تھا بلکہ زمین میں گڑا ہوا تھا نظر پڑتے ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں اس وقت قبرستان کے وسط میں آدھی رات کے وقت اکیلا کھڑا ہوں۔ خوف کے مارے میں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا مگر فوراً ہی مٹی میں چھپے ہوئے ایک کتبے سے ٹھوکر کھا کر زور سے فضا میں اچھلا تو زمین پر آ رہا۔ کچھ دیر میں یونہی بے پڑا رہا۔ پھر میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک اور خوفناک انکشاف مجھ پر ہوا کہ میں اس وقت ایک قبر کے اندر گوشت پوست سے بے نیاز ہڈیوں کے ڈھانچے کے اوپر لیٹا ہوا تھا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ خوف اور سردی کے مارے سارا جسم برف کی طرح سرد ہو گیا اور خون رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی ایک تیز چیخ میرے حلق سے نکل گئی۔ ڈھانچے کے بازو میری کمر کے گرد لپٹے ہوئے تھے ان کا حلقہ تنگ ہونے لگا اور باریک باریک انگلیاں کھال میں اترتی ہوئیں محسوس ہوئیں۔ پورے جسم میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ایک تو اس روح فرسا ویرانی نے مجھ پر دہشت طاری کر دی تھی اوپر سے اس افتادہ نے میری رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔ میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور بے سدھ پڑ رہا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا قبر کے اندر آئی ہوئی چاند کی روشنی کم ہو رہی ہے پتھر کی سل آہستہ آہستہ سرک رہی تھی اور قبر کا دہانہ بند ہو رہا تھا۔ میرے دماغ میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے اٹھیں۔ میں زندہ قبر میں دفن ہو رہا تھا۔ میں نے آخری دفعہ تمام ہمت جمع کی اور پورا زور لگایا کڑ کڑ کی آواز کے ساتھ ڈھانچے کے بازو شانے کی ہڈیوں پر سے علیحدہ ہو گئے۔ میں تیزی سے کھڑا ہوا اور قبر کے منہ پر ہاتھ رکھتا ہوا اپنے پورے جسم کو باہر اچھال دیا۔ میرا جسم پتھر کی سل کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا باہر گر گیا۔ میرے باہر نکلتے ہی سل نے قبر کے منہ کو پوری طرح ڈھانپ لیا۔ یکا یک ہوا میں تیزی آ گئی اور مٹی اور ریت اڑنے لگی میں نے قصبے کی طرف دوڑ لگا دی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ صبح تک مٹی قبر کو پورا چھپا دے گی اور میں دن کی روشنی میں یعنی اسے دوبارہ نہیں ڈھونڈ سکوں گا۔ یہ میری زندگی کا ناقابل فراموش ترین واقعہ تھا جسے اب بھی یاد کر کے میں کانپ جاتا ہوں" رضی الدین نے اپنا واقعہ ختم کیا تو فرہاد علی اور اورنگزیب دم بخود بیٹھے تھے۔ واقعہ ختم ہونے پر اس کے خیال سے انھیں جھرجھری آ گئی۔ مگر چوتھا آدمی جس نے اپنا نام مرحوم بتایا تھا حیرت انگیز طور پر پرسکون تھا۔

اب اورنگزیب احمد نے کہنا شروع کیا۔ "یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں افریقہ میں تھا۔ میں

ایک قدیم عمارت کے کھنڈر کی تلاش میں تھا جس میں میری معلومات کے مطابق بہت بڑا خزانہ دفن تھا مگر اب تک کوئی اسے ڈھونڈ نہیں سکا تھا۔ بہت عرصے تک مارے مارے پھرنے کے بعد ایک دن اچانک ہی ایک قبائلی آدمی کے ذریعہ مجھے وہاں تک کا رستہ معلوم ہو گیا۔ اس نے مجھے رستہ تو بتا دیا مگر ساتھ چلنے پر رضامند نہ ہوا۔ میں اکیلا ہی روانہ ہو گیا۔ وہ عمارت ایک بہت گھنے درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی تھی جس تک پہنچنے کا واحد راستہ ایک پتلی سی پگڈنڈی تھی جو دونوں طرف سے دلدلی زمین میں گھری ہوئی تھی۔ بڑی دقتوں کے بعد میں آخر کار اس عمارت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک چھوٹی سی عمارت تھی جو اب کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی اس کا درمیانہ بڑا گنبد کافی حد تک سلامت تھا۔ اس میں جگ جگہ شگاف تھے مگر وہ ابھی تک عمارت کی شکستہ دیواروں پر ٹکا ہوا تھا۔ ارد گرد ملبہ بکھرا ہوا تھا اور پوری عمارت کو ایک نظر دیکھنے سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی دیو سر جھکائے بیٹھا ہو۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے سورج تو ویسے ہی غروب ہو چکا تھا اور درختوں کے جھنڈ کی وجہ سے چاند بھی اسے منور کرنے میں ناکام تھا۔ میں نے قبائلی آدمی کی دی ہوئی مشعل جلائی اور صدر دروازے سے عمارت کے اندر داخل ہو گیا دروازہ تو وہاں موجود نہ تھا البتہ ایک خلا سا تھا۔ اندر کا ماحول بڑا وحشت ناک تھا جگہ جگہ مکڑی کے قد آدم جالے لگے ہوئے تھے۔ چھت کے ساتھ کئی چمگادڑیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں، فرش پر بے شمار حشرات الارض اور چوہے ادھر ادھر رینگ رہے تھے پھر مشعل کی روشنی میں یہ عام چیزیں اور خوفناک لگ رہی تھیں اوپر سے فضا پر چھایا ہوا مہیب اعصاب شکن سناٹا میرے حواس پر طاری ہو رہا تھا مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ ایک انجانا سا خوف محسوس ہوا میرا دل چاہا کہ واپس لوٹ جاؤں مگر اتنی مشکلوں کے بعد یہاں تک پہنچنے کے بعد یوں میں واپس نہیں جا سکتا تھا میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور کمرے سے نکل کر ملحقہ راہداری میں آ گیا۔ راہداری کے دونوں طرف کمرے تھے۔ میں ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ ایک تیز گونجتی ہوئی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ چیخ کہیں آس پاس سے ہی آئی تھی مگر راہداری بالکل خالی پڑی تھی۔ ابھی چیخ کی بازگشت بھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک اور دلخراش چیخ فضا میں بلند ہوئی اور پھر تواتر سے چیخوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عمارت کے در و دیوار لرزنے لگے ہوں میں خود یوں کانپنے لگا جیسے میرا سارا وجود زلزلے کے جھٹکوں کی زد میں ہو میں ہراساں ہو کر واپس بھاگنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نظر ایک کمرے کے اندر پڑے ہوئے لمبے چوڑے صندوق پر

پڑی۔ "خزانہ" میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور میں ہر چیز کو بھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ صندوق کا زنگ خوردہ قفل ٹوٹ کر پہلے ہی نیچے گر چکا تھا۔ میں نے پوری طاقت صرف کر کے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا جیسے ہی صندوق کھلا ایک دم تمام شور ختم ہو گیا اور فضا پر ایک دفعہ پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔ اندر نظر پڑتے ہی میری نظریں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں صندوق لبالب قدیم اور قیمتی جواہرات اور سونے کی اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا ابھی میں غیر یقینی کے عالم میں یہ خزانہ دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ منظر میری نظروں نے دیکھا جو اب بھی نگاہوں کے آگے آجائے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے سامنے یکایک تمام ہیرے جواہرات اور اشرفیاں اوپر اٹھیں اور فضا میں بکھر گئیں اور ایک دیو ہیکل انسان صندوق میں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اف توبہ..... اتنا خوفناک چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کا رنگ توے کی طرح سیاہ تھا۔ آنکھوں سے سرخ چنگاریاں پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کی زبان سختی سے بھینچے ہوئے جبڑوں کے درمیان پھنسی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دو دھاری تلوار تھی اور اس کے کپڑوں پر ایک مخصوص نشان بنا ہوا تھا جو قدیم افریقی بادشاہوں کے محافظوں کے لباس پر بنا ہوتا تھا۔ وہ بڑی غضب ناک نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر سردی کے باوجود میں پسینے میں نہا گیا۔ پورے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں خون رگوں میں جمنے لگا اور چہرہ روٹی کے گالے کی طرح سفید ہو گیا۔ ایک لمحے کو تو مجھے لگا کہ میرا دل دھڑکنا بھول گیا ہے پھر اچانک جیسے مجھے ہوش آگیا اور میں الٹے پاؤں واپس بھاگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح گرتا پڑتا اپنے کیمپ تک پہنچا مگر اسی وقت میں نے وہاں سے اپنا خیمہ اٹھوا دیا اور پھر شہر پہنچ کر ہی دم لیا۔ چودھویں کی وہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی"

اورنگزیب احمد خاموش ہوا تو رضی الدین اور فرہاد علی یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے ان پر سحر ہو گیا ہو مگر جو تھا مسافر اب بھی ویسے ہی نارمل تھا۔

فرہاد علی نے کہنا شروع کیا "آپ دونوں حضرات نے دل ہلا دینے والے واقعات سنائے ہیں ایسا کوئی واقعہ میری زندگی میں پیش نہیں آیا البتہ ایک ایسا واقعہ میرے ساتھ پیش آیا تھا جس نے کم از کم مجھے بہت خوفزدہ کر دیا تھا اور وہ رات بھی چودھویں کی ہی تھی میں ایک درخت کے مچان پر بیٹھا تھا سامنے ایک درخت کے نیچے میں نے ایک بکری باندھی تھی اور شیر کے شکار کے لئے گھات لگائے بیٹھا تھا۔ میں بدستور بکری کی طرف دیکھ رہا تھا کہ یکدم پلک جھپکتے میں بکری نظروں سے اوجھل ہو گئی میں

نے آنکھیں مل کر دیکھا تو بکری کے بجائے شیر کھڑا تھا میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی میں نے اپنے جسم میں چستی بھی بھری اور خوب آنکھیں مل مل کر دیکھا مگر سامنے شیر ہی کھڑا تھا اور بکری غائب تھی۔ میرے مساموں سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا اور سارا جسم کپکپانے لگا۔ میرے ہاتھوں میں بندوق لرزنے لگی اور یکدم پھسل کر نیچے گر گئی میں بوکھلاہٹ میں نیچے کی طرف جھکا اور خود بھی توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے آرہا۔ شیر اپنی انگارہ سی دہکتی آنکھوں سے گھورتا ہوا میری طرف بڑھا۔ مجھے اپنا دم نکلتا ہوا محسوس ہوا میں باوجود کوشش کے جنبش بھی نہ کر سکا شیر جیسے ہی میرے پاس پہنچا یکایک فضا انجانے قہقہوں سے گونج اٹھی اور شیر دیکھتے دیکھتے دھویں میں تبدیل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی آوازیں تھم رہ گئیں اور بکری مجھے پھر درخت سے بندھی نظر آنے لگی۔ اس کے بعد ساری رات خیر و عافیت سے گزری مگر وہ لمحات میری زندگی کے سب سے خوفناک لمحات تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی بد روح یا جن تھا جو مجھے پریشان کر رہا تھا" فرہاد علی نے بات ختم کی تو تینوں چوتھے مسافر کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر اب بارش تھم چکی تھی اور آندھی کا زور بھی کم ہو گیا تھا چوتھے مسافر نے آگ پر سے نظریں ہٹائیں اور ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولنا شروع کیا "میری زندگی میں ایسے بے شمار خوفناک واقعات آگے ہیں اور میں اس دوران بہت سے لوگوں سے ملا ہوں مگر چونکہ اس وقت آپ تینوں یہاں پر موجود ہیں تو اس لئے آپ کے ہی حوالے سے بات کرتا ہوں۔ دراصل اتفاقاً میں بھی ہمیشہ چودھویں کی رات کو ہی انہی دنیا سے نکلتا ہوں"۔

"اپنی دنیا کیا مطلب" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ حیرت کے مارے نکلا۔

"اگر آپ لوگ خاموشی سے سنیں تو میں سناؤں" اس نے شعلہ بار نگاہوں سے تینوں کو گھورا تو جیسے تینوں کی زبانوں کو تالے گر گئے انھیں اپنے جسم میں سنسناہٹ سی ہوتی محسوس ہوئی اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا "ایسی ہی ایک چودھویں کی رات تھی جب میری ملاقات رضی الدین صاحب س ہوئی تھی جب میں ایک قبر میں ڈھانچے کی شکل میں آرام کر رہا تھا۔ ہاں شیر اور بکری کا بھیس بدلنے میں تو میں مجھے اتنا لطف نہیں آیا تھا مگر مردے کی صورت میں اور نگزیب صاحب سے ملاقات خوب تھی۔ اس کے بعد میں آج ہی انسانوں کی دنیا میں آیا ہوں، یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے رکا مد مقابل بیٹھے ہوئے تینوں اشخاص کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اس کے حلیئے، پر اسرار انداز اور باتوں سے انھیں پورا یقین ہو چکا تھا کہ وہ کوئی انسان نہیں ہے اس احساس سے ان کے چہرے بالکل فق

ہو گئے تھے اور پورا وجود کپکپا رہا تھا مگر اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا " پہلے میں بیوقوفی کرتا تھا کہ ڈرا کر لوگوں کو چھوڑ دیتا تھا اور وہ دوسروں کو قصے سناتے پھرتے تھے مگر اب مجھے حکم ملا ہے کہ کسی انسان کو زندہ مت چھوڑوں " اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وہ تینوں حضرات یوں اٹھے جیسے ایک دم جسم میں بجلی بھر گئی ہو۔ ان کے اور سامان کے درمیان وہ پراسرار اجنبی حائل تھا اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سامان کی طرف بڑھتا۔ اجنبی کے کھڑے ہونے سے پہلے وہ تینوں پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے حویلی سے باہر نکل کر کافی دور جا چکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد اجنبی کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور سامان کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑانے لگا " واہ میاں ٹھگ چھوٹے موٹے ہاتھ دکھاتے ہوئے آج اس ویرانے میں اتنا بڑا ہاتھ مار لیا" اس نے تیزی سے سامان جمع کر کے ایک چادر میں باندھا۔ " اب مجھے جلدی سامان لے کر یہاں سے نکل جانا چاہئے " اس نے سوچا اور تیزی سے دروازے سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

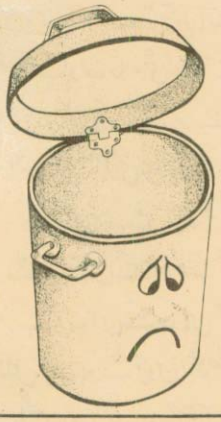

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے۔

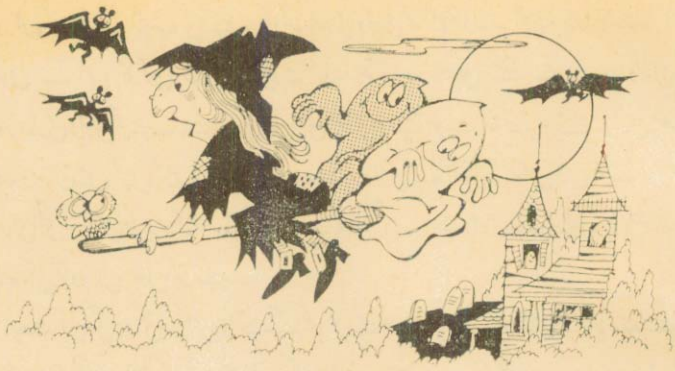

مُحمّد انجم مبین

جنّ کا انتقام

اُس جن کا قصہ جس نے عجیب انداز میں پیر صاحب سے بدلہ لیا

دنیا میں بعض واقعات ایسے بھی رونما ہوتے ہیں جنہیں عقل بمشکل تسلیم کرتی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ سچ پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ میرے ایک دوست نے سنایا تھا لیجئے اس کی زبانی سنئے۔

یہ شاید ۱۹۴۶ء کی بات ہے جب ہمارا خاندان ہندوستان میں رہا کرتا تھا۔ ہمارے ایک پھوپھا بھی ہمارے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ انہیں وظائف وغیرہ کا بہت شوق تھا اور ان کے قبضہ میں جن بھی تھے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے جنوں کو میرے دانت بہت پسند ہیں۔ اور یہ بات تھی بھی حقیقت کہ ان کے دانت واقعی بہت خوبصورت تھے۔ بالکل موتیوں کی طرح سفید اور چمکدار۔!

ایک رات جب ہمارے دروازے پر دستک ہوئی تو ہمارے پھوپھا دروازے پر گئے جب کافی دیر ہو گئی اور وہ واپس نہ آئے تو ہماری دادی انہیں دیکھنے دروازے پر گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ وہ دو اجنبی آدمیوں کے ساتھ دور واقع جنگل کی طرف جا رہے ہیں۔ جنہوں نے بالکل سیاہ لباس پہن رکھا

ہے۔ اور ان کی چال بھی عجیب سی ہے۔ کیونکہ ہماری دادی کو علم تھا کہ یہ جن ہی ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کے بعد وہ واپس آ گئے۔ اور ہماری دادی کو جیب سے لڈو کی طرح کی مٹھائی دیتے ہوئے کہا کہ یہ دیکھئے۔ ایسی مٹھائی پورے ہندوستان میں کہیں نہیں ملے گی۔ جب ہماری دادی نے مٹھائی لی تو اس میں عجیب طرح کی خوشبو آ رہی تھی اور ایسی مزیدار کہ انہوں نے کبھی نہ کھائی تھی۔ جب دادی نے پھوپھا سے پوچھا کہ یہ کہاں سے آئی تو وہ ٹال مٹول کر گئے۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد سے وہ کچھ پریشان سے رہنے لگے۔ دادی نے جب ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو وہ کچھ بتانے پر راضی نہ ہوئے لیکن جب ہماری دادی نے اصرار کیا تو بولے کہ میرے جن چند دنوں سے مجھے خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہیں۔ جب دادی نے کہا کہ ان جنوں ونوں کے چکر کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ تو وہ بولے کہ اب یہ میرے بس کی بات نہیں۔

جمعرات کی ایک رات جب سب لوگ سونے کے لئے لیٹ چکے تھے تو اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ تو پھوپھا کسی کو کچھ کہے بغیر خاموشی سے اٹھے اور دروازے پر گئے۔ کیونکہ رات کو دروازے پر کوئی نہیں جاتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ سب کو معلوم تھا کہ رات کو پھوپھا ہی کے آدمی آتے ہیں۔

تقریباً پندرہ منٹ تک بھی جب پھوپھا نہیں آئے تو ہی ہماری دادی کو فکر ہوئی اور وہ دروازے پر دیکھنے گئیں لیکن وہاں کوئی نہیں تھا لہٰذا انہوں نے کنڈی لگا دی کہ کچھ دیر بعد وہ آ جائیں گے۔ لیکن جب صبح تک بھی پھوپھا نہیں آئے تو سب پریشان ہوئے۔ چنانچہ ہمارے دادا انہیں دیکھنے اسی جنگل کی سمت گئے جس طرف پھوپھا اکثر جایا کرتے تھے۔ ابھی ہمارے دادا کچھ ہی دور گئے ہونگے کہ جھاڑیوں میں سے ہمارے پھوپھا اوندھے منہ پڑے نظر آئے جب انہیں کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ تو یہ دیکھ کر سب دھک سے رہ گئے کہ وہ بے ہوش تھے ان کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا پڑا تھا۔ اور ان کے منہ سے پوری بتیسی غائب تھی!

اس دن سے ہمارے پورے خاندان نے عملیات وغیرہ سے توبہ کر لی کہ نجانے کب کیا ہو جائے۔

بھوت نگر کی سیر کو چلیے

صباحت شکیل

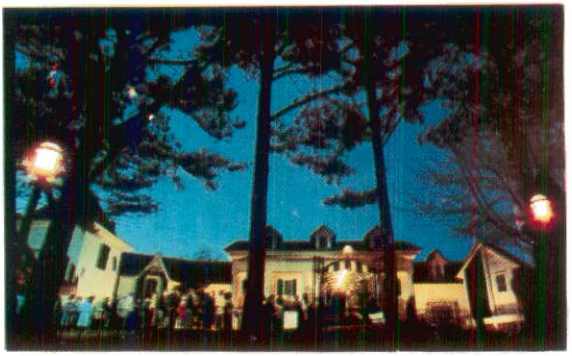

باغ پوری طرح تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ البتہ کہیں کہیں مدھم سی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ باغ کی جھاڑیوں میں چھپے جھینگروں کی آوازیں ماحول کو پراسرار بنا رہی تھیں۔ نو سالہ کرسٹی مور اپنے ابّو کا ہاتھ تھامے احتیاط کے ساتھ چل رہا تھا۔ اچانک اُن کے سامنے لال روشنی پھیل گئی اور پھر ایک خوفناک چہرے والا بھوت ان کے سامنے آکھڑا ہوا اور اپنی خوفناک آواز میں بولا۔

"آپ کا استقبال ہے" کرسٹی کا خوف کے مارے بُرا حال ہوگیا اور وہ اپنے ابّو کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ یہ دیکھ کر کرسٹی کے ابّو زور سے ہنسے پھر بولے

احمد

آلو بخارے کی چٹنی

تازہ، خالص اجزاء۔ ذائقے کی شناخت

دسترخوان پر آلو بخارے کی چٹنی کھانے کا لطف دوبالا کر دیتی ہے۔
آلو بخارا ہاضمے کے لئے خصوصاً اور صحت کے لئے عموماً انتہائی مفید ہے۔
آلو بخارے کی چٹنی احمد کی اشیائے خوردنی میں نیا اور قابلِ قدر اضافہ
قدرت نے ذائقہ دیا ــــ احمد نے محفوظ کیا

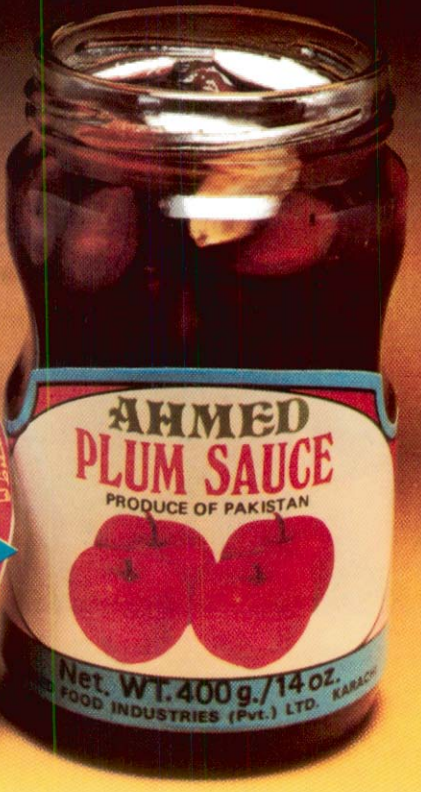

"بیٹا میں نے پہلے ہی کہا تھا بھوت نگر کے بجائے اور چلو مگر تم مانے ہی نہیں۔"

آپ کچھ سمجھے: نہیں۔ ارے بھئی مطلب یہ ہے کہ کرسٹی کا استقبال کرنے والا بھوت اصلی بھوت نہیں تھا۔ بلکہ یہ امریکہ کی ریاست جارجیا میں اٹلانٹا نامی جگہ پر واقع بھوت نگر یا بھوت پارک کا ایک مصنوعی بھوت تھا۔

اس پارک میں سو ۱۰۰ سے زیادہ بھوت اور عجیب الخلقت اجسام موجود ہیں، جو پارک میں آنے والوں کو طرح طرح سے ڈرا کر محظوظ کرتے ہیں ۔ یہ تمام بھوت اور اجسام کمپیوٹر سے چلنے والے روبوٹ ہیں۔ جو طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں، گانے گاتے ہیں، ڈانس کرتے ہیں، حتیٰ کہ اسکیٹنگ بھی کرتے ہیں۔

اگر آپ اس پارک کی سیر کرنا چاہیں تو آپ کو اس پارک کے باہر کھڑی کوئی ایک کشتی کرائے پر لینی ہوگی۔ جب آپ کشتی میں بیٹھ جائیں گے تو پانی کا ایک ریلا آئے گا جو آپ کی کشتی کو بہا کر لے جائے گا اور آپ اس پارک میں موجود مختلف مکانوں اور جگہوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ اس دوران راستے میں آپ کو ادھر ادھر کھڑے ہوئے، فضا میں تیرتے ہوئے، بہت سے بھوت اور خوفناک اجسام ملیں گے۔

Habib Bank Limited
قائم شدہ ۱۹۴۱
ہم ان کے درخشاں مستقبل کے خواہاں ہیں!
حبیب بینک ایک ترقی پسند، متحرک، جدید بینک ملک کے اندر ۱۸۰۰ سے زیادہ اور بیرونِ ملک ۶۹ شاخوں، ۱۸۰۰ سے زیادہ غیر ملکی نمائندوں، کمپیوٹر تنصیبات، نت نئی اسکیموں اور سہولتوں کے ذریعے ملک کے مستقبل کے لئے حتی المقدور کوشاں ہے۔
ہماری بچت کی اسکیمیں اور طالب علموں کا خصوصی شعبہ بچوں اور طالب علموں میں بچت کی عادت ڈالنے کے لئے ہمہ وقت سرگرم عمل ہے۔
حبیب بینک ملک کی ترقی و خوشحالی کے لئے نئی نسل کی سرپرستی کرتا ہے۔
حبیب بینک لمیٹڈ
PID (I)/HBL/80/ 1 U
manhattan international

ایک خاتون جو رُوح سے باتیں کرتی ہیں

عبدالباسط

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ حقیقت ہے

انگلینڈ کی ڈورس اسٹوکس وہ خاتون ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی تیسری آنکھ یعنی چھٹی حس کے ذریعہ ارواح سے براہ راست گفتگو کرتی ہیں اور لوگوں کے مسائل حل کرتی ہیں۔ وہ لندن میں اپنے خاوند "جون" اور بیٹے "ہیری" کے ساتھ رہتی ہیں۔ لوگ اپنے مرحوم رشتہ داروں سے گفتگو کرنے کے لئے اس کے پاس آتے ہیں اور تسکین حاصل کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک خاتون ان کے پاس آئیں ابھی انہوں نے اپنا تعارف بھی نہیں کرایا تھا کہ ڈورس کی تیسری آنکھ پھڑک اٹھی اور وہ خاتون سے کہنے لگیں تم اپنے خاوند ڈوگ سے بات کرنا چاہتی ہو۔

خاتون حیران ہو گئی۔ ڈورس نے کہا کہ "جینی" کون ہے؟ خاتون نے جواب دیا وہ میری بہو ہے۔

ڈورس نے کہا جب تم اپنی بہو کے ساتھ اپنے خاوند کے لئے سوئٹر خریدنے فلاں دکان میں موجود تھیں۔ عین اسی وقت تمہارے خاوند پر دل کا دورہ پڑا۔ اور وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گیا خاتون ڈورس کی بات سن کر حیران ہو گئی۔

ایک مرتبہ ایک خاتون ڈورس کے پاس آئی اور اپنے متوفی بیٹے کے بارے میں کچھ دریافت کرنا چاہتی تھی ڈروس نے کہا ٹھہرو؟ ڈورس کا کہنا ہے اس نے متوفی بیٹے کی روح سے رابطہ قائم کیا اور اس کا نام پوچھا اس کی روح نے جواب دیا۔ میرا نام "اسٹیفن" ہے۔ ڈورس نے خاتون سے دریافت کیا کہ تمہارے بیٹے کا نام اسٹیفن تھا۔ خاتون کے استفسار پر بیٹے کی روح نے کہا کہ اس نے خودکشی کی تھی اور اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔

لندن کا ایک بڑا ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ڈورس کی آمد کا منتظر تھا ہر شخص ڈورس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈورس ہاتھ ہلاتی ہوئی اسٹیج پر نمودار ہوئی۔ تالیوں کی گونج میں اس کا استقبال کیا گیا تھوڑی دیر بعد جب لوگ اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو ایک خاتون نے کھڑے ہو کر ڈورس سے سوال کیا جب بھی میں قبرستان میں اپنے خاوند کی قبر پر حاضری دیتی ہوں تو وہاں ایک سرخ چڑیا بیٹھی نظر آتی ہے ڈورس نے خاتون کے خاوند سے رابطہ کیا۔ روح نے کہا کہ میری بیوی یہ سمجھتی ہے کہ وہ سرخ چڑیا میری روح ہے..... ہال میں بیٹھے ہوئے تمام حاضرین ایک لمحے کے لئے ہنسے پھر ایک دم خاموشی چھا گئی جب روح نے کہا میری بیوی سے کہہ دو کہ وہ سرخ چڑیا میری ہی روح ہے۔

ڈورس اسٹوکس ایک روز کسی ہوٹل میں کھانے میں مصروف تھی کہ مشہور اداکارہ "ڈیانا ڈورز" سیاہ چمک دار لباس پہنے ہوئے ڈورس کے پاس آئی ڈیانا کی خوب صورتی اس کے چہرے اور لباس سے ٹپک رہی تھی ڈیانا کا خاوند ایلن لیک ڈورس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ کیا آپ "ڈورس اسٹوکس" ہیں؟ جن کا آج کل بہت چرچا ہے۔ ڈورس نے کہا جی ہاں میں ڈورس اسٹوکس ہوں ڈیانا اور اس کا خاوند اجازت لے کر اس کے پاس گئے ڈیانا نے ذرا سا کھانا کھایا اور پھر کچھ دیر کے لئے اٹھ کر چلی گئی اس کا خاوند ڈورس سے باتیں کر رہا تھا ادھر ڈورس اپنا کام کر رہی تھی اس نے ڈیانا کے خاوند کو بتایا کہ تمہاری بیوی کینسر کے مرض میں مبتلا ہے تمہیں حوصلہ کرنا چاہئے اور اسے زیادہ سے زیادہ پیار، محبت دینی چاہئے کیونکہ میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ چند دنوں کی مہمان ہے۔ ایلن لیک ایک دم چونک اٹھا اور کہنے لگا خدا کے لئے ایسا مت کہو میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں میں تو اس کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ڈورس نے کہا حقیقت کو نہ میں بدل سکتی ہوں نہ تم۔ تمہیں ذہنی طور پر اس تلخ حقیقت کو برداشت کرنا ہو گا۔ ڈورس کی یہ پیشن گوئی بھی درست ثابت ہوئی۔

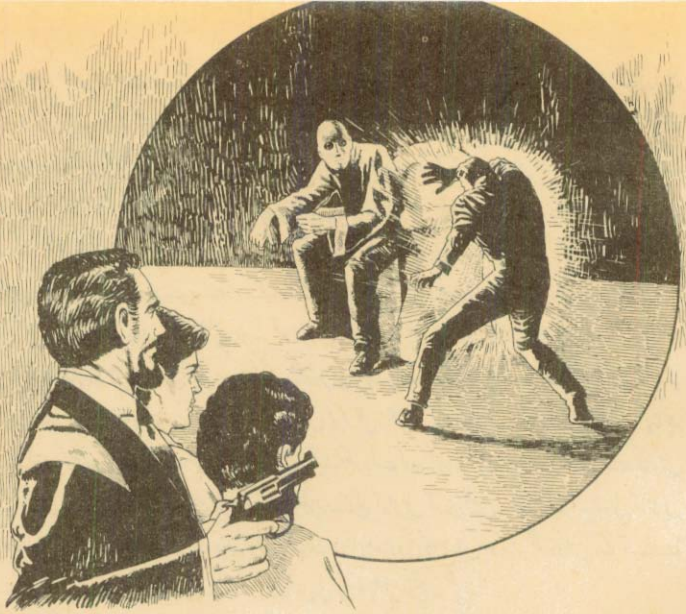

انجانی مُہم

محمد نوید مرزا

صفدر منصور اور ذیشان آپس میں گہرے دوست ہیں۔ لاہور جانے کے لئے وہ کراچی اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوئے دوران سفر ایک پراسرار شخص جس نے نیلا کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ ان سے باتیں کرنے لگا۔ دوران گفتگو منصور کے ہاتھ میں ذیشان نے ایک پرچی تھمائی جس پر کوڈ ورڈ کا ایک جملہ تحریر تھا۔ باتھ روم جاکر منصور نے پرچی دیکھی تو اس پر درج تھا کہ..... ھو بڈنا ٹوآگ ہوام یا..... یعنی یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے۔..... منصور ہاتھ دھو کر باتھ روم سے نکلا تو اسے شدید حیرت ہوئی کیونکہ نیلے کوٹ والا غائب تھا لیکن اس کا کوٹ نشست پر موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنا کوٹ چھوڑ کر سوٹ کیس لے کر روانہ ہو گیا۔ اچانک منصور نے اپنے سامان کو دیکھا تو پتہ چلا کہ نیلے کوٹ والا اپنا سوٹ کیس چھوڑ کر ان کا سوٹ کیس لے گیا ہے۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی۔ ٹرین تھوڑی دیر کے لئے اسٹیشن پر رکی اور پھر چل پڑی۔ جس علاقے سے ٹرین گزر رہی تھی یہ ملٹری کا علاقہ تھا۔ ذیشان نے اپنا شک ظاہر کیا کہ ممکن ہے نیلے کوٹ والا مشتبہ شخص چیکنگ کے خوف سے یہ سوٹ کیس یہاں چھوڑ گیا ہو۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پولیس انسپکٹر سامان کو شک بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں آپہنچا۔ پولیس انسپکٹر سوٹ کیس اور نیلے کوٹ کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ اور تلاشی لینا چاہی، مگر ذیشان نے انسپکٹر کو ایک کارڈ دیتے ہوئے بتایا کہ وہ کرنل رحمان کے پرائیویٹ سیکرٹ سروس کے رکن ہیں۔ اس پر انسپکٹر مطمئن ہو کر چلا گیا رات کو جب اندھیرا چھا گیا تو کھانا

کھانے کے بعد ذیشان منصور اور صفدر سوٹ کیس لے کر باتھ روم میں گئے اور اپنے پاس پہلے سے موجود ماسٹر چابی کے ذریعے اسے کھولنے کی کوشش کی۔ سوٹ کیس میں سونے کی اینٹیں اور ہیرے جگمگا رہے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ لاہور پہنچ کر خالو کی مدد سے اس سوٹ کیس کی بابت پولیس کو بتائیں گے۔ لاہور پہنچنے کے بعد جب وہ اسٹیشن سے باہر آئے تو ایک ٹیکسی ان کے قریب آکر رکی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا کہ میں آپ کو آپ کی منزل پر چھوڑ دوں گا۔ تشریف رکھیں۔ ذیشان، منصور اور صفدر ٹیکسی میں بیٹھ گئے، ٹیکسی چل دی۔ تھوڑی دیر بعد ٹیکسی جب شہر کو چھوڑ کر ویرانے کی طرف جانے لگی تو صفدر چلایا..... یہ کیا حرکت ہے؟ اس پر ڈرائیور نے اپنے چہرے پر سے سر کے ہوئے ہیٹ کو ہٹا کر انہیں دیکھا اور ان پر پستول تان لی..... تینوں سہم گئے۔ یہ تو وہی شخص تھا نیلے کوٹ والا۔ ٹیکسی چلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک غیر آباد علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ انہیں گھنی جھاڑیوں میں ہی ایک عمارت میں لے جایا گیا۔ اندر تاریک شیشوں کی عینک چڑھائے میگھاری نام کا ایک شخص انہیں ملا۔ یہ چیف باس کا نائب تھا۔ وہاں موجود غنڈے اور میگھاری ان تینوں کو کرنل رحمٰن کے حوالے سے اچھی طرح جانتا تھا۔ چنانچہ اس کے حکم سے تینوں کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ مگر رات کو وہ کسی نہ کسی طرح اس عمارت سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب وہ اپنے خالو کے گھر پہنچے تو وہاں سے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اندر سے آنے والی آوازیں میگھاری۔ دھلدیوال اور ان کے خالو کی تھیں۔ دھلدیوال کو اچانک ان کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ مگر وہ اس کے آنے سے پہلے ہی گھر سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے سامنے جو دیکھا اس کی ان کو بالکل توقع نہ تھی۔

جمبو اور گینو ان کو گھر کے اندر لے گئے۔ وہاں ان پر انکشاف ہوا کہ صفدر کے خالو بھی ان بدمعاشوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر صفدر کے خالو حاجی کمال بیگ نے ایک ٹرانس میٹر پر اپنے باس کو کرنل رحمان گروپ کے ارکان کے پکڑ لئے جانے کی اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد میگھاری ان کو لے کر کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ تین اور غنڈے بھی تھے۔ مگر منصور نے چالاکی سے کام لیا اور تینوں لڑکوں نے ان بدمعاشوں پر قابو پالیا۔ پھر منصور نے ان کے ہیڈ کوارٹر کا پتہ معلوم کیا۔ اور ان کو اس طرف لے چلا۔ ابھی ان کے پیدل سفر کا آغاز ہوا ہی تھا کہ انہیں آواز آئی کہ "اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو"۔ اب آپ آگے پڑھئے۔

(قسط نمبر ۵)

انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو پہاڑوں کی اوٹ سے حاجی کمال بیگ چلا آرہا تھا اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی جس کا رخ صفدر، ذیشان اور منصور کی طرف تھا پھر وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔

"بب..... باس..... آپ یہاں کیسے؟" جمبو نے حیرت سے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ لڑکے بڑے خطرناک ہیں۔ باس ان کے بارے میں بڑے فکر مند تھے اسی لئے انھوں نے مجھے تم لوگوں کے پیچھے روانہ کیا تھا اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا اگر میں نہ آتا تو تم لوگ ان کی حراست میں ہوتے۔" حاجی کمال بیگ کہتا چلا گیا۔

"آپ بہت اچھے موقع پر آئے باس ورنہ یہ لڑکے تو ہم سے بگ باس کا نام بھی معلوم کر چکے تھے

اور اب ہمیں پستولوں کی زد پر ہیڈ کوارٹر لے کر جا رہے تھے۔" میگھاری نے کہا۔

ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ انہیں دور سے کوئی اپنی طرف آتا نظر آیا انہوں نے دیکھا وہ دھاریوال تھا اور بری طرح زخمی تھا اس کے ماتھے سے خون رس رہا تھا اور اسے چلنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی دھاریوال جھڑپ کے دوران نشیب میں گر گیا تھا مگر اس کی جان بچ گئی تھی اس وقت اس کی حالت بہت بری تھی اس نے قہر آلود نظروں سے صفدر، ذیشان اور منصور کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو فکر نہ کرو میں تم تینوں سے نمٹ لوں گا پھر کمال بیگ کی طرف دیکھ کر بولا "باس آپ نے تو ہمیں وہاں سے روانہ کیا تھا خود یہاں کیسے پہنچ گئے۔"

کمال بیگ نے اسے وہاں پہنچنے کی تمام تفصیل سے آگاہ کیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ بگ باس بہت ذہین آدمی ہے اگر وہ آپ کو ہمارے پیچھے نہ بھیجتا تو ہم بے موت مارے گئے تھے۔" دھاریوال نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

"انہیں لے کر اڈے پر چلتے ہیں وہیں ان سے نمٹیں گے۔" میگھاری نے غصے سے دانت چباتے ہوئے کہا پھر وہ انہیں پستولوں کے نرغے میں لے کر آگے بڑھنے لگے پہاڑوں کے درمیان ان کا یہ سفر پندرہ منٹ جاری رہا پھر انہیں پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک عمارت نظر آئی مجرم انہیں لے کر عمارت میں داخل ہو گئے مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے وہ ایک کمرے کے قریب جا کر رک گئے اسی وقت اندر سے ایک کرخت آواز آئی۔ "کمال بیگ باقی ساتھیوں کو باہر رہنے دو اور تم ان تینوں کو لے کر اندر آجاؤ۔" آواز میں بلا کا رعب تھا۔

کمال بیگ انہیں پستول کی زد پر لے گیا تینوں دوست خاموش تھے سامنے کرسی پر ایک شخص چہرے پر نقاب اوڑھے بیٹھا تھا کمرے میں روشنی بڑی مدھم سی تھی اچانک منصور نے حملہ کرنے کی نیت سے اس شخص کی طرف دوڑنا شروع کر دیا مگر جونہی وہ کرسی کے قریب پہنچا وہ پیچھے کی طرف بھاگنے لگا پھر وہ رک گیا منصور نے جیسے ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ کرسی کے ارد گرد شیشے کی مضبوط دیوار بنی ہوئی تھی ذیشان اور صفدر کے ساتھ ساتھ کمال بیگ بھی منصور کی طرف دوڑا صفدر نے اسے جھنجھوڑا مگر وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا اسی وقت چھت پر سے پانی برسنا شروع ہو گیا یہ پانی منصور کے چہرے پر پڑا اور اس نے آنکھیں کھول دیں پھر پانی کی دھار کا رخ کمال بیگ کی طرف ہو گیا وہ چلانے لگا۔ "باس..... یہ..... کیا..... پانی روکیں.....

"مگر پانی کا ریلا تقریباً تین منٹ بعد رکا۔ صفدر، منصور اور ذیشان کی نظریں جونہی کمال بیگ سے ٹکرائیں ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کے سامنے کرنل رحمان کھڑے ہیں۔

"اوہ خدا..... تو..... کمال بیگ کے میک اپ میں آپ تھے..... مم..... مگر یہ چکر کیا ہے..... آپ یہاں کیسے پہنچ گئے۔" ذیشان نے کئی سوال ایک ہی سانس میں پوچھ لئے۔

"میں بتاتا ہوں۔" کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کی آواز آئی۔

"دراصل تمہارا کرنل مجھے سے واقف نہیں میں اڑتی چڑیا کے پر بھی گن لیتا ہوں یہ جب کراچی سے چلا تھا تب سے میری نظروں میں ہے پھر اس نے یہاں کی پولیس کی مدد سے کمال بیگ کو گرفتار کر لیا اور خود اس کا میک اپ کر کے یہاں آگیا۔ لیکن ہاکسن ولیم سے بچنا آسان نہیں اب میں تم سب کو اپنے اصل اور بڑے ہیڈ کوارٹر بھیج دوں گا۔ جہاں دوسری بڑی شخصیات کے ساتھ تم لوگوں کی تمام زندگی بھی قید میں کام کرتے ہوئے گزرے گی۔" ہاکسن ولیم کا لہجہ بڑا خوفناک تھا۔

"تم اپنے انجام کو پہنچنے والے ہو ولیم اتنا غرور اچھا نہیں۔" کرنل رحمان نے کہا اس مصیبت میں بھی ان کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ تینوں دوست بھی پر اعتماد طریقے سے خاموش کھڑے تھے۔

"بے وقوفو تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" ہاکسن ولیم نے طنزیہ انداز میں کہا۔ پھر وہ تیز آواز میں بولا، "میگھاری اپنے ساتھیوں کو لے کر اندر آجاؤ۔ میگھاری دھاریوال، گیٹو اور جمبو کمرے میں داخل ہوئے اور کمال بیگ کی جگہ کرنل رحمان کو دیکھ کر بری طرح چونکے اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ کرنل رحمان ہی ہے جس نے کمال بیگ کو گرفتار کر کے خود اس کا روپ اختیار کیا ہوا تھا میں اس کی چالوں سے بخوبی واقف ہوں۔"

"اوہ..... اچھا..... واقعی..... یہ لوگ تو کچھ زیادہ ہی خطرہ ثابت ہو رہے ہیں۔" دھاریوال نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"لل..... لیکن..... کمال صاحب کا کیا بنے گا۔" میگھاری نے پوچھا۔

"تم انہیں فی الحال دوسرے کمرے میں بند کر دو کمال بیگ چند گھنٹوں میں یہاں ہو گا اس کے

آنے پر انہیں اڈے پر پہنچائیں گے۔" ہاکسن ولیم نے کہا۔ انہیں ایک کمرے میں بند کر دیا گیا جہاں زیرو پاور کا بلب روشن تھا منصور نے کرنل رحمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "انکل پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ یہاں کیسے پہنچے؟"

بھئی میری کہانی بڑی مختصر ہے تم تو جانتے ہو میں پہلے ہی ان لوگوں کے پیچھے پڑا ہوا تھا یہاں سے مجھے اپنے ایک جاسوس کے ذریعے اطلاع ملی تھی کہ بگ باس آج کل اس شہر میں ہے اور اس کا سب سے بڑا اڈا بھی یہیں ہے میں اسی سلسلے میں لاہور آیا اور کمال بیگ کے گھر پہنچا وہاں وہ وائرلیس پر بگ باس ہاکسن ولیم سے باتیں کر رہا تھا میں نے اس کی تمام باتیں سن لیں مجھ پر جب اس کے مجرم ہونے کا انکشاف ہوا تو میں نے وہیں اسے حراست میں لے لیا اور اسے یہاں کی جیل میں بھیج دیا اس پر سختی کر کے بگ باس اور اس کے اڈے کے کا پتہ بھی پوچھ لیا اور میں کمال بیگ کا میک اپ کر کے یہاں پہنچ گیا۔

ذیشان نے شروع سے لے کر آخر تک اپنے ساتھ گزرے ہوئے واقعات انہیں تفصیل سے بتا دیئے۔

اچانک کسی خیال کے تحت کرنل رحمان نے اپنی جیب سے نوٹ بک اور پینسل نکالی اور اس پر لکھا، "میرا خیال ہے کہ ہماری باتیں سنی جا رہی ہیں لہٰذا لکھ کر باتیں کرو۔"

"جی اچھا"..... منصور نے لکھا۔

اب یہ ہمیں اپنے بڑے اڈے لے جائیں گے۔ اس دوران تم ان سے لڑنے کی کوشش نہ کیونکہ ہمیں ان کے اڈے پر پہنچنا ہے تاکہ ان کی تمام سرگرمیوں سے آگاہ ہو سکیں۔ کرنل رحمان نے لکھا اور پینسل اور نوٹ بک جیب میں رکھ لی اور چاروں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے تقریباً تین گھنٹے بعد انہیں قدموں کی چاپ سنائی دی کچھ لوگ کمرے میں داخل ہوئے تھے انہوں نے دیکھا وہ کمال بیگ، میگھاری اور دھاریوال تھے کرنل رحمان کی طرف دیکھ کر کمال بیگ طنزیہ انداز میں بولا، "دیکھا کرنل میرے باس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں چند ہی گھنٹوں میں جیل سے نکل آیا ہوں۔"

"تمہارا اور تمہارے باس کا انجام بہت برا ہو گا کمال....." کرنل رحمان کا لہجہ بڑا سخت تھا۔

ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر بڑے ہیڈ کوارٹر لے جانے کی تیاری کرو۔ کمال بیگ نے زہر میں

ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

دھاریوال نے باری باری ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھنا شروع کر دیں جو وہ ساتھ ہی لایا تھا پھر انہیں پستولوں کے سائے میں کمرے سے باہر لایا گیا چند منٹ ان کا سفر جاری رہا پھر انہیں ایک بند گاڑی میں بٹھایا گیا اور گاڑی چل پڑی ان کا سفر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے جاری رہا پھر گاڑی ایک جھٹکے سے رکی زمین پر چلتے ہوئے انھوں نے محسوس کیا کہ یہ علاقہ بنجر اور ویران ہے ایک جگہ پہنچ کر انہیں سیڑھیوں سے اتارا گیا۔ کرنل اور ان ساتھیوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک لفٹ میں کھڑے ہیں جو تیزی سے نیچے کی طرف جا رہی ہے تقریباً آدھ گھنٹے بعد لفٹ رکی وہ زمین میں سینکڑوں فٹ کی گہرائی میں پہنچ چکے تھے انہیں لفٹ سے باہر نکالا گیا اور ان کی آنکھوں سے پٹیاں اتار دی گئیں انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو لفٹ کا نام و نشان تک نہ تھا وہاں صرف ایک دیوار تھی وہ حیرت کے عالم میں چاروں طرف دیکھنے لگے اس وقت وہ زمین دوز علاقے میں کھڑے تھے جہاں دور دور تک بستیاں آباد تھیں وہ حیران تھے کہ زمین کے نیچے شہر کا شہر کیسے آباد کر لیا گیا انھوں نے مردوں اور عورتوں کو وہاں سے گزرتے اور چلتے پھرتے دیکھا ابھی وہ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ میگھاری بولا "سامنے اسکرین پر اپنا نام اور کمرے کا نمبر پڑھو دنیا کی تمام بڑی شخصیات کے نام اور کمرہ نمبر وہیں روشن ہیں۔" یہ کہہ کر وہ سب آگے بڑھ گئے جس پر مختلف ناموں کے علاوہ ان کے نام اور کمروں کے نمبر بھی روشن تھے

"آئیں میں آپ کو آپ کے کمروں میں پہنچا دوں۔" انہوں نے دھاریوال کی آواز سنی۔

مگر وہ ان سب باتوں سے بے خبر اسکرین پر روشن نام پڑھتے جا رہے تھے اور ان کی آنکھیں حیرت سے کھلتی جا رہی تھیں یہ نام دنیا کی ان مشہور و معروف شخصیات کے تھے جو اپنے اپنے گھروں سے اچانک غائب ہو گئی تھیں اور تلاش کے باوجود ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا ان لوگوں میں ان کے اپنے ملک کی بھی نامور شخصیات شامل تھیں ایک نام پڑھ کر وہ چیخ اٹھے، نہیں..... نہیں..... یہ..... قید ہے..... (آگے کیا ہوا آئندہ قسط میں لکھ بھیجئے)

(محمد نوید مرزا، گلی نمبر تیراب احاطہ سوامی نگر، لاہور نمبر)

انجانی مہم کی پانچویں قسط ارسال کرنے والے دیگر ساتھیوں کے نام۔

علی رضا عابدی لطیف آباد۔ حیدر آباد راجہ عرفان رزاق کھاریاں۔ ضلع گجرات

خاور سلیم ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

جنوّں کی دعوت

مرسلہ : اسد علی رضوی

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ ہمارا گاؤں انتہائی پسماندہ تھا۔ ہمارے گاؤں میں کوئی اسکول نہ تھا اس لئے ہمیں اپنے گاؤں سے پانچ میل دور ایک اور گاؤں کے ہائی اسکول میں پڑھنے کے لئے جانا پڑتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں چونکہ تعلیم کا رواج عام نہیں تھا اس لئے ہمارے گاؤں کے پانچ چھ لڑکے ہی اسکول میں پڑھنے کے لئے جاتے تھے۔ ہم جس گاؤں میں پڑھنے کے لئے جاتے تھے اس کی حالت ہمارے گاؤں سے کچھ بہتر تھی۔ اس گاؤں تک پکی سڑک آتی تھی جبکہ ہمارے گاؤں کا راستہ کچا تھا۔ اور یہ رستہ اتنا خراب تھا کہ کسی گاڑی کا آنا ناممکن تھا اس لئے ہمیں یہ پانچ میل کا سفر پیدل ہی طے کرنا پڑتا تھا۔ ہم صبح چھ بجے اسکول جانے کے لئے روانہ ہوتے اور آٹھ بجے تک اسکول پہنچتے تھے جبکہ سردیوں میں اسکول سے آتے آتے مغرب کا وقت ہو جاتا تھا۔

ہمارے گاؤں سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ایک قلعہ تھا یہ اتنا بڑا تھا کہ ہمارے گاؤں سے طویل فاصلے پر ہونے کے باوجود صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کی تاریخ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کچھ بزرگ کہتے تھے کہ یہ قلعہ مغل حکومت نے حملہ آوروں کی چڑھائی سے بچنے کے لئے بنوایا تھا مگر جب ہندوستان پر

انگریزوں کی حکومت آئی تو یہ قلعہ انگریزوں کے فوجی دفاع کے کام آنے لگا۔ مگر انگریزوں کے جانے کے بعد یہ قلعہ ویران ہو گیا اور اب تقریباً پچاس سال سے ویران پڑا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کچھ لوگوں نے اس کے ویران رہنے کی وجہ سے اس کے متعلق کچھ کہانیاں گڑھ رکھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اس قلعے میں جنوں کا بسیرا ہے اور اس قلعے میں ایک شیش ناگ رہتا ہے جو دراصل جنوں کا بادشاہ ہے۔ وہ ایک خزانے کی حفاظت کر رہا ہے اور یہ کہ اس سانپ کی دم ایک چکی سے بندھی ہوئی ہے اور جب یہ سانپ گول دائرے میں چکر لگاتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ چکی بھی گھومتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سونا بھی بنتا جاتا ہے۔ کچھ لوگ تو کہتے تھے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس سانپ کو سونا بناتے دیکھا ہے۔ بہر حال اس قلعے میں سونا نہیں تو کوئی دھات ضرور موجود تھی۔ کیونکہ مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا تھا تو اس وقت کچھ انگریز اس قلعے کا معائنہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ وہ اس قلعے کے اندر تو نہ جا سکے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اس قلعے کے سالہا سال سے بند رہنے کی وجہ سے اس کے اندر کی ہوا کثیف ہو چکی ہے اس لئے اس قلعے کے اندر جانے سے ان کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن ان لوگوں نے باہر سے کچھ آلات لگا کر بتایا تھا کہ اس قلعے کے اندر بھاری مقدار میں دھات موجود ہے۔

ہمارا بہت دل چاہتا تھا کہ ہم اس قلعے کو اندر سے دیکھیں مگر ہمارے والدین نے ہمیں اس قلعے کے اندر جانے سے سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ہمارے گھر میں سے کوئی بڑا ہمیں قلعے تک چھوڑنے اور واپسی پر ہمیں قلعے سے واپس لینے کے لئے آتا تھا مگر جب ہم بڑے ہو گئے تو ہم اکیلے ہی اسکول آنے اور جانے لگے۔ ہم اس قلعے کو روز آتے جاتے دیکھا کرتے تھے۔ اور چونکہ ہم اسے کئی سال سے دیکھ رہے تھے اس لئے یہ ہمیں ایک عام سی چیز لگتی تھی۔ مگر ایک شام جب ہم اسکول سے واپس آ رہے تھے تو ہمیں اس قلعے کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ یہ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی شام تھی اور دن چھوٹے ہونے کی وجہ سے جلد ہی دھندلکا پھیل چکا تھا۔ ہمیں حیرت اس قلعے کو دیکھ کر نہیں ہوئی تھی بلکہ اس قلعے کے اندر لگی رنگ برنگی روشنیوں کو دیکھ کر ہوئی تھی جو ہمیں بہت دور سے نظر آ رہی تھیں۔ جیسے جیسے ہم اس قلعے کے نزدیک آتے گئے ہمیں مختلف قسم کے کھانوں کی خوشبوئیں بھی آنے لگیں جن کو سونگھ کر ہماری بھوک چمک اٹھی۔ جب ہم اس قلعے کے اور قریب آئے تو ہمیں ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت سے لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ ہم قلعے کے

پاس کھڑے ہو کر یہ سب کچھ حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس وقت قلعے کے باہر اور صحن میں اتنے لوگ موجود تھے جتنی ہمارے گاؤں کی آبادی بھی نہ تھی۔ یہ سب لوگ اجنبی تھے ان میں سے ایک فرد بھی ہمارے گاؤں کا نہ تھا وہاں پر موجود ہر آدمی نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور وہاں پر طرح طرح کے کھانوں کی دیگیں پک رہی تھیں۔ ابھی ہم یہ سب ماجرا حیرت سے کھڑے ہوئے دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک آدمی تیزی سے ہماری طرف آیا اور بڑے شفیق لہجے میں بولا۔ ''آؤ بچو تم بھی کھانا کھالو''۔ ہم اس کی یہ بات سن کر اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ وہ تھوڑی دیر تک ہماری طرف دیکھتا رہا پھر ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہمیں قلعے کے اندر لے گیا اور صحن میں موجود کرسیوں پر بٹھا دیا۔ جلد ہی ہمارے آگے انواع واقسام کے لذیز کھانے لگادیئے۔ جب ہماری جھجھک تھوڑی کم ہوئی تو ہمارے ایک ساتھی نے اس آدمی سے پوچھا کہ یہ تقریب کس سلسلے میں ہو رہی ہے تو وہ بغیر کوئی جواب دیئے چلا گیا۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو وہی آدمی آیا اور ہمارے سامنے سے خالی پلیٹیں اٹھا کر لے گیا۔ یہ کھانا اتنا لذیز تھا کہ اس کے بعد آج تک ہم نے ایسا کھانا نہیں کھایا۔ جب ہم کھانا کھا کر باہر نکلے تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گھر کا خیال آیا اور ہم تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ہمیں کچھ لوگ آتے دکھائی دیئے ان کے ہاتھوں میں لال ٹینیں تھیں۔ جب یہ قریب آئے تو ہم نے دیکھا کہ یہ ہمارے والدین تھے ان کے ساتھ ہمارے گاؤں کے کچھ لوگ بھی تھے۔ ہمیں اتنی دیر ہو گئی تھی کہ یہ لوگ پریشان ہو کر ہمیں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اب ہمیں خیال آیا کہ ہمیں واپس آنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ جب ہم قریب پہنچے تو ہمارے والدین نے سب سے پہلا سوال یہی پوچھا کہ ''اتنی دیر کہاں لگادی''۔ ہم نے بھی جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا اور ساری بات سچ سچ بتادی۔ پہلے تو وہ اس بات کو جھوٹ سمجھتے رہے مگر ہمارے زیادہ اصرار پر وہ ہمارے ساتھ قلعے تک چلنے کو تیار ہو گئے۔ جب ہم قلعے کے پاس پہنچے تو ہم یہ دیکھ کر حیرت سے بت بن گئے کہ وہ قلعہ ویسے ہی سنسان پڑا تھا جیسے کئی سالوں سے پڑا ہوا تھا۔ نہ وہاں وہ سینکڑوں لوگ تھے نہ وہ برقی قمقمے اور نہ ہی وہ دیگیں جن کا لذیز کھانا ہم نے کھایا تھا۔ ابھی ہمیں وہاں سے گئے اتنی دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ اس وقفے میں یہ تقریب ختم بھی ہو جائے اور اتنے سارے لوگ وہاں سے چلے بھی جائیں دوسری عجیب بات یہ تھی کہ وہاں پر اس تقریب ہونے کے کوئی آثار بھی موجود نہ تھے۔

ہمارے والدین نے ہمیں جواب طلب نگاہوں سے دیکھا مگر ہمارے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

بھوکا دوست

جس رات وہ مرا اُسی رات وہ اپنے دوست کے پاس موجود تھا

محمد خالد جتوئی

گیارہ بج چکے تھے۔ لیکن نوجوان میریٹ اپنے کمرے میں بیٹھا پوری سرگرمی سے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ اسے ایڈنبرا یونیورسٹی کے بی۔ اے کے امتحان میں شریک ہونا تھا۔

میریٹ تنہائی پسند گوشہ گیر نوجوان تھا۔ بہت کم طالب علم اس کے دوست تھے۔ اور ان سب کو اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ وہ مطالعہ کے دوران میں کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جب دفعتاً باہر کے دروازے کی گھنٹی بڑے زور سے بجنے کی آواز سنائی دی۔ تو میریٹ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ خدا معلوم کون اس سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ لیکن خواہ کوئی ہو میریٹ کو پڑھائی چھوڑ کر کسی سے ملنے نہیں جانا تھا۔

گھنٹی کی پرشور آواز سن کر وہ طوعاً و کرہاً اپنی جگہ سے اٹھا مگر اتنے میں اس نے اپنے جی میں اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کسی طرح حیلے بہانے کر کے اس آدمی کو باہر سے ٹال دوں گا جس وقت وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر سیڑھیوں کے پاس گیا۔ تو گھنٹی بجنے کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس نے سخت ذہنی اضطراب کی حالت میں دروازہ جلدی سے کھول دیا۔ اور اس

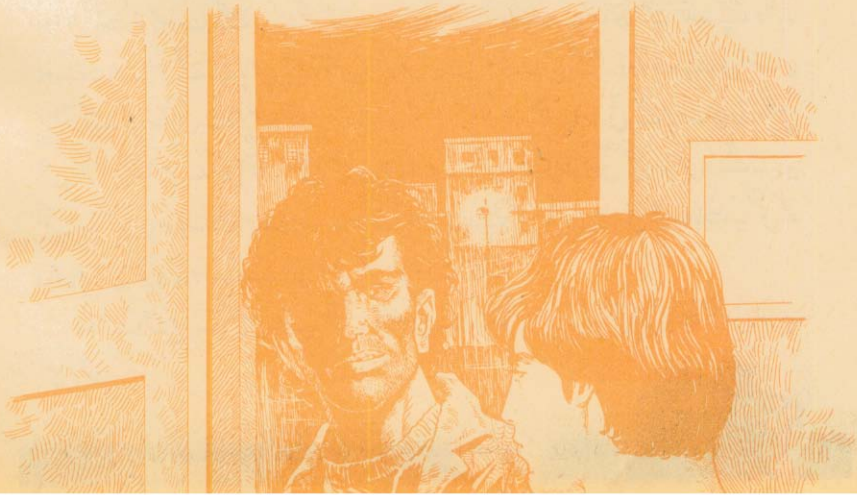

کے باہر کھڑے آدمی کی طرف دیکھنے لگا

وہ کوئی اجنبی نوجوان تھا۔ جس کے چہرے کی رنگت سفید تھی۔ البتہ سیاہ حلقوں میں گھری ہوئی اس کی آنکھوں سے غم و غصہ جھانک رہا تھا۔ گال اندر کو پچکے ہوئے داڑھی بڑھی ہوئی اور اس کی حالت نہایت بیزار کن تھی۔ اس کو دیکھ کر کچھ دیر کے لئے میریٹ ڈر گیا لیکن اس نے اپنی حالت پر قابو پایا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نہ تو اس نے ہیٹ پہن رکھا تھا نہ ہی اوور کوٹ۔ نہ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ حالانکہ دن بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ اور اب بھی جس وقت وہ دروازہ کے باہر کھڑا تھا۔ مینہ کی بوندیں بڑے زور سے گر رہی تھیں۔

میریٹ اس اجنبی سے یہ پوچھنے والا ہی تھا کہ تم کون سی بلا ہو اور مجھ سے تمہیں کیا کام ہے لیکن اس وقت جب وہ پوچھ رہا تھا عین اسی وقت گیس لیمپ کی روشنی ملاقاتی کے چہرے پر پڑنی شروع ہوئی۔ میریٹ نے جھٹ اسے پہچان لیا۔

"فیلڈ! میرا دوست بھلا کس کو خیال آسکتا ہے کہ آدھی رات کے وقت اچانک تم سے ملنا ہو گا۔" میریٹ امتحان میں فیل ہونا گوارا کر سکتا تھا لیکن اپنے دوست کی حالت زار جس سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی۔ کہ وہ کئی دن سے بھوکا ہے۔ اس کے لئے ناقابل برداشت تھی

فیلڈ جواب میں کچھ نہ بولا۔ وہ اس کو سہارا دے کر اپنے ساتھ کمرہ میں لے جا کر اس کو صوفہ پر بیٹھا کر کہنے لگا۔

"ایک منٹ کے لئے اجازت دو تو میں سب سے پہلے کھانے کا انتظام کر دوں۔"

میریٹ نے باتوں میں وقت ضائع کیئے بغیر الماری کھولی اور اس میں سے ڈبل روٹی کا ایک بڑا سا ٹکڑا ایک آدھ ابلا انڈا تازہ بنے ہوئے کوفتے اس کے سامنے رکھ دیئے۔ فیلڈ نے کچھ کہے بغیر کھانا شروع کر دیا۔

پہلی مرتبہ میریٹ کی نظر اپنے دوست کی شرٹ پر پڑی جس کے کندھے کے قریب مکڑی کا جالا لگا ہوا تھا۔ یہ مٹی اور جالا کیا ظاہر کرتا ہے؟ کیا وہ عمارت کے کسی حصے میں چھپا بیٹھا تھا..... ؟ فیلڈ کھانا کھاتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اونگھ رہا تھا۔ گویا اس پر نیند کا غلبہ ہے۔ جب وہ تمام چیزیں کھا چکا تو میریٹ نے اسے سونے کے لئے کمرے کا راستہ بتایا فیلڈ کچھ کہنے بغیر اس طرف چل دیا اور بستر پر سو گیا۔ اور میریٹ دوبارہ دوسرے کمرے میں آکر مطالعہ کرنے لگا۔ دو گھنٹے کے مطالعہ کے بعد ۰۰

اپنے دوست کے پاس آیا۔ لیکن اس کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس کا دوست وہاں پر موجود نہ تھا جبکہ وہ خود اس کو کمرے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے تو اپنی آنکھوں کو ملتا رہا مگر جو تھا وہ تو تھا۔ اتنے میں نئے دن کی مدہم مدہم روشنی کمرے میں داخل ہوئی اور پہلے کی نسبت چیزیں واضح اور صاف نظر آنے لگیں۔ لیکن فیلڈ وہاں موجود نہیں تھا یہ دیکھ کر اس کو بڑی حیرت ہوئی اس نے جلدی سے دوسرے کمرے میں جا کر الماری میں دیکھا تو وہ اور زیادہ حیرت میں پڑ گیا۔ کیونکہ وہاں وہ سب چیزیں موجود تھیں جو فیلڈ نے کھائی تھیں۔ اتنے میں اس کا دوست گرین آ گیا جو روزانہ اس کے ساتھ کالج جاتا تھا اس کو دیکھ کر میریٹ کی جان میں جان آئی۔ میریٹ نے گرین کو سارے واقعہ سے آگاہ کیا۔ میریٹ اور گرین دوبارہ اس کمرے میں گئے جہاں فیلڈ سو رہا تھا۔ وہاں پر فیلڈ کی سانسوں کی آوزیں آ رہی تھی۔ اس آواز کو سن کر دونوں کو حیرت ہوئی کیونکہ وہاں پر تو کوئی بھی نہ تھا۔ گرین اور میریٹ نے اس کو اپنا وہم سمجھا اس وہم کو دور کرنے کے لئے باری باری بستر پر لیٹے ان دونوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے پاس کوئی لیٹا ہوا ہے۔ میریٹ اور گرین ڈر گئے۔ میریٹ گرین کے گھر چلا گیا۔ وہاں سے انہوں نے اپنے وہم کو دور کرنے کے لئے فیلڈ کی بہن کو خط لکھا۔ خط کا جواب پانچ دن کے بعد آیا۔ گرین نے خط کھول کر پڑھا اس خط کا کچھ حصہ حسب ذیل تھا۔

"تم نے فیلڈ کے بارے میں دریافت کیا ہے وہ بد نصیب مر گیا۔ واقعہ بڑا بھیانک ہے۔ ہمارے والد نے جہاں تک ہو سکا اس کی ضرورتیں پوری کیں۔ لیکن جب اس کی ضرورتیں حد سے بڑھ گئیں تو ایک دن ہمارے ابو نے غصے میں آ کر ایک پیسہ دیئے بغیر اس کو گھر سے نکال دیا۔ فیلڈ گھر سے نکلنے کے بعد کہیں اور جانے کے بجائے قریب ہی تہ خانے میں جا کر چھپ گیا۔ اور وہیں بھوکا پیاسا پڑا رہا۔ بعد کے حالات سے معلوم ہوا کہ اس کی موت خوراک نہ ملنے کی وجہ سے واقع ہوئی گھر والوں نے جہاں تک ممکن تھا۔ بات کو چھپانے کی کوششیں کی لیکن اس بات کا ذکر بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ لاش چودہ تاریخ کو پڑی ملی تھی اور ڈاکٹر کا بیان ہے کہ اس کی موت بارہ گھنٹے پہلے واقع ہوئی ہے۔"

"تب اس کا مطلب ہوا کہ وہ ۱۳ تاریخ کو مرا تھا۔" گرین نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں ۱۳ تاریخ کو" میریٹ نے جواب دیا۔ "اور یہ اسی تاریخ کی رات تھی جب وہ میرے مکان پر آیا تھا۔"

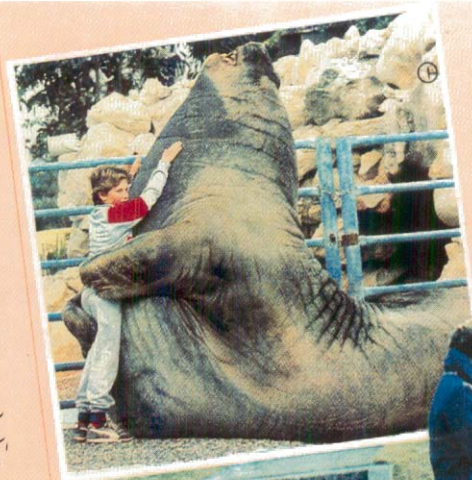

① پا پنچ ہزار پونڈ کی ناقابلِ یقین وزن والی سیل اور ۵۵ پونڈ کا بچّہ، یہ ملاقات اس وقت ہزاروں لوگوں کی خصوصی توجّہ کا مرکز بن گئی جب فرانس کے میرین لینڈ انٹائیبز میں یہ دونوں بڑی محبّت سے گلے ملے ...

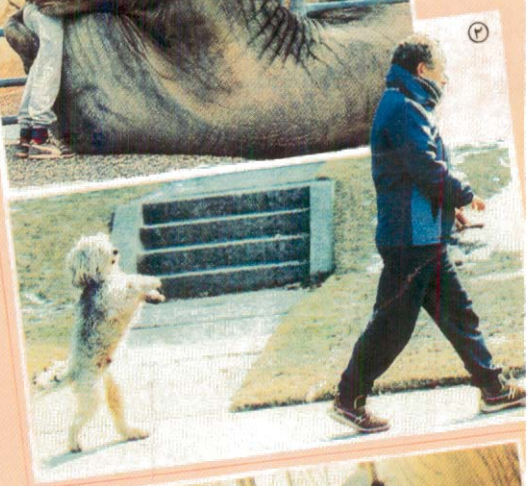

② ٹورنٹو (کینیڈا) کے اسٹینلی روپک جب چہل قدمی کے لئے نکلتے ہیں تو اُن کا تین سالہ کتّا "بڈی" بھی اُن کی نقل کرتے ہوئے اسی طرح چلتا ہے۔ اس کُتّے کو اسی طرح سدھایا گیا ہے۔

③ ڈھائی سالہ "کوڈی" کی امّی نے یہ تصویر اُس وقت اُتاری جب اُن کا ہرن کوڈی کے کان کو از روئے مذاق چبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس تصویر پر کوڈی کی امّی کو ۵۰ ڈالر کا انعام بھی ملا۔

خبردار جو میرے قریب آنے کی کوشش کی۔ چوہے کا بلی کو الٹی میٹم

بہت سے جانور دیکھے ہیں لیکن کوئی اِن سا نہیں دیکھا ہے ہم نے

انسان ہو یا جانور، ان سب کی زندگی میں خوف، شرارت اور غصّے یا حقارت کے لمحے تو آتے ہی رہتے ہیں۔ مگر جانوروں کی زندگی سے اتنے خوبصورت لمحوں کو کیمرے کے ذریعے اُچک لینا کسی کسی کا کام ہے۔ یہ تصویریں اس حوالے سے نایاب اور خوبصورت ترین ہیں۔

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے

واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ

احمد کے حلوہ جات

ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے

MASS

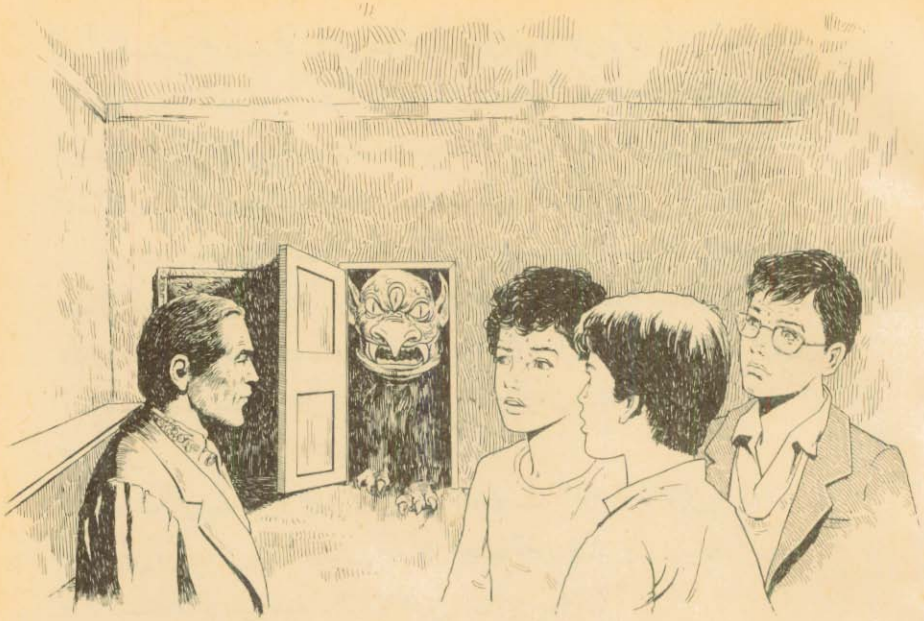

ڈراپ سین

محمّد بن مالک محمّدی

اداکاری کے شوقین تین لڑکوں کی کہانی جنہیں اداکاری مہنگی پڑی

ذاکر، اکبر اور عامر تینوں دوست تھے اور ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ تینوں کو اداکاری کا بے حد شوق تھا۔ اور یہ شوق اب فلم لائن کی طرف انھیں کھینچ رہا تھا۔ ذاکر کے انکل حامد ملک کے مشہور فلمساز و ہدایت کار تھے۔ انھیں ذاکر کے متعلق معلوم تھا کہ وہ اداکاری کرنے کا بے حد مشتاق ہے۔ اور اس کے دو دوست بھی اس کی طرح فلم لائن میں جانے کے خواہشمند ہیں۔ ان دنوں وہ

ایک فلم بنانے میں مصروف تھے۔ اتفاق سے فلم کے ہیرو کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ جس کے باعث اس نے اپنا کردار ادا کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ اس کے علاوہ فلم کے دو اور مرکزی اداکاروں کی طبیعت خراب ہو گئی۔ جس کی وجہ سے حامد صاحب نے ذاکر اور اس کے دوستوں کو ٹیسٹ کے لئے بلایا تھا۔ اسکرپٹ تو انھوں نے ان کو پہلے ہی دے دیئے تھے۔ تاکہ وہ تیاری کر کے آئیں۔

اس رات اکبر، ذاکر اور عامر حامد صاحب کی کوٹھی میں ٹیسٹ کے لئے جا رہے تھے۔ بس سے اتر کر وہ سوسائٹی کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ ایسے میں عامر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے سنسان علاقوں سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ رات کے وقت سوسائٹی کا علاقہ کسی ویرانے سے کم نہیں ہوتا۔ سڑکوں پر آمد رفت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ عامر ایسی سنسان جگہوں سے ڈرتا تھا۔ خیر وہ کسی نہ کسی طرح باتیں کرتے ہوئے حامد صاحب کے گھر پہنچ گئے۔

حامد کے انکل نے انھیں دیکھتے ہی خوش آمدید کہا اور بولے: ”اوہو، نوکر تو چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ گھر میں بھی کوئی اور نہیں ہے۔ ورنہ میں تم کو کم از کم چائے تو ضرور پلاتا۔ خیر..... یہ بتاؤ، تم لوگ تیار ہو کر آئے ہو نا! اور اپنے اپنے کردار تو معلوم ہیں ناں تم سب کو۔؟“

”جی ہاں۔“ تینوں ایک آواز ہو کر بولے۔

”تو پھر تیار ہو جاؤ۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ اس ٹیسٹ ڈرامہ میں میرا کردار بھی شامل ہو گا۔ میں ایک ماہر نفسیات ہوں گا اور تم عامر کو بحیثیت مریض میرے پاس لاؤ گے“۔

تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر بولے: ”اب ہمارے درمیان فلم کے مکالموں کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہو گی۔ ایک ٹیپ ریکارڈ ہماری آوازوں کو ٹیپ کرے گا۔ جبکہ میں تمہاری اداکاری کو جانچوں گا۔ سمجھ گئے نا.....! اچھا اب میں گنتی گنتا ہوں۔ پھر تم شروع ہو جانا۔ ایک، دو تین۔ ریڈی“۔ ذاکر نے ڈائیلاگ بولنا شروع کیا: ”ڈاکٹر صاحب! یہ میرا بھائی ہے۔ اسے پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ باتیں کرتے یا کوئی بھی کام کرتے کرتے کہیں کھو سا جاتا ہے۔ کبھی زیر لب بڑبڑاتا ہے، جیسے کسی سے باتیں کر رہا ہو۔ ہمارے بہت ہلانے جلانے پر اسے ہوش آتا ہے۔ پھر جب ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ کس سے باتیں کر رہے تھے تو بتاتا ہے کہ ایک غیر مرئی شے میری دوست ہے۔ جو صرف مجھے نظر آتی ہے۔ اس کا نام میں نے ”غائب“ رکھا ہے۔ میں اسے جو بھی کچھ کرنے کو کہتا ہوں، وہ کر دیتا ہے۔ یہ اس کا حلیہ بھی بڑا عجیب و غریب بتاتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کا سر بہت بڑا اور

گنجا ہے۔ دہانہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ دو خوفناک دانت ہونٹوں کے باہر جھانکتے رہتے ہیں، ناک پھیلی ہوئی اور طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی وغیرہ۔ ہم نے اس کا بہت علاج کرایا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ماہر نفسیات کے پاس چلے جاؤ۔ سو ہم آپ کے پاس آگئے ہیں"۔

ماہر نفسیات (حامد صاحب) نے عامر کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے کردار کے مطابق بالکل گم صم کھڑا تھا۔ کبھی بڑبڑاتا اور کبھی سر ہلا دیتا۔ اس کی نگاہیں جیسے کسی انجانے "وجود" پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"ٹھہرو، اس کا علاج میرے پاس ہے"۔ یہ کہہ کر ماہر نفسیات نے پاس رکھے گلاس میں جگ سے پانی بھرا اور پھر پورا کا پورا گلاس عامر پر انڈیل دیا۔

عامر بوکھلا گیا، اور اپنے کردار سے ہٹ کر بولا کہ: "ارے انکل! یہ کیا کیا۔ سارا پانی میرے اوپر پھینک دیا؟"

"شش..... خاموش! مجھے تمہاری اداکاری کا اچھی طرح جائزہ لینا ہے"۔ اور پھر عامر نے اس طرح ظاہر کیا جیسے اسے نیم بیہوشی سے ہوش آگیا ہو۔ "کک..... کیا مطلب!" وہ ہکلا کر بولا۔

"پانی کیوں پھینکا ہے میرے اوپر؟" "ابھی پتہ چل جائے گا"۔ ماہر نفسیات نے سخت لہجے میں کہا: "تم اپنے اوپر جن سوار ہونے کا ڈرامہ کر رہے ہو؟"

"ہونہہ، ڈرامہ!" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں اگر "غائب" کو ایک اشارہ کر دوں تو وہ تمہیں چٹکی میں مسل کر رکھ دے۔ تم ہو کیا چیز....."

"میرا خیال ہے، عامر احساس برتری کا شکار ہے۔ اور احساس برتری احساس کمتری ہی کی ایک قسم ہے۔ یہ اپنے آپ کو لوگوں میں نمایاں اور مشہور کرنے کے لئے ڈرامہ رچا رہا ہے"۔ اکبر نے کہا

"اچھا یہ بات ہے؟" عامر نے غصے سے کہا۔ "ابھی میں "غائب" کو حکم دیتا ہوں۔ وہ تمہیں ٹھیک کر دے گا"۔

وہ پھر تھوڑی دیر کے لئے گم صم ہو گیا۔ اس کی نظریں کسی ان دیکھے "وجود" پر جم گئیں۔ پھر وہ دھیرے سے بولا۔ "غائب، غائب! تم ذرا اکبر کا دماغ درست کر دو"۔

اب عامر تو ہوش میں آگیا۔ لیکن اکبر آہستہ آہستہ اپنی کرسی سے اس

طرح اٹھا جیسے کسی ان دیکھی چیز نے اس پر قبضہ کر رکھا ہو۔ (یہ بھی اس کے کردار کا ہی ایک حصہ تھا۔) پھر وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"ہاہاہا۔ دیکھا نا۔! عامر نے قہقہہ لگایا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ۔ غائب میرا دوست ہے، مجھ سے باتیں کرتا ہے اور جو کچھ میں کہتا ہوں کرتا ہے۔ لیکن تم کو یقین ہی نہ آتا تھا۔ اچھا، اب ذرا ذاکر کا حشر دیکھو"۔

پھر ذاکر بھی اٹھا اور اکبر کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا اکبر کی پشت سے منہ لگا کر کھڑا ہو گیا۔

حامد صاحب تحسید آمیز نظروں سے تینوں کو دیکھ رہے تھے۔ واقعی انھوں نے بڑی بے ساختہ اداکاری کی تھی۔ اور اب تو ان کو فلم کے لئے کاسٹ کر لیا جانا لازمی امر تھا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ غائب کا حلیہ کیسا ہے؟" انھوں نے عامر سے پوچھا۔

"اس کا حلیہ اتنا خوفناک ہے کہ بیان سے باہر ہے"۔ عامر نے دونوں آنکھیں بند کر لیں:

"وہ جب بھی میرے پاس آتا ہے تو اس کے ہمراہ رقص کرتے ہوئے انسانی ڈھانچے بھی ہوتے ہیں"۔ یہ کہہ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک تو وہ پہلے ہی ڈرپوک تھا۔ دوسرے اتنے پراسرار رول کی وجہ سے وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔

اسی وقت ان کے بغلی کمرے میں ایک عجیب سا کھٹکا سنائی دیا۔ اس کھٹکے میں نہ جانے کیا تھا کہ چاروں بے اختیار ہو کر مڑے اور پھر ان کی سانسیں سینوں ہی میں اٹک کے رہ گئیں۔ منظر ہی اتنا ہولناک اور دل دہلانے والا تھا۔ اس کا سر بہت بڑا اور گنجا تھا۔ تین سرخ سرخ آنکھیں تھیں۔ ناک چپٹی اور طوطے کی چونچ کی طرح تھی۔ دہانہ پھیلا ہوا تھا۔ دو انتہائی خوفناک دانت باہر جھانک رہے تھے۔

پھر وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر ان کی طرف بڑھا۔ عامر، ذاکر اور اکبر کی بھیانک چیخیں گونجیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

حامد انکل مسکرائے..... "بہت خوب! یہ ہے حقیقی اداکاری!"

"ڈاکٹر!" انہوں نے بھوت سے کہا۔ "ان بچوں کو ذرا ہوش میں لے آؤ"

بھوت نے اپنا ماسک اتارا اور تینوں کو ہوش میں لانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سُلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھُن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر مُوذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سُستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط ارادوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہوکر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **توپھر —— ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچوں کی طرح... آیئے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہوکر اسے موثر بنایئے۔

وزارت صحت اسلام آباد کو بھی آپ سب خط لکھئے کہ حکومت سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی لگادے۔
قومی صحت کو تباہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی بھی ضروری ہے۔

پُراسرار پورٹریٹ

اُس پورٹریٹ کے گھر میں آتے ہی دہشت ناک واقعات کا سلسلہ شروع ہوگیا

نعیم مشتاق نومی

ڈیوٹی کے بعد میں نے سیدھا گھر کا رخ کیا۔ میں آج وہ پورٹریٹ بھی ساتھ میں اٹھائے ہوئے تھا جو کہ کل میں آفس میں بھول آیا تھا۔ دوپہر سے ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوچکی تھی۔ اب شام ہوچکی تھی اور ٹھنڈک میں کافی شدت پیدا ہوچکی تھی۔ سرد ہواہڈیوں کے اندر تک آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ جلد ہی میں گھر پہنچ گیا۔ سب گھر والوں نے پورٹریٹ دیکھ کر مصوّر کی اور میری تعریف کی۔ کھانے پر بھی یہ پورٹریٹ موضوع بنی رہی۔ میرے ذوق کو سب نے سراہا۔ اس میں ایک خوبصورت منظر کشی کی گئی تھی۔

جس میں ایک عقاب کو سانپ پر جھپٹتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ سانپ سہما سہما سا لگ رہا تھا۔ جبکہ عقاب پر بڑا جارحانہ پن طاری تھا۔ اس کا انداز خوفناک حد تک جارحانہ تھا اس کی خوفناک چمکیلی آنکھیں بڑے عجیب انداز سے سانپ کو گھور رہی تھیں۔

چونکہ شام ہی سے سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ لہٰذا ہم سب گھر والوں نے کھانا بھی ذرا جلدی ہی کھالیا اور جا کر اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے۔ ہم جس مکان میں رہتے ہیں اس میں کل تین کمرے ہیں۔ ایک میں ہماری امی جان اور میری بڑی بہن ناصرہ ہوتی ہیں، دوسرے میں میرا چھوٹا بھائی اور سب سے چھوٹی بہن نسیمہ رہتے ہیں اور نسیمہ نویں جماعت کی طالبہ ہے۔ تینوں کمرے ایک لائن میں تھے مگر اب نہیں ہیں۔ اور اس وقت اور اب بھی تینوں کمرے دو دروازوں کی مدد سے آپس میں جڑے ہوئے تھے جو ہم نے اپنی سہولت کے لئے بنائے تھے۔ یعنی ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کمرے میں جانے کیلئے۔ اور اسی تیسرے کمرے میں میں اکیلا سوتا تھا جو کہ بیٹھک کا کام بھی دیتا تھا۔ باہر چھوٹا سا صحن بھی ہے جس میں ایک نلکا اور ایک عدد دھریک بھی تھی اور کونے میں ایک کچن بھی تھا کچن تو اب بھی وہیں موجود ہے مگر دھریک کا نام و نشان بھی مٹ چکا ہے۔ میں بھی کن باتوں میں الجھ گیا ہوں۔ بہرحال سنئیے..... میں نے وہ پورٹریٹ، جسے آپ ایک قیمتی پینٹنگ بھی کہہ سکتے ہیں، درمیان والے کمرے میں لٹکا دی تھی۔ باہر غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ اس لئے بستر کا گرم ہونا تھا کہ میں تھوڑی ہی دیر بعد نیند کی حسین وادیوں میں پہنچ گیا۔

نہ جانے رات کا کونسا پہر تھا کہ ایک دل کو ہلا کر رکھ دینے والی خوفزدہ چیخ سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ ایک لمحے کیلئے تو بالکل سمجھ نہ آیا کہ ایکدم سوتے سے میری آنکھ کیوں کھل گئی ہے؟ اسی اثناء میں وہی لرزہ خیز آواز میری سماعت سے ٹکرائی جسے سن کر میرا دل تڑپ اٹھا کیونکہ یہ چیخ کی آواز میری چھوٹی بہن نسیمہ کی تھی جو کہ ساتھ والے کمرے سے آ رہی تھی۔ ہر سو گھپ اندھیرا کالی چادر تانے ہوئے تھا حالانکہ میں نے زیرو واٹ کا بلب آن کیا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید بجلی چلی گئی ہے چیخ جب دوبارہ میری سماعت سے ٹکرائی تو میں بوکھلا کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے ہی لمحے دوسرے کمرے میں تھا۔ میں نہایت پھرتی سے سوئچ بورڈ کی طرف لپکا۔ بٹن آن کیا تو خلاف توقع کمرہ بقعۂ نور بن گیا۔

روشنی ہوتے ہی میں نے کمرے میں دیکھا کہ میری چھوٹی بہن نسیمہ بری طرح سہمی ہوئی رضائی میں بیٹھی، کانپتے ہوئے پھٹی پھٹی خوفزدہ نگاہوں سے خلاء میں کسی غیر مرئی شے کو گھورے جا رہی ہے۔ اسکا ایک ہاتھ اپنے گردن پر تھا اور دوسرا سامنے کی جانب پھیلا ہوا تھا جیسے وہ کسی شے کو اپنی طرف آگے بڑھنے سے روکنا چاہ رہی ہو۔ اسی لمحے امی جان اور باجی ناصرہ بھی ملحقہ کمرے سے دروازہ میں سے گزر کر وہاں پہنچ گئی تھیں۔

ساتھ میں چھوٹا بھائی نعمان بھی تھا جو کہ نسیمہ کو دلاسہ دے رہا تھا۔ مگر اسے تو جیسے ہماری موجودگی کا احساس ہی نہ تھا۔ سکتہ سا ہو گیا تھا اس پہ۔ کافی دیر بعد ہم اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں کامیاب ہو سکے۔ لیکن وہ اب بھی بدستور ڈری ڈری سی تھی۔ امی جان نے اسے گود میں لیتے ہوئے جھنجھوڑ کر پوچھا۔ ..... چندا کیا..... بات ہے؟..... کیا ہوا؟..... میری چندا بتا تو.....

جواب میں نسیمہ بڑے سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ ..... وہ میرے سینے پر چڑھ بیٹھا تھا..... وہ میرا گلا دبا رہا تھا..... وہ مجھے... مارنا چاہتا ہے.....

امی جان نے پھر پوچھا۔ ..... کون؟..... کون ہے وہ؟..... کس کی بات کر رہی ہو چندا؟.....

..... پتہ نہیں کون تھا؟..... اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آیا..... نسیمہ ابھی تک ڈری ہوئی تھی اور خوف سے پھریریاں لے رہی تھی۔ یہ سن کر میں بولا..... میری چندا نے شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے.....

..... نہیں... بالکل نہیں... میں اس وقت پورے ہوش و حواس میں تھی بھائی جان..... نسیمہ نے سختی سے میری بات کی تردید کر دی۔ کچھ توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ لہجہ اس کا بدستور سہما سہما سا تھا۔ ..... پہلے اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی بہت ہی وزنی یا بھاری شے مجھ پر آ پڑی ہے۔ مجھے سانس لینے میں دقت ہونے لگی اور اس طرح میری آنکھ کھل گئی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا جبکہ سونے سے پہلے میں نے خود زیرو واٹ کا بلب آن کیا تھا۔ اس اندھیرے میں کچھ اور ڈر گئی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنائی دی۔ جس طرح بہت سے پرندے پھڑپھڑا رہے ہوں اور خنک ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے آ ٹکرائے سردی اور خوف سے مجھے پھریریاں آنے لگیں میرے مساموں سے ٹھنڈا پسینہ نکلنے لگا۔ تب اچانک بجلی چمکی اور پھر مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ کوئی بے پناہ وزنی شے میرے سینے پہ اٹکی تھی۔ خوف سے میری گھگی بندھ گئی مگر پھر اضطراری سی خوفزدہ چیخ میرے لبوں سے بلند ہو ہی گئی۔ چیخ نکلنے کے بعد مجھے اپنے گلے پر کسی کی خوفناک حد تک سخت گرفت محسوس ہوئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میری گردن اب تب میں دو ٹکڑے ہونے والی ہے۔ پورے جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ بڑی عجیب سی سرد رو نگٹے کھڑے کر دینے والی لہریں بدن میں دوڑ رہی تھیں اور میں اس سخت خوفناک گرفت سے نکلنے کیلئے بستر پر لیٹی بری طرح تڑپ رہی تھی۔ میرا پورا وجود کانپ رہا تھا اور اس میں شدید سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اسی وقت نعمان بھائی نے مجھے آواز دی اور پھر بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ تب جیسے ہی نعمان بھائی کا ہاتھ میرے جسم سے ٹکرایا، وہ خوفناک گرفت اور بوجھ میری گردن اور سینے پر سے ہٹ گیا۔ اگر چند لمحات اور وہ خوفناک گرفت میری گردن پر رہتی تو پھر میں.....

..... اتنا کہہ کر نسیمہ خاموش ہو گئی اور اس نے اپنا منہ امی جان کے سینے میں

چھپالیا۔ اس کا بدن ایک بار پھر کانپنے لگا۔ جبکہ امی جان اسے پیار سے دلاسہ دیتے ہوئے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ہم سب نے اس کی بیان کردہ داستان بڑی حیرت سے سنی۔ پھر امی جان کے حکم پر میں نے اور نعمان نے سب دروازوں کے لاک چیک کئے مگر وہ سب کے سب مقفل تھے۔ کمروں کی تلاشی لی لیکن بے سود۔ کمرے کون سے زیادہ تھے جو زیادہ وقت لگتا۔ لہٰذا اس کام سے ہم دو تین منٹ میں ہی فارغ ہو گئے۔ سارے کمروں کے بلب روشن تھے۔ ہم سب نے نسیمہ کو تسلی دی اور بڑی مشکل سے سونے پہ آمادہ کیا۔ لیکن اس کے چہرے کی شگفتگی اور بھرپور رونق ابھی تک غائب تھی۔ نسیمہ امی جان کے ساتھ ہی ان کے بستر میں گھس گئی اور میں بھی اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میں بھی باقی گھر والوں کی طرح یہی سمجھ رہا تھا کہ نسیمہ نے کوئی ڈراؤنا ناول وغیرہ پڑھ لیا تھا۔ جس کا اثر اس کے ذہن پہ اتنا زیادہ ہوا کہ اس نے خواب کا روپ دھار لیا۔ اسی ادھیڑ بن میں میں بھی سو گیا۔

دوسرے دن مطلع بالکل صاف تھا۔ خوشگوار دھوپ ہر سو پھیلی ہوئی تھی جو کہ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ حسب معمول میں ڈیوٹی پہ گیا اور شام کو لوٹ آیا۔ ڈیوٹی کے دوران میں یہ سوچتا رہا کہ یہ واقعہ رات کو آخر کتنے بجے پیش آیا تھا۔ رات کو جب نسیمہ امی جان کے پاس لیٹ گئی تھی تو میں نے آ کر اپنے کمرے میں لگے وال کلاک پہ وقت دیکھا تھا۔ اس وقت بارہ بجکر بیس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ واقعہ رات تقریباً بارہ بجے کے لگ بھگ وقوع پذیر ہوا ہو گا۔ اسی لئے جب شام کو ہم نے کھانا کھایا تو اس کے بعد میں اپنے بستر میں گھس گیا اور نعمان اور نسیمہ نے اپنے کمرے میں پڑا ٹی وی آن کر لیا۔ نسیمہ رات والے واقعے کے بعد آج قدرے نارمل دکھائی دی تھی۔ مجھے مگر مکمل طور سے نہیں۔

میں بستر میں دبکا یہ سوچ رہا تھا کہ اگر نسیمہ کا بتلایا ہوا واقعہ سچا ہے تو لازمی طور پر آج بھی رات بارہ بجے کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا اور اگر کچھ نہ ہوا تو میں سمجھوں گا کہ یہ سب کچھ اس کے اپنے ذہن کی اختراع ہے جو کہ ناول پڑھ پڑھ کے اس کے دماغ نے تراشی تھی اور اسکو اس پر حقیقت کا گمان ہوا تھا۔ میں بڑی بے چینی سے رات کے بارہ بجنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جوں جوں بارہ بجنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی جسم میں ایک عجیب سی سنسنی بھی میں محسوس کر رہا تھا۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی عار محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ بارہ بجنے میں جب آخری منٹ باقی رہ گیا تھا تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور خوف بھی محسوس ہو رہا تھا جبکہ عام طور پر میں خاصا جرأت مند اور بہادر واقع ہوا ہوں۔

بہر حال یہ رات بغیر کسی واقع کے بخیر و عافیت گذر گئی۔ بارہ بج گئے میری نظریں وال کلاک پہ جمی

تھیں۔ میں کچھ نہ کچھ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ دل تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ مگر نہ کچھ ہونا تھا اور نہ ہی کچھ ہوا۔ میرے اعصاب خاصے کشیدہ ہو گئے تھے۔ جب کچھ بھی نہ ہوا تو میں مطمئن ہو کر اپنے بستر پر سو گیا۔

○○

صبح کو میری طرح سب ہی کے چہرے مطمئن اور شاداب نظر آ رہے تھے۔ نسیمہ کے چہرے پر بھی تازگی نظر آ رہی تھی۔ وہ خوش خوش، پہلے کی طرح اسکول چلی گئی۔ میں بھی اپنے آفس چلا گیا۔ اور شام کو واپس آ گیا۔ رت کو سب نے کھانا کھایا اور سب اپنے اپنے بستروں میں جا گھسے۔ شام سے ہی ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ لہٰذا سردی میں کافی شدت آ چکی تھی۔ اور سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے گرم گرم بستر بڑی فرحت دے رہے تھے۔ قصّہ مختصر، ہم رضائیاں اور کمبل اوڑھ کر لیٹے اور سو گئے۔

○○

رات کو ویسی ہی دلدوز چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی جیسی ایک چھوڑ کر پچھلی رات میں نے سنی تھی۔ چیخ سنکر میں ہڑبڑاتے ہوئے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ باہر بارش کے قطرے گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ساتھ ہی کبھی کبھی بجلی کے کڑکنے کی آواز بھی آ رہی تھی اور چمک بھی روشندانوں سے اندر تک آ رہی تھی۔ مجھے بستر سے اٹھتے اٹھتے چیخ جیسی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اب کی بار یہ آواز آخری یعنی تیسرے کمرے سے آ رہی تھی۔ جس میں باجی ناصرہ اور امی جان رہتی تھیں۔ میں نے تیزی سے بستر چھوڑا اور اندھیرے میں اندازے سے چلتا ہوا اس کمرے میں پہنچ گیا۔

جس وقت میں کمرے میں پہنچا نعمان نے بلب کا سوئچ آن کر دیا۔ اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ روشنی میں میں نے سب کے چہرے باری باری دیکھے۔ سب کے چہروں پر بارہ بجے ہوئے تھے۔ مگر سب سے برا حال باجی ناصرہ کا تھا۔ جنکا بدن خشک پتے کی مانند ہل رہا تھا۔ خوف ان کی آنکھوں سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ منہ سے سفید جھاگ سی نکل رہی تھی۔ چہرے پر پسینے کے قطرے صاف نظر آ رہے تھے۔ اور میرے دل پر ان کی یہ حالت دیکھ کر چھریاں سی چل رہی تھیں۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور انہیں سہارا دیکر بٹھایا۔ تو مجھے ان کے بدن کی لرزش واضح طور پر محسوس ہونے لگی۔ باجی ناصرہ کا حال بھی نسیمہ سے کچھ مختلف نہ تھا۔ امی جان کی آنکھوں میں خوف و پریشانی کے سائے لہراتے ہوئے نظر آتے تھے۔ نعمان اور نسیمہ بھی پریشان اور ڈرے ڈرے ایک ایک طرف کھڑے ہوئے باجی ناصرہ کو بہت دکھ سے دیکھ رہے تھے۔ اور باجی ناصرہ پر تو جیسے سکتہ طاری تھا۔

کافی دیر بعد ان کی طبیعت کچھ سنبھلی اور اوسان بحال ہوئے۔ اور انہوں نے جو کہانی ہمیں سنائی وہ نسیمہ نے ایک رات چھوڑ کر پچھلی رات ہمیں سنائی تھی اس سے سرِ مو مختلف نہ تھی۔ یہ کہانی سننے کے بعد ہمارا وہ اطمینان ہو گیا کہ ہم نسیمہ کی بات کو خواب سمجھ بیٹھے تھے۔ ہم بری طرح الجھ کر رہ گئے تھے۔ مجھے بھی بھوت پریت کے بارے میں کچھ کچھ یقین ہونے لگا تھا حالانکہ میں توہمات کا بالکل قائل نہیں۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ کوئی چکر ہے ضرور..... مگر کیا؟..... یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا..... عجیب صورتحال سے واسطہ پڑا تھا۔

اب کی بار تو باجی ناصرہ کی گردن پر خراشوں اور پنجوں کے واضح نشانات نظر آ رہے تھے۔ اور ان خراشوں سے تازہ خون رستا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ امی جان تشویش اور خوف کے ملے جلے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ .....”ویسے بیٹا مجھے لگتا ہے یہ مکان آسیب زدہ ہو گیا ہے..... ہمیں یہ مکان تبدیل کر دینا چاہیئے..... ویسے بھی کونسا ہمارا ذاتی ہے؟..... ہے تو کرائے کا ہی مکان..... ورنہ اس طرح تو زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے گی۔..... امی جان آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں کہ پہلے تو اتنی جلدی مکان ملے گا ہی نہیں اور مل بھی گیا تو اس میں یا تو ہم رہیں گے یا پھر سامان رکھیں گے..... بہر حال میں کوشش کروں گا..... ویسے بھی اگلے دو چار روز میں مجھے امید ہے کہ حقیقت پر پڑا پردہ ہٹ جائے گا۔..... میں نے امی جان کو سمجھایا۔

امی جان بڑی مشکل سے مانیں ورنہ وہ تو دوسرے دن اپنی بڑی بہن کے ہاں جانے پر تلی ہوئی تھیں کہ جب تک مکان کا بندوبست نہیں ہو جاتا۔ ہم سب وہیں پر رہیں گے۔ رات کا باقی حصہ ہم نے جاگتے ہوئے گذارہ۔ خوف سے کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے بلب اسی طرح جلتے چھوڑ دیئے تھے۔ ہم ابھی تک اسی تیسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب دوسری بار بھی یہ منحوس واقعہ رات کے بارہ بجے پیش آیا ہے اور پہلی رات کی طرح آج بھی باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے اور کبھی کبھار بجلی یکایک چمک اٹھتی ہے.....

میں یہ باتیں سوچ رہا تھا اور میری نگاہیں لاشعوری طور پر اس پورٹریٹ یعنی خوبصورت پینٹنگ پہ جمی ہوئی تھیں جو میں نے برابر والے کمرے میں لگائی تھی۔ مگر اب وہ اس کمرے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ مجھے دوسرے دن معلوم ہوا جب مجھے اس کے بارے میں اچانک ہی خیال آیا اور میں نے فرداً فرداً اس کے متعلق سب سے پوچھا۔ سب نے اس بات کا انکار کیا کہ انہوں نے یہ پورٹریٹ تیسرے کمرے میں منتقل کی ہے۔ میں بڑا حیران ہوا۔ بہر حال رات کا باقی حصہ ہم نے اسی طرح اکٹھے ایک ہی کمرے میں گزارا۔ رات اسی طرح کٹی اور صبح ہو گئی۔ مگر یہ مسئلہ نہ سلجھا کہ اصل معاملہ کیا ہے؟

حسب معمول میں ڈیوٹی پر چلا گیا۔ مگر دن کا بیشتر حصہ مجھے ان دونوں واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے گزرا اور ان کی جزئیات کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے چند نتائج اخذ کئے۔ اول یہ کہ یہ منحوس واقعہ رات بارہ بجے پیش آیا۔ دوم یہ کہ جب یہ سب کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے اس وقت کچھ دیر کیلئے بجلی کی ترسیل کسی انجانی وجہ سے بند ہو جاتی ہے۔ سوم یہ کہ اس وقت باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہوتی ہے اور کبھی کبھار بجلی بھی چمکتی ہے اور سردی شدید ہوتی ہے۔ چہارم یہ کہ واقعہ ایک دن چھوڑ کر پیش آتا ہے اور پہلے یہ درمیان والے کمرے میں، پھر یہ تیسرے کمرے میں پیش آیا اور اب لازماً باری میرے کمرے کی ہے جس میں، میں اکیلا سوتا ہوں۔

"مزید یہ کہ واردات جب ہوتی ہے تو بجلی کے جاتے ہی سینے پر بوجھ سا پڑتا ہے۔ پھر پروں کی پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ حملہ گردن پر ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا شخص اس آدمی کو ہاتھ لگائے تو وہ آسیب چلا جاتا ہے۔ اور یہ حملہ غیر شادی شدہ بندے پہ ہوتا ہے۔ اور میں بھی ابھی کنوارا ہی ہوں...... مطلب سمجھ رہے ہیں ناں آپ"

میں نے دل میں مصمّم ارادہ کر لیا کہ میں اس پراسرار راز سے پردہ ضرور اٹھاؤں گا۔ اور اسکی تیاری کے لئے میں نے اگلا دن مخصوص کیا۔ چونکہ اب تک کے واقعات ثابت کرتے تھے کہ آج رات کچھ نہیں ہو گا۔ آج کی رات خالی جائیگی۔ آفس کا وقت اسی طرح گذر گیا۔ اور دوسرے دن کی چھٹی کی درخواست دیکر شام کو میں گھر آ گیا۔ کھانے پر گھر والوں کو میں نے سمجھایا کہ آج کی رات کچھ نہیں ہو گا۔ مگر وہ میری بات پر یقین کرنے کو بالکل تیار نہ تھے۔ خوف کی وجہ سے ان سے کھانا بھی ٹھیک طرح سے کھایا نہیں جا رہا تھا۔ عجیب بے اطمینانی اور خوف کا راج تھا۔ سب گھر والے تو بس کھانے کو ایک رسم سمجھ کر پورا کر رہے تھے۔ میں بار بار تسلی اور یاد دہانی کے باوجود کہ آج کچھ نہیں ہو گا۔ سب ہی سونے پر تیار نہیں تھے۔

میں ان دونوں واقعات کا تجزیہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ آج کی رات کچھ نہیں ہو گا۔ مگر گھر والے کسی طور پر بھی میری بات کو ماننے پر آمادہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ بہرحال میں انہیں دوسرے کمرے میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور بستر میں گھس گیا۔ پچھلی رات کے رت جگے کی وجہ سے میری آنکھیں پہلے ہی بوجھل ہو رہی تھیں۔ لہٰذا جب میں بستر میں دبکا تو کچھ ہی دیر بعد نیند کی آغوش میں تھا۔

.... ○ ○ ....

صبح کو معلوم ہوا کہ گھر کے تمام افراد رات کو جاگنا چاہتے تھے۔ مگر چونکہ پچھلی رات جاگتے رہے تھے۔ اس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی سب سو گئے۔ اور رات خیریت سے گزر گئی۔

شام سے پہلے میں نے کسی نہ کسی طرح ایک خنجر کا بندوبست کر لیا۔ اور ٹارچ میں نئے سیل ڈلوائے۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں خنجر زنی کا بڑا ماہر ہوں۔ بہرحال آگے سنئے..... آج صبح سے ہی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور سردی میں بڑی شدت تھی۔ خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ شام ہوتے ہی ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ ماحول بالکل وہی رنگ اختیار کر رہا تھا..... پہلے جیسا..... یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے میرے دل میں عجیب سی بے چینی سی ہو رہی تھی۔ کھانے پر امی جان نے میری پریشانی بھانپ لی اور اس بے چینی کی وجہ پوچھی مگر میں انہیں کسی طرح ٹال گیا حالانکہ وجہ صاف ظاہر تھی۔

کھانے پر سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ کسی سے کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا۔ میں نے بھی چند نوالے زہر مار کئے اور اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ میرا دل آنے والے لمحات کی وجہ سے بڑی بے چینی سے دھڑک رہا تھا۔ آج بھی سردی بڑی شدید تھی۔ مجھے بڑی انجانی سی سنسنی اور خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں رضائی میں گھسا، اپنی سوچوں میں غلطاں تھا۔ اور میرے سرہانے دائیں طرف خنجر بائیں جانب ٹارچ تھی اور نظر کے سامنے وال کلاک جس پر میری نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں بڑی سست رفتاری سے گردش کرتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اور میں بستر پر بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں آنکھیں کھولے چپ چاپ رات کے بارہ بجنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ایک دو بار رسالہ اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کی مگر چند سطور سے زیادہ نہ پڑھ سکا اور مجھے رسالہ واپس رکھنا پڑا۔ دل میں خوف سے عجیب سی اتھل پتھل ہو رہی تھی۔

۱۱ بجکر ۵۹ منٹ..... میرے اعصاب لاشعوری طور پر یکلخت سختی سے تن گئے۔ اور خود بخود میرا ایک ہاتھ خنجر پر اور دوسرا ٹارچ پر جا کر سختی سے جم گیا۔ آنے والے انجانے خوفناک لمحات میرے رگ و پے میں عجب سی سنسنی اور دہشت بھرتے جا رہے تھے..... ۱۱ بجکر ۵۹ منٹ ۵۹ سیکنڈ..... اور کمرے میں جلنے والا ۱۰۰ سوواٹ کا بلب اچانک ہی آنکھ مار کر تاریک ہو گیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس وقت میرے آس پاس چھائی ہوئی تاریکی اور پر ہول سناٹے سے ماحول یکدم پراسرار اور خوفناک ہو گیا تھا۔ بلب بجھنے کے ایک سیکنڈ بعد ہی کمرے میں تیز پھڑپھڑاہٹ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ جیسے کوئی بہت بڑا پرندہ اپنے پر پھڑپھڑا رہا ہو۔ اسی کے ساتھ تیز خنک ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے آ ٹکرائے۔ اور سردی کی تیز لہر میری ریڑھ کی ہڈی تک سرائیت کر گئی۔ میں پھریری لے کر رہ گیا۔ اور میں یہ بھول گیا کہ مجھے ٹارچ روشن کرنا ہے۔ دل کی دھمک اب کانوں میں سے آتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

اچانک ہی مجھے اپنے سینے پر بڑا بھاری بوجھ محسوس ہوا۔ اور اس بھاری بوجھ کی وجہ سے میرے لئے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے یہ بوجھ سینے سے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی مگر نتیجہ صفر۔ لیکن ایک نقصان ضرور ہوا۔ یعنی ٹارچ میرے ہاتھ سے نکل کر نیچے فرش پر جا گری۔ میرے پورے جسم میں بڑی عجب سی سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ کانوں میں کسی کی تیز سانس سنائی دے رہی تھی۔ میں پوری قوت صرف کر رہا تھا کہ وہ بوجھ کسی طرح میرے سینے پر سے ہٹ جائے۔ بوجھ تو نہ ہٹا مگر مجھے گلے پر کسی کی بڑی سخت اور کھردری، رونگٹے کھڑے کر دینے والی گرفت محسوس ہوئی۔ اس خوفناک گرفت سے میرا دم گھٹنے لگا۔ اور بدن میں کرنٹ سی دوڑنے لگی۔ خوف و دہشت سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔

یہاں میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ میں نے کافی عرصہ تک یوگا کی مشقیں کی ہیں۔ جسکی وجہ سے میں لگاتار تین منٹ تک سانس روک سکتا ہوں۔ میری یہی ریاضت اس وقت میرے کام آئی۔ اور میں نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سانس روک لی تھی۔ وہ خوفناک گرفت اتنی سخت اور دہشت ناک تھی کہ میری گردن بڑی بری طرح دکھنے لگی۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا۔

چند خوفناک لمحے گزرے تھے کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے داہنے ہاتھ میں خنجر بدستور موجود ہے۔ پتہ نہیں کیسے وہ میرے ہاتھوں میں رہ گیا تھا۔ سانس روکنا دشوار ہو رہا تھا اور خوف سے پسینہ آ رہا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے اپنی رہی سہی قوت مجتمع کرتے ہوئے، دعا مانگنے کے ساتھ ہی ہاتھ میں دبے تیز دھار خنجر کی مدد سے پھرتی کے ساتھ اس شے پر اندھیرے میں اندازے سے وار کیا۔ جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

خوف سے میرا برا حال تھا۔ گردن بری طرح دکھ رہی تھی۔ رونگٹے میرے کھڑے تھے۔ اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ گردن کی کھال بری طرح چھل چکی تھی۔ جس میں بڑی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ خوف اور درد کی شدت سے چہرے کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ میں بڑی حیرت اور سنسنی بھری دہشت سے اپنے ہاتھ میں پکڑے خنجر کو بٹ بٹ دیکھے جا رہا تھا۔ جس پر سرخ رنگ کا تازہ خون لگا نظر آ رہا تھا۔ وہ گرفت ہٹنے سے اب میرے بدن میں وہ سرد سنسناہٹ جیسی لہریں بھی مفقود ہو گئیں۔ جنہوں نے مجھے مفلوج سا کر کے رکھ دیا تھا۔

جب وہ منحوس پراسرار گرفت میری گردن سے ہٹی تھی تو میرے منہ سے غیر ارادی اضطراری چیخ نکل گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں اس وقت امی جان میرے کمرے میں موجود تھیں۔ اور پھٹی پھٹی حیرت بھری خوفزدہ نگاہوں سے میرے عقب میں دیوار کو گھورے جا رہی تھیں۔ میری نظروں نے بھی ان کی نظروں کا

تعاقب کیا۔ اور پھر میری بھی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں پھٹی نگاہوں سے اس پورٹریٹ کو گھورنے لگا۔ جو کہ آج شام تک امی جان کے کمرے میں تھی۔ اور اب خود بخود پراسرار طریقے سے میرے کمرے میں پہنچ گئی تھی۔

اور پھر ایک اور شے دیکھ کر مجھے ٹھنڈی پھریریاں آنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ پوٹریٹ پر بنے عقاب کا ایک پر اوپر کو مگر دوسرا نیچے کی طرف بڑے غیر فطری اور بے جان سے انداز میں جھول رہا تھا۔ اور اس عقاب کی آنکھوں میں درد کے آثار نمایاں نظر آرہے تھے۔ بڑا ہی دہشت ناک اور حیرت انگیز منظر تھا وہ سب سے زیادہ حیرت بھری خوف ناک بات یہ تھی کہ اس کے پیٹ سے خون رس رس کر نیچے فرش پر ٹپک رہا تھا

اچانک ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں تیزی اور پھرتی سے بستر سے کودا اور باہر کی جانب لپکا۔ باہر اب بارش تھم چکی تھی۔ میں خوف زدہ ہونے کے باوجود تیزی سے کچن میں پہنچا۔ وہاں موجود تمام خشک لکڑیاں اکٹھی کر کے باہر صحن میں ایک خشک جگہ پر رکھیں۔ ان پر تیل..... جی ہاں مٹی کے تیل کی پوری بوتل انڈیل دی۔ اور پھر ماچس سے اس کو آگ دکھادی۔ اور آگ بڑی شدت سے بھڑکی جبکہ میں دوبارہ واپس اپنے کمرے کو بھاگا۔ بڑی مشکل سے ڈرتے ڈرتے وہ پورٹریٹ اٹھائی اور بھاگتے ہوئے آگ کے پاس پہنچا۔ اندر سے ڈر کے مارے میرا حال ناگفتہ بہ ہو رہا تھا۔ پھر میں نے کمال ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ پورٹریٹ آگ میں جھونک دی۔

پورٹریٹ کے گرد ایک شعلہ سا لپکا اور پھر شعلوں نے پورٹریٹ کو گھیرے میں لے لیا۔ پورٹریٹ کے جلنے سے ہر طرف چراندی پھیل گئی جو کہ نہ تو لکڑی کی تھی اور نہ ہی کینوس کی بلکہ گوشت جلنے کی بڑی ناگوار بو تھی۔ خوف کی خنک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ اور ایک ہاتھ سے میں نے اپنا ناک دبایا اور اس سبز دھوئیں کو گھورنے لگا جو کہ اس منحوس پراسرار پورٹریٹ کے جلنے سے اٹھ رہا تھا۔ مجھے خوف سے کپکپی آنے لگی۔ کیونکہ وہ سبز دھواں آگ کے اوپر ایک فٹ پر اکٹھا ہو رہا تھا۔

اور چند لمحوں بعد اس سبز دھوئیں نے ویسے ہی عقاب کی شکل اختیار کر لی جیسی کہ اس منحوس پورٹریٹ پر بنی ہوئی تھی۔ پھر یکایک اس عقاب نے یک بارگی پر پھڑپھڑائے اور بڑے غضب ناک انداز سے میری طرف جھپٹا۔ میرے تو جیسے جسم سے جان ہی نکل گئی۔ میری ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ دل کی دھک دھک کنپٹیوں میں ہونے لگی۔ میں تیورا کر نیچے گر پڑا۔ گرنے کی وجہ سے ہی میں اس کے خوف ناک پنجے سے محفوظ رہا ورنہ تو..... گرتے گرتے میں نے دیکھا کہ وہ دہشت ناک عقاب ناکام حملے کے بعد پر پھڑ پھڑا کر ایک سمت فضا میں بلند ہوتا چلا گیا۔ اس وقت دوبارہ بارش شروع ہو گئی۔

موت کی شاہراہ

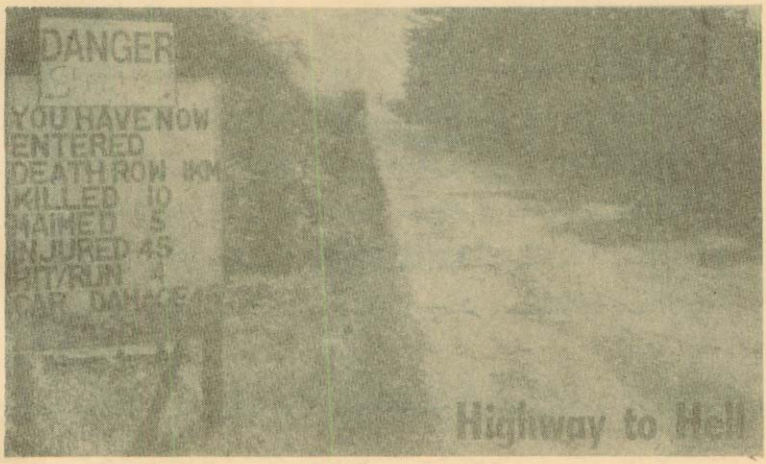

بظاہر یہ ایک عام سی سڑک نظر آتی ہے۔

جی ہاں مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ راستہ جو صرف ایک کلو میٹر لمبا ہے سیدھے موت کے منہ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ آئرلینڈ میں واقع یہ خطرناک سڑک اب تک بہت سے افراد کی جانیں لے چکی ہے۔ اس لئے سڑک کے کنارے ایک بورڈ لگا کر گزرنے والوں کو تاکید کی گئی ہے کہ

"اب آپ موت کی شاہراہ پر قدم رکھ چکے ہیں۔ اس سڑک پر اب تک دس افراد مارے گئے۔ پانچ ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئے۔ پینتالیس افراد زخمی ہوئے ہیں اور چار افراد کچلے جا چکے ہیں۔ اس سڑک پر چھیالیس کاریں بری طرح تباہ ہو چکی ہیں۔ اس لئے مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی گاڑی کی رفتار صرف پینتالیس میل فی گھنٹہ رکھیں"۔

یک نہ شُد دو شُد

شاھنواز فاروقی

ہر محاورے اور ضرب المثل کے پیچھے کوئی نہ کوئی قصہ یا کہانی پوشیدہ ہوتی ہے۔ آج ہم آپ کو ایک ضرب المثل کا دلچسپ قصہ سناتے ہیں یہ قصہ ہم نے بچپن میں اپنی دادی سے کہانی کے طور پر سنا تھا۔

کہتے ہیں کسی زمانے میں ایران کے اندر کالے جادو کا ایک بہت بڑا ماہر رہا کرتا تھا۔ اس کے بے شمار شاگرد تھے جو اس سے کالا جادو سیکھتے تھے۔ کالے جادوگر کے ماہر کے شاگردوں کو معلوم تھا کہ استاد کالے جادو کے بل پر مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ مگر کالے جادو کا ماہر اپنے شاگردوں کو مردوں کو زندہ کرنے کا طریقہ نہیں بتاتا تھا۔ کبھی کوئی شاگرد اس سے یہ ہنر سکھانے کی فرمائش کرتا تو وہ ٹال دیتا یا کہہ دیتا کہ اسے یہ ہنر آتا ہی نہیں۔

کالے جادو کے ماہر کا ایک بہت ہی لائق شاگرد بھی تھا۔ اس شاگرد نے دوسرے تمام شاگردوں کے مقابلے پر بہت جلد تمام جادو ٹونے سیکھ لئے تھے۔ اس کی اسی لیاقت کے باعث اس کا استاد اسے بہت

پسند کرتا تھا۔ ایک روز اسی شاگرد نے کالے جادو کے ماہر سے مردوں کو زندہ کرنے کا ہنر سکھانے کی فرمائش کر دی پہلے تو استاد بہت دیر انکار کرتا رہا مگر بالآخر اپنے لائق شاگرد کے بے حد اصرار پر اس نے اپنے لائق شاگرد کو مُردے زندہ کرنے کا ہنر سکھانے کا وعدہ کر لیا۔

اس لائق شاگرد نے ہمیشہ کی طرح بہت جلد مُردوں کو زندہ کرنے کا جادو بھی سیکھ لیا۔ کچھ دنوں کے بعد جب کالے جادو کے ماہر کا انتقال ہو گیا تو اس شاگرد نے مردوں کو زندہ کرنے والے جادو آزمانے کی سوچی۔ اور وہ ایک رات قبرستان میں جا پہنچا۔

ایک قبر کے پاس بیٹھ کر اس نے مخصوص منتر پڑھنے شروع کر دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قبر سے ایک مُردہ نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا مردے کو اپنے اتنا قریب دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور وہ مردے کو دوبارہ قبر میں واپس لانے کا منتر بھول گیا۔ چنانچہ وہ خوف کے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ بھاگا تو مردہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا وہ جدھر کا رخ کرتا مردہ میں بھی ادھر ہی چل پڑتا۔ یہاں تک کہ بھاگتے بھاگتے وہ شخص تھکن اور خوف کے مارے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ مردہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا اسے گھور رہا ہے۔ اس نے یہ دیکھا تو ایک مرتبہ پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ جہاں جا کر کھڑا ہوتا مردہ بھی وہیں آ کر کھڑا ہو جاتا اسی بھاگ دوڑ میں رات گزر گئی اور صبح ہونے لگی

مگر اسے دماغ پر لاکھ زور دینے کے باوجود بھی مردے کو دوبارہ قبر میں بھیجنے کا منتر یاد نہ آیا۔ اچانک اس کو خیال آیا کہ کیوں نہ استاد کے مردے کو دوبارہ زندہ کر کے اس سے مردے کو قبر میں بھیجنے کا منتر معلوم کیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اس قبرستان کا رخ کیا جہاں اس کا استاد دفن تھا۔ مردہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا قبرستان جا پہنچا۔

اس شخص نے اپنے استاد کی قبر کے پاس بیٹھ کر اسے زندہ کرنے کے لئے منتر پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے استاد کا مردہ قبر سے باہر آ کر سامنے کھڑا ہوا۔ اس شخص نے ایک ساتھ دو مردوں کو دیکھا تو وہ اور بھی گھبرا گیا اور اپنے استاد کے مردے سے وہ منتر پوچھنا ہی بھول گیا جسے پوچھنے کے لئے اس نے اپنے استاد کے مردے کو زندہ کیا تھا۔ اب وہ ایک بار پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ اب صورت یہ تھی کہ وہ آگے تھا اور دو مُردے کفن پہنے ہوئے اس کے پیچھے تھے۔ وہ بھاگتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ "یک نہ شد دو شد۔" "یک نہ شد دو شد" یعنی ایک کے بدلے دو مصیبتیں۔ گویا ایک مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں دوسری مصیبت اس کے پلے پڑ گئی۔

قیامت کے دو روز

محمد سلیم مغل

ھارادا جلدی کرو بیٹا ہمیں ساڑھے سات والی ٹرین پہ پہنچنا ہے اور ٹرین کے آنے میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ ھارادا نے جلدی جلدی اپنا سامان سنبھالا، جوتے کے تسمے باندھے اور اپنی بہن اور امی ابو کے ساتھ اسٹیشن روانہ ہو گیا..... آج ھارادا کے امی ابو ھیروشیما کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر کہیں اور جا رہے تھے، ھارادا کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اتنے خوبصورت شہر کو اس کی مانوس گلیوں اور

اپنے پیارے گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا جائے مگر وہ مجبور تھا اس لئے کہ یہ اس کے امی ابو کا اٹل فیصلہ تھا۔ ھارادا ھیروشی، ھیروشیما یونیورسٹی میں واقع ایلیمنٹری اسکول کا طالب علم تھا۔ اور ایک گڑیا سی بہن کا پیارا سا بھائی۔ وہ اپنے امی ابو اور بہن کے ہمراہ ساڑھے سات بجنے سے قبل ہی اسٹیشن پہنچ گیا تھا مگر ٹرین تو ۸ بجے تک بھی نہیں آئی......

یقیناً کوئی گڑبڑ ہوگئی ہوگی، ھارادا کے ابو نے ٹرین کے بروقت نہ پہنچنے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا اور پلیٹ فارم کے ایک ستون سے ٹیک لگا کر اخبار پڑھنے لگے ھارادا اور اس کی بہن بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگے...... ھارادا کے چہرے پر تھکاوٹ اور بے چینی کے آثار صاف ظاہر تھے...... اس نے سوچا کہ وہ اپنے ابو کی ٹانگوں پر سر رکھ کر تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جائے......

ٹھیک اس وقت جب اسٹیشن کا کلاک ۸ بج کر ۱۵ منٹ کا وقت بتا رہا تھا ایک ناگہانی شدید چمک سے سب کی آنکھیں چندھیا گئیں اور زور دار دھماکے نے زمین پر قیامت کے آثار پیدا کر دیئے ......چند لمحوں بعد ھارادا اسٹیشن پر اکیلا رہ گیا۔ اس کے امی ابو اور پیاری سی بہن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے ھیروشیما اسٹیشن پر ساڑھے سات بجے والی ٹرین تو نہ آئی مگر موت کی ٹرین آئی اور بہت سوں کو ساتھ لے گئی۔

یہ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے جب جاپان کے شہر ھیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا گیا...... اس قیامت خیز لمحے کے عینی شاہد نومورا ایزو کہتے ہیں کہ یہ ایک حسین اور سہانی صبح تھی ھیروشیما شہر کی کاروباری زندگی اور روزمرہ کے معمولات کا آغاز ہو چکا تھا۔ گو ان دنوں دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی مگر آج تو کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہ تھی اور ہوتی بھی تو کیا، زیادہ سے زیادہ کوئی ہوائی حملہ جو جاپانیوں کے لئے معمول بن چکا تھا اور اب تو وہ اس کے عادی بھی ہو گئے تھے...... یکایک خطرے کا سائرن بجا اور ایک طیارہ شہر پر سے پرواز کرتا ہوا گزر گیا...... خیریت رہی...... سب نے سکون کا سانس لیا مگر پھر تھوڑی ہی دیر بعد تین مزید طیارے نیلے آسمان کی وسعتوں میں نظر آئے ......ان میں سے ایک طیارہ بی ۲۹ تھا جس میں نو ہزار پونڈ وزنی ایٹم بم موجود تھا...... ٹھیک ۸ بج کر ۱۴ منٹ پر پہلا ایٹم بم ھیروشیما پر گرا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ اور دھوئیں کی ایک چھتری سی شہر پر تن گئی ......، جو اس چھتری تلے آیا اسے موت کے علاوہ کچھ نصیب نہ ہوا...... دیکھتے ہی دیکھتے قیامت صغریٰ کا منظر بپا ہو گیا اس پہلے ایٹمی دھماکے کے نتیجے میں سوا لاکھ سے زائد لوگ موت

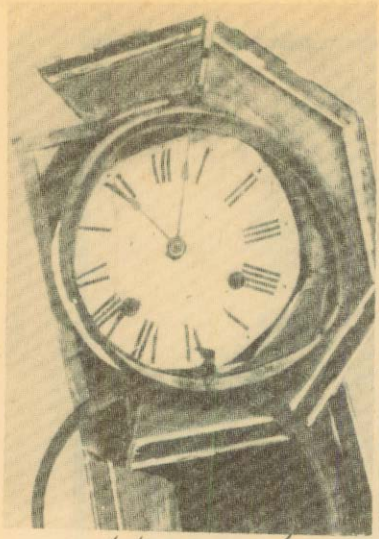

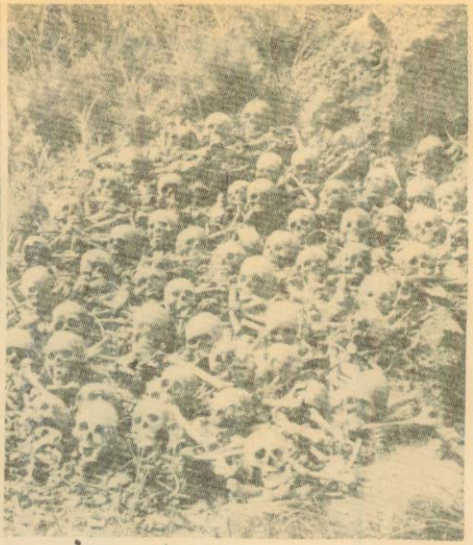

حسین انسانی چہرے بھیانک ڈھانچوں میں تبدیل ہوگئے۔ وقت نے یہ کیا کیا؟

کی آغوش میں جا پہنچے۔ جو لوگ بچ گئے وہ بھی گویا زندہ در گور ہوگئے.....

تابکاری کے اثرات نے لوگوں کو بلکہ نسلوں کو مفلوج کر دیا اور طویل عرصے تک بچ رہنے والوں کے ہاں پیدا ہونے والے بچے بھی ذہنی و جسمانی نقص کے ساتھ پیدا ہوتے رہے.....

یہ ایٹم بم امریکی صدر آئزن ہاور کی طرف سے جاپانیوں کے لئے موت کا پہلا تحفہ تھا.....

موت کا دوسرا عفریت دوسرے ایٹم بم کی شکل میں ٹھیک ۳ دن بعد یعنی ۹ اگست ۱۹۴۵ء کو گیارہ بج کر دو منٹ پر ناگاساکی پر گرایا گیا..... اس بار ساٹھ ہزار سے ستر ہزار تک لوگ لقمہ اجل بنے اور لاکھوں افراد اس کے مہلک اثرات کی زد میں آکر مفلوج اور معزور ہوگئے.....

جس مقام پر بم گرا وہاں کا درجہ حرارت ۴۰۰ سو فارن ہائٹ سے بھی بڑھ گیا تھا، گویا جتنی حرارت لوہے کو پگھلانے کے لئے درکار ہوتی ہے یہ اس سے بھی دوگنی تھی،

ایٹم بم کی ایجاد اور اس کے استعمال میں پہل کی بدولت یہ جنگ امریکہ نے جیت لی مگر انسانیت کی بربادی کا جو داغ اس نے اپنے دامن پر لگایا ہے وہ شائد کبھی بھی نہ مٹ سکے.....

ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے ایٹم بموں نے دنیا بھر کے انسانوں کو ایک

ہم دونوں کبھی ماں باپ کے پیارے تھے۔ اب اک دوجے کے سہارے ہیں

دوسرے سے اس قدر خوف زدہ کر دیا ہے کہ اس وقت سے اب تک گویا گزشتہ ۴۵ سالوں میں پھر اس تجربے کو نہیں دہرایا گیا مگر بداعتمادی کا عالم ہے کہ ایٹم بم کی تیاری کے لئے دنیا کا ہر ملک آج بھی

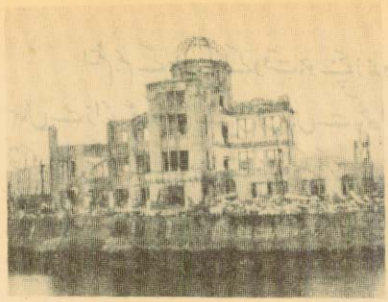

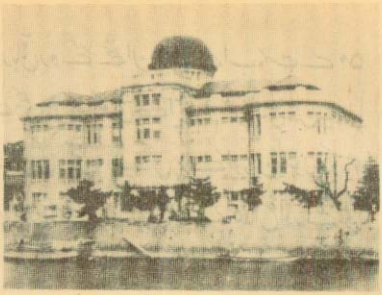

ایوانِ صنعت و تجارت کی عمارت دھماکے سے ایک لمحہ قبل اور ایک لمحہ بعد

تگ و دو کر رہے ہے آج دنیا کے ۱۰ سے زائد ملک ایٹم بم بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں دنیا کی دو بڑی قوتوں یعنی امریکہ اور روس نے تو پوری دنیا میں ایٹمی تنصیبات کے ذریعہ قدم قدم پر موت کے جال بچھا رکھے ہیں۔ آج پچیس ہزار سے زیادہ ایٹمی ہتھیار دنیا بھر میں موجود ہیں جو پہلے سے کہیں زیادہ مہلک ہتھیار ہیں، ان کی طاقت اور تباہی کا انداز اس سے کیجئے کہ آج اگر محض چند بم بھی دنیا کے مختلف خطوں میں گرا دئے جائیں تو یہ پوری دنیا کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہوں گے.....

.....ھیروشیما اور ناگاساکی کی تباہ کاریوں پر دستیاب ۲۰ ہزار سے زائد تصاویر دیکھیں اور بچ جانے والوں کی باتیں سنیں تو ان کے غم کی شدت سے سینہ شق ہونے لگتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے مگر اس حوصلہ مند قوم نے اپنے غم کو ٹھکرا کر نئے عزم سے اپنے وطن کی تعمیر کی ہے جاپانی اس واقعے کو تاریخ کا ایک ناخوشگوار واقعہ کہہ کر بھلانے کی کوشش کرتے ہیں سرکاری سطح پر بھی اس کی تشہیر کی اجازت نہیں ہے باہمت جاپانیوں نے اپنے عزم اور ارادے سے ہیروشیما اور ناگاساکی کو ایک بار پھر مہکتا ہوا گلزار بنا دیا ہے، جو سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے..... یہاں ہزاروں سیاح آتے ہیں اور یہاں کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں.....

جس جگہ بم گرا تھا اب وہاں امن پارک قائم ہے

اس پارک میں مرنے والے افراد کے نام لکھ دیئے گئے ہیں جن کی تعداد سوا لاکھ کے لگ بھگ ہے۔

ایٹم بم گرنے کے نتیجے میں یہاں ہونے والی ایوان صنعت و تجارت کی عمارت کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

ایٹم بم کے سانحے کے وقت جو بچے زندہ اور باقی رہ گئے تھے ان میں سے اب بہت سے ۵۰ سال سے زائد عمر کو پہنچ گئے ہیں ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی کم عمری ہی میں یہ بتایا تھا کہ ایٹم بم گرنے سے چند لمحے قبل وہ کیا کر رہے تھے ان کی باتیں آپ بھی پڑھئے اور ان لمحوں کو یاد کیجئے جو ان معصوم بچوں کو ماں باپ سے بچھڑنے کا غم، بہن بھائیوں سے جدا ہونے کا داغ اور کتنے ہی عزیزوں کے چھن جانے کا روگ دے گئے

ایٹم بم گرنے سے ایک لمحہ قبل

○ .....ایک سرخ رنگ کی عجیب سی مکھی اڑتی ہوئی آئی اور میرے سامنے جنگلے پر آکر بیٹھ گئی ..... اسے پکڑنے کے لئے میں آگے بڑھا ہی تھا کہ.....

فوکوھارا ایجی سانیو جونیئر ھائی اسکول ہیروشیما

○ .....میری نانی اماں باورچی خانے میں سبزی دھو رہی تھیں اور امی بہن کو دودھ پلا رہی تھیں..... میں نے اپنی امی کو مخاطب کر کے کہا..... ”امی آپ مجھے ٹوپی لے کر کیوں نہیں دیتیں.....

یاماموٹو ماسانوری، نوبوری چوایلیمنٹری اسکول ہیروشیما

○ .....ہمارے پڑوسیوں کے پاس ایک پیاری بلی تھی..... میں ہر روز اس کے لئے دودھ کی ایک بوتل لے کر آتی..... اس روز بھی میں بلی کو دودھ پلانے اور اس سے کھیلنے کی خاطر جونہی گھر سے نکلی..... بس اسی لمحے.....

فوکائی می چی کو، نوبیرو چوایلیمنٹری اسکول ھیروشیما

○ .....ہم نے سبزی کی دوکان سے ٹماٹر خریدے پھر میں، میری امی اور میری بہن واپس جانے کے ارادے سے جیسے ہی مڑے.....

یوشیدا ساتومی، سینڈا ایلیمنٹری اسکول ہیروشیما

○ .....اس صبح میں مچھلی پکڑنے کے ارادے سے جا رہا تھا، تائیشو باشی پل کے قریب پہنچ کر میں جونہی نیچے اترا..... تیز روشنی کے ساتھ ہی ایک زور دار دھماکہ ہوا..... اگلے ہی لمحے میں نے اپنے

آپ کو پانی میں پایا............ اپشید اٹومیزو۔ ڈانبارا، ایلیمنٹری اسکول ہیروشیما

○ ......میں کھیلنے کے لئے گھر سے باہر نکلی ہی تھی کہ میں نے دیکھا میری اسکرٹ ایک طرف سے پھٹی ہوئی ہے...... اسکرٹ سینے کے ارادے سے میں جیسے ہی پلٹی......

ٹی شوید اھائیڈ کو، ہو نکاوا ایلیمنٹری اسکول ھیروشیما

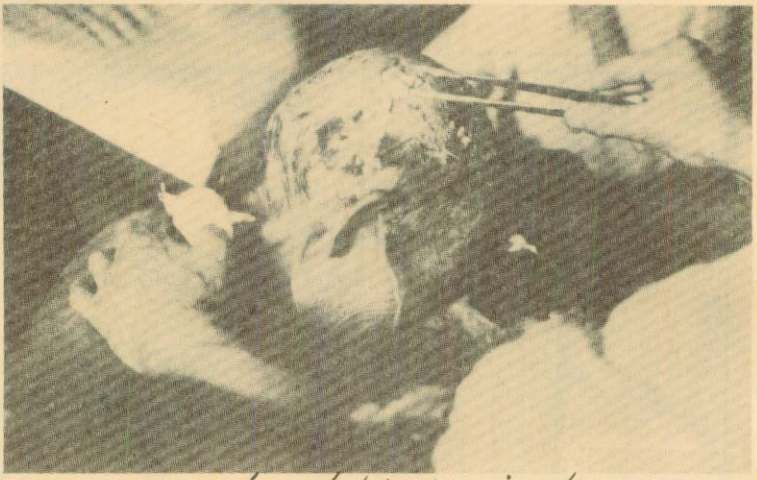

تابکاری اثرات نے دماغ تک کو مجروح کر دیا

ہُوا یُوں کہ ------

اس عنوان کے تحت آپ کی تفریحِ طبع کے لئے **آنکھ مچولی** ایک نیا مزاحیہ سلسلہ شروع کر رہا ہے

آپ ایسے دلچسپ مشاہدات، تجربات یا واقعات کو قلمبند کیجئے جنھیں سُن کر یا پڑھ کر بے اختیار مُسکرانے کو جی چاہے ـــــ کوئی واقعہ، یا مشاہدہ ایک چوتھائی صفحے سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔

ہر ماہ دلچسپ ترین واقعہ انعام پائے گا اور بقیہ واقعات آپ کے نام کے ساتھ شائع کئے جائیں گے۔

تو پھر دیر نہ کیجئے۔ اور جلدی سے لکھئے ـــــ کہ ـــــ ہُوا یوں کہ ـــــ

"ہُوا یُوں کہ"... آنکھ مچولی ڈی۔ ۱۱۲۔ سائیٹ کراچی ۱۶

خوفناک کھیل کہانی

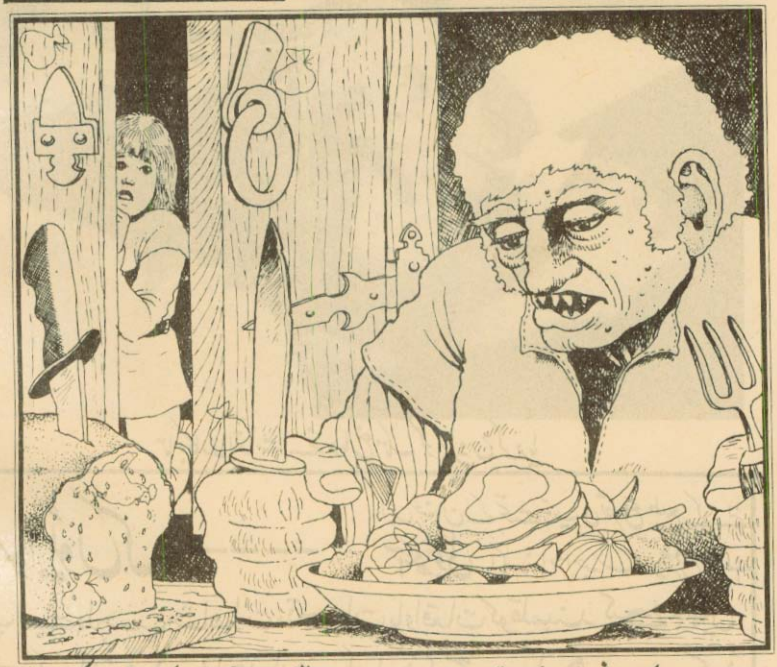

نومی خزانے کی تلاش میں ایک قلعے میں پہنچا۔ اس قلعے میں اُسے ایک خوفناک جن ڈنر میں مصروف نظر آیا۔ اُسے دیکھ کر نومی کی خوف سے گھگھی بندھ گئی۔ یہ ساری کہانی آپ مصوّر کی بنائی ہوئی تصویروں میں دیکھ سکتے ہیں لیکن ان تصویروں میں ایک معمّہ بھی پوشیدہ ہے۔ نومی کی اوپر کی دونوں تصویریں آپس میں مختلف ہیں۔ اسی طرح جن کی بڑی تصویر میں بھی سات گڑبڑیں ہیں۔

کیا آپ ان خامیوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟

بعض اوقات انسان ایسے بے بنیاد اور توہم پرستانہ خیالات کو اپنی زندگی کے واقعات سے منسوب کر دیتا ہے حالانکہ ان خیالات کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے عقل تسلیم کرتی ہے۔

اوہام پرستی کا آغاز قبل از تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ قدیم زمانے کا انسان بغیر کسی وجہ اور سبب کے تمام واقعات کو کسی غیر اہم اور ان دیکھے واقعات کی طرف منسوب کرتا تھا۔ مثلاً وادئ سندھ کے قدیم باشندے درختوں میں روح کے وجود پر عقیدہ رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں انسانی جان کا مرکز درخت

دنیائے قدیم کے عجیب و غریب رسومات

س۔ سعید

میں پوشیدہ تھا۔ قدیم آریا جادو منتروں اور جھاڑ پھونک پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کے ہاں عورتیں زیور پہنتی تھیں۔ سورج، آگ، پانی، بادل، اور قدرتی نظاروں کی یہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ آریوں میں دیوتا کو خوش کرنے کیلئے جانوروں کو قربان کرنے کا رواج تھا۔

قدیم عربوں میں بھی جاہلیت کے اوہام کے کثرت سے واقعات ملتے ہیں۔ ان کے اشعار بھی اوہام پرستی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ روح ایک چھوٹا سا جانور ہے جو پیدائش کے وقت انسان

کے جسم میں گھس کر پرورش پاتا رہتا ہے۔ لیکن جب انسان مرجاتا ہے تو یہ اس کی قبر کے گرد چیختا ہے یہاں تک کہ وہ چیختا چیختا الو کی جسامت کے برابر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں یہ بھی رواج تھا کہ اگر خون کا بدلہ خون سے نہ لیا جائے تو مقتول کے سر سے ایک ننھا سا کیڑا نکل کر آسمان میں "قصاص۔ قصاص" چیختا رہتا ہے۔ اس کیڑے کو "صدّی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ نہ نظر آنے والی روحوں کو اہل عرب "جن" کہا کرتے تھے۔ عربوں کے ہاں جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ حسب خواہش ہر شکل میں نمودار ہو سکتے ہیں۔ ان کا جن کی ہیت کے بارے میں یہ خیال بھی تھا کہ یہ جسم رکھتے ہیں جن کے وجود پر بڑے بڑے بال ہوتے ہیں "ان کے رہنے کی جگہ درخت کنویں اور وادیاں بتائی جاتی تھیں۔ عربوں کی ان جنات میں یہ "غول" سب سے زیادہ خطرناک اور برباد کر دینے والی قسم بتائی جاتی تھی۔ مشرکین عرب بتوں کے نام پر بھی جانور چھوڑ دیتے تھے اور انہیں بڑا مقدس سمجھتے تھے اور طرح طرح کے بے بنیاد خیالات ان کے ساتھ وابستہ کر دیتے تھے۔

افریقہ کے قدیم باشندے بھی جو جنگلوں میں جھونپڑیاں بنا کر رہتے تھے یہ ایک وقت میں وحشی اور خونخوار تھے ان کے ہاں جادو کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ یہ افریقی باشندے اپنی کم علمی کی وجہ سے مختلف جانوروں کی پوجا کیا کرتے ان میں بعض قبائل ایسے بھی تھے جو انسانوں کا خون پیتے اور گوشت کھاتے تھے یہی ان کی خوراک ہوتی تھی۔

قدیم آسٹریلیا کے لوگوں کے اوہام عجیب و غریب تھے۔ آسٹریلیا میں پہلے قاتل کی تلاش کا یہ طریقہ رائج تھا کہ مرنے والے کی قبر کے پاس زمین کو بالکل صاف کر دیا جاتا تھا اسی صاف کی ہوئی قبر پر اگر کسی جانور کے پنجوں کے نشانات ملتے تو ان کی مدد سے قاتل کے مسکن کا پتہ ملتا تھا۔ اور مرنے والے کا کوئی رشتہ دار اس سمت چلنے لگتا چلتے چلتے اگر راستہ میں کوئی آبادی آجاتی تو وہ وہاں کے لوگوں کو کھانے کی دعوت دیتا اور کھانا کھاتے وقت اگر کسی کو چھینک آجاتی تو اس کو قاتل سمجھ لیا جاتا چنانچہ فوری طور پر بدلہ برابر کرنے کے لئے اس کو قتل کر دیا جاتا۔ یہ لوگ جادوگروں کو مادی قوتوں کا مالک سمجھتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ لوگ مرنے کے بعد سفید رنگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں یہ لوگ تناسخ ارواح کے قائل تھے۔

قدیم امریکا کے قبائل کے نزدیک ان کے آباؤ اجداد کی روحیں سانپوں میں رہتی ہیں ان کے نزدیک اگر کسی آدمی کو مگرمچھ کاٹ لے یا اس پر چھینٹیں ڈال دے تو وہ ان کے نزدیک مردہ ہو جاتا تھا۔ جزائر مڈغاسکر کے لوگ ہرنی اور خوبصورت چیز کو خدا سے تشبیہ دیتے تھے وہ جادوگروں اور سرداروں کو عجیب و

غریب قوتوں کا مالک خیال کرتے۔

یہودیوں کے ہاں بھی بہت سی بے بنیاد روایتیں پائی جاتی تھیں۔ یہ لوگ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو بڑا متبرک اور مقدس مہینہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ بیل گائے اور مختلف اقسام کے سانپوں کی پرستش کیا کرتے ان کے ہاں ہفتہ کا روز "سبت" کہلاتا تھا۔ "اسرائیلی عبادت گاہیں" جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی وہاں یہ لوگ بکریوں کی قربانی پیش کیا کرتے۔

غرضیکہ آج بھی اوہامی روایتیں ہماری تہذیب یافتہ قوموں میں مختلف صورتوں میں رائج ہیں مثلاً ہندوؤں میں یہ بات عام ہے کہ اگر کوئی کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو یہ بات منحوس ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ اسلام نے ان تمام اوہام پرستی کو باطل قرار دے دیا ہے لیکن آج بھی اکثر مسلمان ان بے بنیاد اور لغو قسم کی روایات کو اپنے سینے سے لگائے رہتے ہیں۔ جادو ٹونے اور جھاڑ پھونک بھی آج مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں ان تمام بے سروپا روایات اور توہمات کو اپنی زندگی سے نکال دینا چاہئے تاکہ آخرت کا سفر آسان ہو سکے۔

صرف طالبات کے لئے

مقابلۂ تزئینِ رومال

آنکھ مچولی پڑھنے والی طالبات کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے آنکھ مچولی "مقابلۂ تزئینِ رومال" منعقد کر رہا ہے۔

- ——— رومال کا سائز ۱۵ × ۱۵ انچ (کپڑا کاٹن کا) دھاگے یا کپڑے کے رنگ کی کوئی قید نہیں۔
- ——— رومال پر کیا لکھا جائے یا کشید کیا جائے؟ جو آپ کا جی چاہے۔
- ——— شرکت کی آخری تاریخ ۱۵ فروری ۱۹۹۰ء
- ——— اوّل، دوم اور سوم آنے والی طالبات انعام پائیں گی۔

بقیہ تمام شرکا کے رومال ہسپتال میں زیرِ علاج بچّوں کو آپ کی طرف سے "تحفتاً" پیش کئے جائیں گے۔

"مقابلۂ تزئینِ" آنکھ مچولی ڈی ۔ ۱۱۲ ۔ سائیٹ کراچی ۱۶

"جستجو شرط ہے" کا آخری مقابلہ گزشتہ ماہ شائع ہوا تھا۔ مقابلے میں ساتھیوں کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی اس ماہ ہم صرف درست جوابات اور کامیاب شرکا کے نام شائع کر رہے ہیں۔ **ماہِ دسمبر کے درست جوابات**

۱۔ بابری مسجد ۲۔ حضرت ابراہیمؑ ۳۔ میلبورن ۴۔ ضیاء الحق ۵۔ رنی کوٹ ۶۔ ہنری کسنجر ۷۔ ہمدردی ۸۔ مارٹینا ۹۔ نفسیات ۱۰۔ برادر نسبتی۔

انعام حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی

محمد احمد عرف طاہر، عزیز آباد کراچی انیسہ مُغل، لطیف آباد حیدرآباد عاقب مُعید خان، بہاولپور

درُست جوابات ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام

۱۔ ثاقب ایاز۔ محمود آباد کراچی
۲۔ رضوان احمد صدیقی، کراچی
۳۔ اخلاق احمد، گلشن اقبال، کراچی
۴۔ زید بن سعد، گلشنِ عثمان، کراچی
۵۔ عبداللہ، ناظم آباد، کراچی
۶۔ خالد عمر، فیڈرل بی ایریا، کراچی
۷۔ عمر فاروق، گلشنِ عثمان، کراچی
۸۔ نائلہ ناہید، ناظم آباد، کراچی
۹۔ سلمان زبیر، ناظم آباد، کراچی
۱۰۔ شازیہ جمیل، عیدگاہ، کراچی
۱۱۔ ثوبیہ طلعت، فیڈرل بی ایریا، کراچی
۱۲۔ نعمانہ حبیب، کراچی
۱۳۔ سنبل گل، گارڈن ویسٹ، کراچی
۱۴۔ کعب بن مالک، فیڈرل بی ایریا، کراچی
۱۵۔ حسن بن مالک، فیڈرل بی ایریا، کراچی
۱۶۔ محمد بن مالک۔ ایف بی ایریا کراچی
۱۷۔ عنبرین صابر، کراچی
۱۸۔ فاروق بشیر، پاپوش کراچی
۱۹۔ محمد شاہد صدیق، اورنگی، کراچی
۲۰۔ عظمیٰ ناز چشتی، ناظم آباد، کراچی
۲۱۔ فاطمہ حسن خان، عزیز آباد، کراچی
۲۲۔ محمد رضا، لیاری۔ کراچی
۲۳۔ عظمیٰ ادریس، رامسوامی، کراچی
۲۴۔ رخسانہ وکیل۔ ایف۔ بی۔ ایریا، کراچی
۲۵۔ محمد عاصم خان، ماڈل کالونی، کراچی
۲۶۔ کاشف ادریس، رامسوامی، کراچی
۲۷۔ زید اشفاق انصاری، گلشن اقبال، کراچی
۲۸۔ فرحانہ فیصل، فیصل کالونی، کراچی
۲۹۔ سید سرفراز عباس عابدی، ملیر، کراچی
۳۰۔ شاہ رُخ محمد، کراچی
۳۱۔ محمد ریحان شیخ، کراچی
۳۲۔ ایس حلمہ اقبال شیراز، بوتل گلی، کراچی
۳۳۔ خرم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال، کراچی
۳۴۔ محمد شہریار۔ ایف۔ بی۔ ایریا، کراچی
۳۵۔ مرتضیٰ علی خان۔ پی ای سی ایچ ایس کراچی
۳۶۔ عامر شاہین، شاہ فیصل، کراچی
۳۷۔ عبدالنذیر خان، ایف بی ایریا، کراچی
۳۸۔ سید محمد جُنید عالم۔ ایف بی ایریا، کراچی
۳۹۔ فرحین ایاز۔ نشتر روڈ، کراچی
۴۰۔ نوید حمید، دستگیر کالونی، کراچی
۴۱۔ اسد حمید، دستگیر کالونی، کراچی
۴۲۔ افشین حمید، دستگیر کالونی، کراچی
۴۳۔ حنا ایاز، محمود آباد، کراچی
۴۴۔ صدف سلیم، پاپوش نگر، کراچی
۴۵۔ مسرت اقبال، اورنگی ٹاؤن، کراچی
۴۶۔ صدف اقبال۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی
۴۷۔ سلمان نقی۔ کراچی
۴۸۔ قیصر محمود، لیاقت آباد، حیدرآباد
۴۹۔ ارسلان جلیل، حیدرآباد
۵۰۔ بابر جاوید۔ لطیف آباد۔ حیدرآباد
۵۱۔ وقار عادل شیخ۔ واپڈا کالونی، حیدرآباد
۵۲۔ فرح ناز، لطیف آباد۔ حیدرآباد
۵۳۔ راشد اشرف اعوان، واپڈا کالونی، حیدرآباد
۵۴۔ محمد حماد، مائی پاڑہ، حیدرآباد
۵۵۔ فیصل مختار صدیقی۔ دادو، سندھ
۵۶۔ کاشف قادر۔ ضلع ٹھٹھہ، سندھ
۵۷۔ ذکیہ عنبرین شکیل۔ سرروڈ۔ میرپورخاص
۵۸۔ محمد متین عثمان، میرپورخاص
۵۹۔ شہزادی ناز صدیقی، میرپور میرس، سندھ
۶۰۔ ثوبیہ ثمر، خیرپور میرس، سندھ
۶۱۔ محمد امجد ملک، ٹنڈوالہ یار، سندھ
۶۲۔ محمد جاوید لیاقت، ٹنڈوالہ یار، سندھ
۶۳۔ مظہر عبید خاں، بہاولپور
۶۴۔ محمد سمیع اعظم، ضلع گجرات
۶۵۔ صائمہ شفیع، ضلع گجرات
۶۶۔ ندیم ثاقب، بہاولنگر
۶۷۔ آصف وقار آصف، لالہ رُخ واہ کینٹ
۶۸۔ محمد لائق راہموں، تھر پارکر
۶۹۔ سلطانہ خلیل، سمن آباد، لاہور
۷۰۔ علی پرویز، اسلام آباد
۷۱۔ اکبر منیر، اسلام آباد
۷۲۔ طیب جمیل قریشی، سیالکوٹ
۷۳۔ علی شہر، خانیوال
۷۴۔ اللہ دتہ عطیل، خانیوال

دُودھ کی بدولت

ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال

روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت

کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"

ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔

اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔

اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔

دائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو

اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

ٹچ می شو

"ہم سورج چاند ستارے"

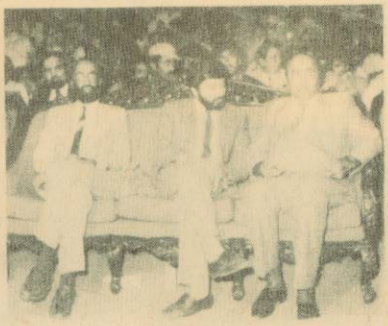

ٹچ می ٹیلنٹ شو کے سامعین میں ماریانہ انٹرنیشنل کے چیئرمین خلیل احمد نینی تال والا مہمانِ خصوصی ڈاکٹر فاروق ستار اور ماریانہ انٹرنیشنل کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب عبداللہ نینی تال والا۔

ٹچ می ٹیلنٹ شو میں مختلف اسکولوں کے بچے ٹیبلو پیش کرتے ہوئے

گزشتہ دنوں کاسمیٹکس بنانے والے ادارے ماریانہ انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام ٹچ می شو "ہم سورج چاند ستارے" کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس کے مہمانِ خصوصی میئر کراچی ڈاکٹر محمد فاروق ستار تھے۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے میئر کراچی نے کہا کہ ٹچ می شو بچوں کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ انہوں نے اتنی اچھی تقریب منعقد کرنے پر منتظمین کو مبارکباد پیش کی۔ تقریب کے اختتام پر مہمانِ خصوصی نے بچوں میں انعامات تقسیم کیئے۔ ماریانہ انٹرنیشنل کے چیئرمین خلیل احمد نینی تال والا نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارے ملک میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ قوم کے نونہالوں کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے۔ شو کے آرگنائزر ڈاکٹر اسلم فیاض نے اس موقع پر مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ ٹچ می شو کی اس تقریب میں اعلیٰ سول حکام اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

خوف

لبنیٰ اقبال

دروازہ دھڑ سے کھلا اور عجیب والخلقت مخلوق کمرے میں داخل ہوئی۔ جسکی آنکھیں عام آنکھوں سے بہت زیادہ بڑی تھیں۔ ان میں پتلیاں نہیں تھیں اور وہ بالکل ساکت تھیں۔ ناک کی جگہ ایک گڑھا تھا۔ چہرے پر گوشت نام کو نہ تھا۔ اس کے ہاتھوں میں زمانہ قدیم کا خنجر یا تیر نما کوئی چیز تھی۔ اور وہ آہستہ آہستہ ہارون کے بستر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ہارون کی آنکھ دروازہ کھلنے پر ہی کھل گئی تھی۔ مگر مارے خوف کے اس میں ہلنے جلنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہو چکی تھی کہ رات کے سناٹے میں اسے صرف اپنے دل کے دھک دھک سنائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مارے خوف کے باہر کو ابل پڑی تھیں۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر اس کی آواز نہیں نکل رہی تھیں۔

اچانک.....؟ کمرے میں ایک بھیانک چیخ ابھری عجیب وغریب مخلوق اپنی زبان میں شاید کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر ہارون کو اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔

اسی اثنا میں وہ ہارون کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہارون کو بستر پر کھڑا کر دیا۔

اس کے ہاتھ میں خنجر نما چیز کا پھل اسقدر چمک رہا تھا کہ ہارون ایک دم رونے لگا "مجھے چھوڑ دو.....؟ پلیز مجھے چھوڑ دو.....؟" مگر وہ اسے دھکیلتی

ہوئی باہر کی جانب چل پڑی ۔ مکان کی پچھلی جانب ویران باغ تھا۔

وہاں اس عجیب و غریب مخلوق سے بھی برے حلیے میں کوئی کھڑا تھا۔ وہ انسانی زبان میں بات کر رہا تھا چیخ رہا تھا۔ "کیا لینے آئے ہو یہاں؟ تم ہمیں تنگ کرنے کیوں آئے ہو؟ تم نے ہمارے ڈیرے کا سکون برباد کر دیا ہے۔ ہم تمہیں بڑی اذیت ناک موت مار دیں گے۔" تب..... ہارون کو مختلف لوگوں کی باتیں یاد آنے لگیں کہ یہ۔ "بنگلہ آسیب زدہ ہے۔ اور برسوں سے ویران ہے۔ کبھی کبھی اس میں سے چیخنے کی آوازیں آتی ہیں۔ اس سے پہلے والی مخلوق ہارون کی طرف بڑھی اور خنجر سے ہارون پر وار کرنے لگی۔

ویران باغ ہارون کی دلخراش چیخوں سے گونج رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہارون بے دم ہو کر گر پڑا.....

اس کے ساتھ ہی احمد نے جھرجھری لے کر کتاب بند کر دی بلکہ میز پر پٹک دی۔ اسے کتاب کا واقعہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہو۔ اب اسے بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اور خوف سے اس کا رنگ بالکل لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا احمد کمرے میں بالکل اکیلا تھا۔ اسکا گھر بھی آبادی سے تقریباً ہٹ کر تھا احمد کے خاندان کے آنے سے قبل یہ گھر ویران رہتا تھا۔ احمد کے گھر والے ہفتہ پہلے اس گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ اور آج سب شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ احمد اپنے پیپر کی تیاری کی وجہ سے گھر میں تھا۔

احمد نے کھڑکی کے پردے ہٹا کر لان میں جھانکا وہاں خاموش تاریکی کا راج تھا۔ کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی جو کہ بڑی بھیانک محسوس ہو رہی تھی۔ "اب کیا کروں..... نیند بھی تو نہیں آ رہی....." احمد نے سوچا۔ یکایک وہ بے ساختہ انڈر میں کارنس پر رکھے ہوئے قرآن مجید کی جانب بڑھا اور پھر قرآن اتار کر اسے بلند آواز سے پڑھنے لگا اسے تلاوت سے اس قدر سرور آیا کہ وہ قرآن پاک کو پڑھتا ہی گیا۔ اور جب اس نے تلاوت ختم کی تو اس کا دل انتہائی پر سکون اور مطمئن ہو چکا تھا۔

پھر اس نے حدیث مبارکہ کی ایک کتاب اٹھائی اور پڑھنا شروع کیا۔

"اسلام کے عقیدۂ توحید کا قائل صرف ایک خدا سے ڈرتا ہے۔ کسی دوسرے سے نہیں ڈرتا اس لئے شجاع اور بہادر ہوتا ہے۔"

اب احمد کو کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ کوئی اس کے ساتھ ہے۔ بہت ہی طاقت والا اور اس سے محبت کرنے والا۔ اس نے اطمینان بھرا ایک لمبا سانس کھینچا اور بستر پر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔

جانے کیا ماجرا تھا!

ارم اقبال

اُس بھٹکتی روح کی کہانی جو اپنے گھر والوں سے ملنے آتی تھی

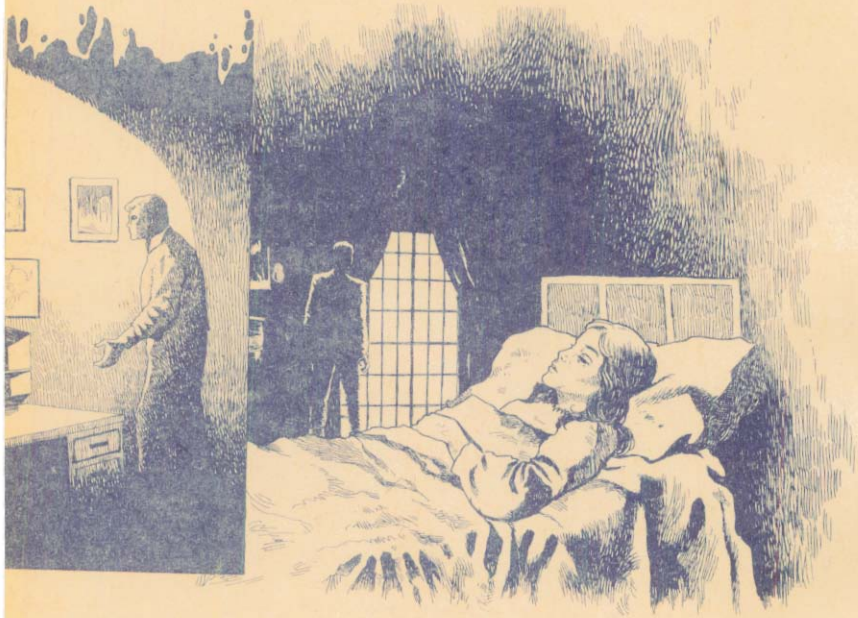

منیبہ کے گھر والوں کو ہمارے اوپر والے گھر میں آئے ہوئے کوئی چار مہینے ہی ہوئے تھے۔ چار بہنیں اور دو بھائیوں پر مشتمل یہ گھرانہ بہت جلد محلے والوں میں گھل مل گیا۔ انکے گھر کے پیچھے کی گیلری ہمارے آنگن میں کھلتی تھی جہاں ہر وقت ان لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ یوں تو یہ ساری بہنیں بہت اچھی تھیں لیکن مجھے ان کی یہ بات ایک آنکھ نہ بھاتی تھی کہ وہ ہر وقت اپنے بھائی کے متعلق باتیں کرتی رہتی تھیں۔

جمعے کی رات تھی ستمبر کی ۳۰ تاریخ ہم سب گھر والے ٹی وی پر چینی فلم دیکھ رہے تھے۔ منیبہ کے گھر سے بہت زیادہ قہقہے لگانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایسے میں منیبہ ہمارے گھر آئی

اس کے ہاتھ میں کیک تھا۔ کہنے لگی کہ آج بھائی کی سالگرہ ہے شام کو بھائی گھر پر نہیں اس لئے اس وقت ہم نے سالگرہ منائی ہے آپ لوگ بھی خوشی میں کیک کھائیے۔ ہم سب نے مل کر کیک کھایا ۔ رات کو سوتے سوتے تقریباً دو بج چکے تھے ۔ لہٰذا صبح دیر سے آنکھ کھلی ۔ میں اٹھ کر آنگن میں منہ ہاتھ دھونے گئی تو زرینہ کی رونے کی آوازیں آرہی تھیں میں نے زیادہ دھیان نہ دیا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے گھر کی کوئی بات ہو۔ خیر ہم سب ناشتا کرنے بیٹھے تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ باہر منیبہ کھڑی تھی ۔ اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی ۔ آنکھیں سرخ، بال اجڑے ہوئے، لباس بے ترتیب ۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اس نے سسکیوں کے درمیان بتایا کہ اس کے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے رات ڈھائی بجے اچھے بھلے سوئے اور صبح بالکل نیلے اور ٹھنڈے پڑے تھے۔ میں امی کے ہمراہ ان کے گھر گئی اس وقت ڈاکٹر آیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ موت اچانک سانس بند ہو جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ سارے گھر میں کہرام پڑا تھا۔ سہ پہر تک منیبہ کے بھائی راشد کو دفنا دیا گیا۔

سوئم ہو گیا تو منیبہ اور اس کے گھر والوں کی حالت ذرا سنبھلی۔ لیکن اس کے بعد ہی عجیب و غریب واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چوتھے روز منیبہ کی امی نے بتایا کہ جس رات راشد کی موت واقع ہوئی وہ تین بجے صبح اٹھیں کہ راشد کو چادر اوڑھا دیں کیونکہ ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ جب وہ راشد کے کمرے میں گئیں انہوں نے دیکھا کہ راشد پیٹ کے بل سویا ہوا تھا وہ ہمیشہ اسی طرح سوتا تھا۔ وہ اسے چادر اڑھانے لگیں تو ان کا دل چاہا کہ وہ راشد کو اٹھا کر کہیں کہ "بیٹا! تم بہت زور سے خراٹے لے رہے ہو۔" پھر انہوں نے یہ سوچ کر کہ اس کی نیند خراب ہو گی اسے نہیں اٹھایا۔ راشد کی امی رو رو کر یہ ساری تفصیل بیان کرتی رہیں۔ ہم سب لوگوں کو بے حد افسوس اور دکھ تھا۔ بہر کیف موت کو کون ٹال سکتا ہے۔

راشد کے دسویں پر میں اس کے گھر گئی تو منیبہ کی سب سے بڑی بہن رشیدہ باجی نے مجھے بتایا کہ راشد مجھے خواب میں آیا تھا اس نے مجھ سے کہا "رشیدہ تم لوگوں نے مجھے اتنی جلدی کیوں دفنا دیا میں مرا تھوڑی تھا۔" پھر یہ ہوا کہ دوسرے دن زرینہ باجی ہمارے یہاں آئیں انہوں نے بتایا کہ میں رات کو سو رہی تھی کہ ایسا لگا کہ کوئی دروازہ کھول کر اندر آیا ہو۔ رات میں سپارے پڑھ رہی تھی اس لئے سپارے رکھ کر قریب چاندنی پر ہی سو گئی تھی میں نے جب کھٹکا سنا تو آنکھیں کھول دیں

لیکن لیٹی رہی میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا کہ راشد پینٹ شرٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کے پورے جسم چہرے اور بال پر مٹی لگی ہوئی ہے وہ میری قریب رکھی میز کے پاس آیا اور سیپارہ اٹھا کر اسے پڑھنے لگا میں جیسے ہی اٹھ کر بیٹھی اس نے بھی فوراً سیپارہ رکھا اور چلا گیا۔ میں نے اسے آوازیں دیں۔ میری آواز سن کر سب گھر والے جاگ گئے سب نے اسے میرا وہم قرار دیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرا وہم نہیں تھا کیونکہ دروازے کی کنڈی بھی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد منیبہ کی امی نے اپنے بیٹے کو کچھ اس طرح دیکھا کہ آئینے پر صاف راشد کا سایہ نظر آیا انہوں نے جو ذرا منہ موڑ کر دیکھا تو راشد کھڑا مسکراتا ہوا نظر آیا۔ منیبہ کی امی کو خوشی کے ساتھ ڈر بھی محسوس ہوا کیونکہ بہر حال وہ اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ منیبہ کی امی نے اسے آوازیں دیں تو وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی امی نے کھڑکی سے جھانک کر دوسرے کمرے میں دیکھا تو وہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کے چہرے اور جسم پر مٹی لگی ہوئی تھی مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے "خدا حافظ" کہہ کر دروازہ کھول کر چلا گیا۔ میں نے منیبہ کے ابو کو جگایا تو انہوں نے دیکھا کہ واقعی سیڑھیوں پر جو دروازہ کھلتا تھا وہ کھلا ہوا تھا حالانکہ منیبہ کے ابو نے رات خود کنڈی لگائی تھی۔ اس کے بعد دو دن ہی گزرے تھے کہ ان کی امی کی سوتے میں آنکھ کھل گئی انہوں نے دیکھا کہ راشد ان کے پاؤں پکڑے بیٹھا تھا اور آہستہ آہستہ دبا رہا تھا میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو وہ وہی کپڑے پہنے ہوئے تھا جو اس نے انتقال سے ایک روز قبل پہنے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تو بیٹھا رہا پھر وہاں سے اٹھ کر اس جگہ چلا گیا جہاں اس کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اس نے اپنی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا میں برداشت نہ کر سکی اسے آواز دینے لگی۔ میری آواز سن کر اس نے ایک جھٹکے سے اپنے کپڑے جھاڑے اور پھر وہی دروازہ کھول کر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا جہاں اس نے کپڑے جھاڑے تھے وہاں مٹی پڑی تھی۔ ان تمام واقعات کے ہونے کے بعد سب کو یقین ہو گیا کہ راشد آتا ضرور ہے۔ تین روز بعد منیبہ کے ابو نے اپنے بیٹے کو اپنی امی کے سرہانے کھڑا دیکھا۔ جب وہ اٹھ کر بیٹھے تو راشد دوسرے کمرے میں چلا گیا جس جگہ وہ کھڑا تھا اب وہاں مٹی پڑی تھی۔ اسی روز منیبہ کے ابو خاندان کے بزرگوں اور محلے والوں کے ساتھ قبرستان گئے۔ جب بیٹے کے قبر پر پہنچے تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ابھی ابھی کسی نے اوپر سے تازہ تازہ مٹی ڈالی ہو۔ دوسرے روز جب دوبارہ ماں کو بیٹا نظر آیا تو پھر وہ لوگ قبرستان گئے اس دن بھی بالکل تازہ مٹی قبر پر نظر آئی۔ سب لوگوں نے

متفقہ فیصلہ کیا کہ چالیسویں کے بعد قبر کھود کر دیکھی جائے گی۔ اس رات بڑی بہن رشیدہ باجی نے دیکھا کہ سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں راشد بھی بیٹھا ہے۔ انہوں نے راشد کو آواز دی تو اس نے جواب دیا انہوں نے اس سے پوچھا "راشد تمہارے پیسے کسی آدمی پر ادھار تھے ہمیں اس کا نام و پتہ معلوم نہیں۔ تو اس نے صفحے پر کچھ لکھا اور پھر اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ منیبہ کی امی نے بتایا کہ میں نے بھی رات تین بجے کچھ اس طرح دیکھا کہ ڈرائنگ روم میں سب بیٹھے ہیں راشد بھی بیٹھا ہے میں نے اس سے کہا کہ بیٹے آخر کیا وجہ ہے کہ تم مرنے کے بعد بھی ہمیں نظر آتے ہو اور منیبہ اکثر تمہیں خواب میں یہ کہتے ہوئے دیکھتی ہے کہ میں ابھی مرا تھوڑی تھا پھر تم لوگوں نے مجھے کیوں دفنا دیا۔ ہم نے تمہاری قبر دیکھی تو وہ بالکل تازہ نظر آئی آخر کیا وجہ ہے اس نے جواب دیا کہ "اگر آپ کو میرا آنا بہت برا لگتا ہے تو میں نہیں آیا کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اتفاق کہنا چاہئے کہ منیبہ نے بھی اسی رات خواب میں دیکھا کہ بھائی آئے ہوئے ہیں منیبہ نے بتایا کہ میں نے بھائی سے پوچھا کہ آپ کا انتقال کیسے ہوا تھا تو وہ کہنے لگے میں ہمیشہ ہی الٹے ہو کر سوتا تھا لیکن مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ ہوئی اس روز بھی میں سو رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی چیز پھڑپھڑائی ہے وہ کوئی عجیب بلا تھی۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور میں دوبارہ سو گیا پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں قبر میں تھا۔ گھر کے تین فرد میں سے دو سے جاگتی آنکھوں سے اور ایک نے خواب میں یہ سب دیکھا۔ صبح رشیدہ باجی نے سب کو رات کی بات بتائی اور میز پر دیکھا تو واقعی بھائی کی تحریر نظر آئی جس میں لکھا تھا کہ میرے چار ہزار روپے رشید صاحب کے پاس ہیں اور ان کا فلاں فلاں پتہ ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا بھول گئی کہ ان کے بیٹے نے اپنی امی کو منع کیا تھا کہ میری قبر کو کھودا نہ جائے۔ منیبہ کے ابو رشید صاحب کے پاس گئے واقعی اس کے پاس ان کے بیٹے کے روپے باقی تھے چنانچہ اس شخص نے ایمانداری سے کام لیتے ہوئے وہ روپے منیبہ کے ابو کو لوٹا دیئے۔ منیبہ کے ابو نے قبر کھودوانے کا کام ترک کر دیا۔ اب جبکہ منیبہ کے بھائی کا چالیسواں ہو چکا تھا پھر بھی روز رات کو کسی پہر منیبہ کے بھائی کے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کی آہٹ آتی تھی لیکن اب منیبہ لوگ نہیں ڈرتے لیکن ہمارے لئے یہ واقعہ حیران کن بھی تھا اور ڈرا دینے والا بھی اس لئے ہم نے وہ مکان تبدیل کر لیا لیکن آج تک یہ معمہ کسی سے حل نہ ہو سکا ان واقعات پر نہ صرف لوگ حیران و ششدر رہتے بلکہ پورے محلے والے پریشان تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا ہمیں معلوم نہیں ہو سکا اور نہ ہی ہم نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ جانے کیا ماجرا تھا۔

قرض

عشرت رضیہ

میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔ آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے میری پوسٹنگ پنجاب کے ایک سرحدی گاؤں کے اسکول میں ہو گئی۔ مجھے حکومت کی طرف سے ایک گھر بھی ملا۔ میں جب گاؤں پہنچی تو وہاں کے لوگوں نے میرا پُرتپاک استقبال کیا۔ پرنسپل صاحب بہت شفیق انسان تھے۔

وہ مجھے میرا گھر دکھانے لے گئے گھر کیا تھا ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ بڑی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت پرانی بھی تھی۔ پرنسپل صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ حویلی ایک میجر کی آبائی حویلی تھی۔ جسے کسی نے اسی حویلی میں گولی مار دی تھی۔ اس کے بعد چونکہ اس حویلی کا کوئی وارث نہیں تھا اسی لئے حکومت نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ چند دنوں بعد اس میں ایک سرکاری افسر آکر رہنے لگا۔

لیکن چند دنوں کے بعد ہی وہ یہ کہہ کر یہاں سے بھاگ گیا کہ اس حویلی میں اس میجر کی روح رہتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد لوگ اتنے خوفزدہ ہو گئے کہ پھر کوئی بھی اس حویلی میں نہیں آیا۔ میں چونکہ روحوں وغیرہ پر یقین نہیں رکھتی تھی اس لئے میں بالکل خوفزدہ نہیں ہوئی۔

حویلی بہت گندی ہو چکی تھی۔ میں نے اگلے ہی روز سے اس کی صفائی شروع کر دی۔ کمروں میں سفیدی کروانے۔ اور سجاوٹی اشیاء رکھنے کی وجہ سے دو تین دنوں ہی میں حویلی بے حد صاف ستھری نظر آنے لگی۔ حویلی کے پیچھے ایک اجاڑ باغ بھی موجود تھا جو کسی زمانے میں بہت خوبصورت ہوتا ہو گا۔ میں نے گاؤں کے مالی بابا کی مدد سے اس میں پھولوں اور سبزیوں کے پودے لگوا دیئے۔ لیکن ایک بات مجھے پہلے دن ہی سے پریشان کر رہی تھی۔

وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جو کہ باغ کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ اس میں عجیب بات یہ تھی کہ اس کے دروازے کو لکڑی کی پھٹیاں ٹھونک کر سیل کر دیا گیا تھا۔ آخر کار میں نے اس کمرے کے متعلق مالی بابا سے پوچھا۔ انہوں نے کہا۔ "پتہ نہیں بیٹی۔ میجر صاحب نے اسے اپنی موت سے چھ سات مہینوں پہلے بنوایا تھا اور پھر چند ہی دنوں کے بعد اس کے دروازے پر پھٹیاں ٹھونکوا دیں"۔ میں نے پوچھا۔ "تو کیا حکومت کے نمائندوں نے اسے اپنی تحویل میں لیتے ہوئے اس کمرے کو نہیں کھلوایا تھا"۔ وہ بولے۔ "نا بیٹی۔ وہ تو آئے اور کاغذی کارروائی کر کے چلے گئے۔ اور اب تم سوچتی ہو گی کہ گاؤں والوں نے اسے کیوں نہیں کھولا۔ تو بیٹی وہ تو پہلے ہی روح والے واقعہ سے ڈرے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس حویلی کا رخ کم ہی کرتے ہیں۔" خیر میں نے اس کے متعلق مزید پوچھ گچھ مناسب نہ سمجھی۔

مجھے اس حویلی میں آئے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ ایک رات میں اپنے کمرے میں بیٹھی بچوں کی کاپیاں چیک کر رہی تھی کہ اچانک کسی نے کمرے کی کھڑکی پر دستک دی۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو باہر ایک شخص دوسری طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔ میں سمجھی کہ شہر سے کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔ اسی لئے میں جلدی سے باہر بھاگی۔ لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ اس شخص کو کھڑکی پر دستک دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر وہ شہر سے آیا ہے تو اسے میرے کمرے کا کیسے پتہ چلا؟ انہیں خیالات میں گھری میں باہر آ گئی۔ لیکن یہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی کہ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے سارے گھر کے ارد گرد چکر لگا کر دیکھ لیا۔ لیکن

مجھے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ میں حیران پریشان واپس آگئی۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے ایک دفعہ پھر حیران ہونا پڑا کہ ڈرائنگ روم میں پڑے ایش ٹرے میں ایک جلتا ہوا سگریٹ پڑا تھا۔

صبح میں نے اس واقعہ کا ذکر مالی بابا سے کیا اور انہیں سگریٹ بھی دکھایا۔ سگریٹ دیکھ کر وہ چونک پڑے۔ "یہ تو میجر صاحب کا پسندیدہ سگریٹ برانڈ تھا۔ وہ اسے باہر کے کسی ملک سے منگواتے تھے۔ کیونکہ یہ یہاں نہیں ملتا۔" "تو کیا رات میجر کی روح آئی تھی؟" یہ سوال میرے ذہن میں گونج کر رہ گیا۔

اس واقعہ کے تقریباً ایک ہفتہ کے بعد ایک روز میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میرے پیچھے سیڑھیاں تھیں جو اوپر کی منزل کو جاتی تھیں۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی سیڑھیوں پر کھڑا مجھے گھور رہا ہو۔ خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ پھر مجھے بھاری بوٹوں کی آواز آئی۔ جیسے کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا ہو۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ واقعی کوئی شخص سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ لیکن چونکہ وہ سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا تھا اس لئے مجھے صرف اس کے بھاری جوتے نظر آرہے تھے۔ میں دم سادھے اس منظر کو دیکھتی رہی۔ چند لمحوں بعد وہ شخص مڑا اور پھر غائب ہو گیا۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن میں کافی خوفزدہ ہو چکی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد ایک رات میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اچانک میری نظر باغ والے کمرے پر جا پڑی۔ میں نے صاف طور پر دیکھا کہ کوئی شخص اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میں چائے کو چھوڑ کر فوراً باہر بھاگی تاکہ دیکھ سکوں کہ اندر کون گیا ہے۔ لیکن جب میں اس کمرے تک پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ دروازہ اسی طرح بند تھا۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ میں واپس جانے کے لئے مڑ گئی۔ ابھی میں تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ مجھے زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک ہیولا کمرے کے پیچھے غائب ہوتا نظر آیا۔ میں فوراً گھر کی طرف بھاگ اٹھی اور اپنے کمرے میں ہی جا کر دم لیا۔

اب میں واقعی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اس حویلی میں اس میجر کی روح رہتی ہے۔ اور اس کا کوئی نہ کوئی تعلق اس کمرے سے ضرور بنتا ہے۔ لیکن وہ تعلق کیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتی تھی۔ آخر کار مجھے یہ تعلق پتہ چل ہی گیا۔

وہ ایک طوفانی رات تھی۔ میں اپنے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے نچلی منزل سے کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی جس پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے وقت دیکھا تو ایک بج رہا تھا۔ میں چپکے سے اٹھی اور دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی۔ سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر میں نے نیچے جھانکا۔ نیچے ایک شخص میز پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ یہ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی تھی کہ وہ کوئی چور نہیں تھا۔ کیونکہ وہ بہت اطمینان سے لکھ رہا تھا۔ وہ اتنا زیادہ جھکا ہوا تھا کہ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور تین چار سپاہی اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں اور انہوں نے بھارتی فوج کی وردی پہن رکھی تھی۔ میں فوراً دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی اس شخص نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ جیسے ہی میری نظر اس کے چہرے پر پڑی میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کیونکہ وہ چہرہ کسی طرح زندہ انسان کا چہرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل بجھی ہوئی اور چہرہ مردوں کی طرح سفید تھا۔ جب میں نے غور سے ان سپاہیوں کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے بھی اسی طرح کے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک سپاہی بولا۔ "آج تم کھنڈرات میں کیوں نہیں پہنچے"۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی کنوئیں میں سے بول رہا ہو۔ جواب میں اس شخص کے لب ہلے۔

"کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنے وطن سے غداری نہیں کروں گا"۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم بھی تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتے"۔ ان سپاہیوں میں سے ایک بولا۔ اور پھر چاروں نے ایک ساتھ بندوقوں کے ٹریگر دبا دیئے۔ کوئی دھماکہ نہ ہوا۔ لیکن اس شخص کے سر سے خون کی ایک دھار نکلی اور وہ گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سپاہی غائب ہو گئے۔

میں بت بنی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس لاش میں آگ بھڑک اٹھی۔ پھر چند ہی لمحوں کے بعد اس میں حرکت ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ اٹھنے لگی۔ اور پھر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ آگ اب تک بھڑک رہی تھی۔ لاش آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئی۔

اب میرا یہ حال ہو رہا تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ مجھے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ اچانک اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں نے سوچا کہ مرنا تو ایسے بھی ہے اور ویسے بھی۔ لہٰذا

اس کے پاس جانے میں کیا ہرج ہے۔ یہ سوچ کر میں نیچے آ گئی۔

نیچے آ کر میں کچھ دیر اسے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر میں نے کہا۔ "اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ وہی میجر ہیں نا"۔

"ہاں"۔ اس نے جواب دیا۔

"لیکن آپ کے جسم میں آگ کیوں لگی ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے اوپر ایک قرض ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اور جب تک یہ قرض مجھ پر سے نہیں اترے گا میں یونہی جلتا رہوں گا۔"

"کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں تم میری مدد....." ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے جسم سے تیز سرخ روشنی نکلی جس کی وجہ سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ جب میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

میں کچھ دیر یونہی گم صم ادھر کھڑی رہی۔ جب میرے حواس قابو میں آئے تو میں اپنے کمرے میں جانے کے لئے مڑی۔ اچانک میری نظر اس میز پر پڑی جس پر سب سے پہلے میں نے اس روح کو کچھ لکھتے دیکھا تھا۔ اس پر ایک ڈائری کھلی ہوئی پڑی تھی۔ جس پر لکھے ہوئے الفاظ مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ میں وہ ڈائری اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی۔ اور اسے پڑھنا شروع کیا۔ اس پر لکھی ہوئی تحریر یقیناً میجر کی روح کی تھی۔ جو کچھ یوں تھی۔

"میں نے ۱۹۵۵ء میں آرمی میں کمیشن حاصل کیا۔ اور جلد ہی اپنی ذہانت کے بل بوتے پر مجھے کیپٹن کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اور ساتھ ہی میرا چناؤ آرمی کے اسپیشل سروسز گروپ کے لئے بھی ہو گیا۔

جنوری ۱۹۶۴ء میں مجھے ایک خفیہ مشن پر بھارت بھیجا گیا۔ مجھے وہاں موجود ایک عمارت کے قید خانے سے پاکستان کے انتہائی اہم جاسوس چھڑا کر لانے تھے۔ میں خفیہ طور پر بھارت میں داخل ہو گیا۔ اور کئی مہینوں تک وہاں سرگرم عمل رہا۔ آخر کار فروری ۱۹۶۵ء میں میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس عمارت میں داخل ہو کر تمام عملے کو بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب مسئلہ قید خانے کی چابیوں کا تھا۔ مجھے اس لاکر کا تو پتہ تھا جس میں وہ چابیاں تھیں۔ لیکن میں یہ

نہیں جانتا تھا کہ وہ کس خانے میں رکھی ہیں۔ خیر میں نے وہ لاکر کھولا۔ لیکن مجھے اس میں چابیاں نظر نہ آئیں۔ میں سمجھ گیا کہ چابیاں کسی خفیہ خانے میں ہیں۔ تلاش کرنے پر مجھے وہ خفیہ خانہ بھی مل گیا۔ جب میں نے اسے کھولا تو واقعی اس میں چابیاں پڑی تھیں۔ لیکن چابیوں کے ساتھ وہاں ایک فائل بھی پڑی تھی جس پر "ٹاپ سیکرٹ" کے الفاظ درج تھے۔ میں نے وہ فائل اس خیال سے اپنے ساتھ رکھ لی کہ شاید اس میں موجود راز ہمارے کسی کام کا ہو۔

مشن میں کامیابی کے بعد میں قیدیوں سمیت پاکستان واپس آگیا۔ میرے اس کارنامے پر مجھے میجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اس تمام ہنگامے میں میرے ذہن سے فائل والی بات بالکل نکل گئی۔ دو تین دنوں بعد جب میں گھر واپس آیا تو مجھے اچانک اس فائل کا خیال آیا۔ میں نے جلدی سے اسے نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ میں جیسے جیسے اسے پڑھتا جارہا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی۔ کیونکہ وہ اتنا اہم راز تھا کہ بھارت کی حکومت اس کے عوض مجھے کروڑوں روپے بھی دے سکتی تھی۔

میں ایک محبِ وطن شخص تھا۔ لیکن کروڑوں روپے کا خیال آتے ہی میرے اوپر بھی شیطانیت غالب آگئی اور میں نے وہ فائل اپنی حکومت کو دینے کی بجائے بھارتی حکومت سے ساز باز شروع کر دی۔ آخر کار سودا ساڑھے نو کروڑ میں طے ہو گیا۔ اسی سے اس راز کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سودا طے ہونے کے بعد میں نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ لیکن اس بات کا پتہ گاؤں والوں کو نہ چلا۔ راز کے تبادلے کی تاریخ ۱۰ ستمبر طے ہوئی۔ اب اس وقت تک راز کی حفاظت کا مسئلہ تھا۔ سو میں نے باغ کے کونے میں ایک کمرہ بنوا کر اس میں یہ فائل دفن کر دی اور اس کے دروازے کو سیل کروا دیا۔ اس کے بعد میں مطمئن ہو گیا۔

لیکن ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا اور پاکستان کے نہتے عوام پر مظالم توڑے تو میرا ضمیر جاگ گیا۔ اور میری میری سوتی ہوئی غیرت پھر زندہ ہو گئی۔ جب میں نے ہندوؤں کی اصلیت دیکھی تو مجھے اپنے کیے پر شرمندگی ہونے لگی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اب وہ فائل پاکستان کے حوالے کر دوں گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے بھارتی حکومت کے نمائندے کو فون کر کے کہہ دیا کہ اب میں وہ فائل انہیں نہیں دے سکتا۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد مجھے دلی سکون ملا۔ اس رات میں حویلی میں سو رہا تھا کہ اچانک چند بھارتی فوجی سرحد عبور کر کے حویلی میں گھس آئے انہوں نے مجھ سے فائل کے متعلق پوچھا۔ میرے انکار پر انہوں نے مجھے گولی مار دی۔ وہ تو چلے گئے۔ لیکن میری روح آج تک بے چین ہے کیونکہ میں وہ فائل حکومت کے حوالے نہ کر سکا۔ خدا کے لئے میری مدد کرو"۔

میں نے ڈائری بند کر دی۔ صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں فوراً باہر نکلی اور مالی بابا کی مدد سے باغ والے کمرے کا دروازہ کھولا۔ فرش کھودنے پر واقعی اس میں سے ایک بکس نکلا جس میں وہ فائل پڑی تھی۔ میں فوراً دارالحکومت روانہ ہوگئی۔ وزارت دفاع کے دفتر پہنچنے پر مجھے بہت مشکل سے اندر جانے دیا گیا۔ میں سیکریٹری دفاع کے پاس پہنچی اور انہیں وہ فائل پیش کی۔ اور سارا واقعہ سنا ڈالا۔ وہ بہت انہماک سے اس فائل کو پڑھتے رہے۔ اور پھر سر اٹھا کر بولے۔

"سوری میڈم اب یہ فائل ہمارے کسی کام کی نہیں ہے"۔

یہ کہانی ہے سمجھنے کی ... نہ سمجھانے کی

مرسلہ۔ کاشف طاہر۔ سعودی عرب

نسیر ابدالی

منحوس مکان

۱۹۸۱ء میں مسٹر سام ہینی نے ۷۵ ہزار ڈالر میں ایک خوبصورت مکان خریدا تھا۔ یہ مکان گھنے درختوں سے آدھا ڈھکا ہوا تھا۔ ایک طرف بڑا وسیع لان موجود تھا۔ مسٹر سام کا شیشے کا کاروبار تھا۔ جب کہ ان کی بیوی جیوڈتھ ایک اسکول میں پڑھاتی تھیں۔

مکان خریدنے کے دو سال بعد ایسے واقعات رونما ہونے لگے جن کی وجہ سے دونوں میاں بیوی کا چین اور سکون ختم ہو کر رہ گیا۔ کبھی ان کا ٹی وی چلتے چلتے خود بخود بند ہو جاتا تو کبھی جیوڈتھ کے کپڑے اور جوتے لان میں پڑے ملتے۔ کوئی چیز رکھی کہیں جاتی اور ملتی کسی اور جگہ سے۔ کبھی گھر کی ساری روشنیاں ایک ساتھ جل اٹھتیں تو کبھی پورا گھر یکایک تاریکی میں ڈوب جاتا..... ایسا بھی ہوتا کہ گھر کا فلش سسٹم ناکارہ ہو جاتا۔ اور سارے گھر میں تعفن پھیل جاتا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد یہ کیفیت بھی ختم ہو جاتی۔ مسٹر سام نے بعد میں بتایا۔

"اس صورتحال کی وجہ سے میں اور میری بیوی بے خوابی کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ ہم نے

بڑے ارمان سے یہ گھر خریدا تھا مگر یہ ہمارے لئے منحوس ثابت ہو رہا تھا۔ ہم شدید اعصابی تھکن کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔"

دونوں میاں بیوی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کا گھر جہاں بنا ہوا ہے اس کے عین نیچے ساٹھ آدمیوں کی قبریں تھیں۔ ان کے پراپرٹی ایجنٹ نے بھی کبھی ان سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ ہوا یہ کہ ۱۹۸۳ء میں انہوں نے گھر کے لان میں ایک طرف سوئمنگ پول بنانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے مزدور بھی بلوا لئے گئے۔ اور لان میں کھدائی شروع ہو گئی۔ اتنے میں ان کے علاقے کا ایک بوڑھا شخص مسٹر سام کے پاس آیا اور بولا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ قبرستان میں کھدائی کر رہے ہیں"؟

"یہ سن کر میں خوف سے گنگ ہو کر رہ گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ بڈھا یونہی ڈرانے کے لئے ایسا کہہ رہا ہے۔ میں نے آس پاس کے لوگوں سے تصدیق کرنا چاہی۔ مجھے ایک دوسرے شخص نے جو اس علاقے میں بچپن سے رہتا آیا تھا اس بوڑھے کی بات کی تصدیق کی۔ معلوم ہوا کہ یہ جگہ پہلے قبرستان تھی جہاں غریبوں کی تدفین کی جاتی تھی۔ اس جگہ کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں آخری تدفین ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی۔ مسٹر سام نے مزید بتایا۔

"میں نے ایک آدمی کو لان کا ایک حصہ کھودنے پر لگا دیا۔ چند گھنٹے کھدائی کے بعد دو تابوت اور انسانی ہڈیاں برآمد ہوئیں۔ میں نے فوراً قبر بند کرنے کا حکم دیا۔ اور ان قبروں کو دوبارہ بند کر کے ان پر مٹی ڈال دی گئی۔ مگر اس کے چند روز نا قابل یقین واقعات کا ایسا سلسلہ چل نکلا جس کے بارے میں آج بھی سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میری بیوی جیوڈتھ سخت خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ ایک بار اس کے کپڑے اور جوتے لان میں ایک قبر پر جسے ہم نے بند کر دیا تھا پڑے ہوئے ملے۔ ہمارا ٹی وی خود بخود چلتا اور بند ہو جاتا تھا۔ گھڑیال وقت بے وقت اپنے بجنے کا مظاہرہ کرنے لگا۔ کال بیل خود بخود بجنے لگتی۔ ہم نے تو خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کبھی ایسا گھر بھی خریدیں گے جہاں چین و سکون کے بدلے خوف اور دہشت کا سامنا کرنا پڑے گا"۔

ان کی پڑوسن کو بھی ایک بار ایسے ہی دہشت ناک واقعے کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ وہ اپنے باورچی خانہ میں کھانا پکا رہی تھی کہ اچانک شیلف پر رکھے ہوئے چینی کے برتن تڑاتڑ گر کر ٹوٹنے لگے۔ پڑوسن نے خوف سے ایک زور کی چیخ ماری۔ تب کہیں جا کر یہ سلسلہ رکا۔ کبھی کبھی دونوں میاں

بیوی کو ایسا لگتا ہے جیسے بہت سے لوگ لان میں دوڑ بھاگ کر رہے ہوں۔ حالانکہ مکان کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔

"ہماری نیند حرام ہو کر رہ گئی۔ جونہی نیند آتی کوئی چیخ یا تیز کھٹکا ہماری نیند کو اڑا لے جاتا۔ ایک بار تو مجھے ایسا لگا جیسے تھوڑی دیر بعد ہمارے کمرے میں انسانی ڈھانچوں کا ہجوم لگ جائے گا۔ خوف کے مارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی کام کرنے سے عاری ہوتی جارہی تھیں..... ہمارا کھانا پینا چھوٹ چکا تھا۔ ہم زندگی کی حقیقی خوشیوں کے لئے ترس کر رہ گئے تھے۔ میری بیوی اکثر روتی رہتی۔ ہم اس امید پر زندہ تھے کہ آنے والا کل ہماری بہتری لے کر آئے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بالآخر ہم نے ۱۹۸۷ء میں اس منحوس مکان کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔"

مکان چھوڑنے کے بعد دونوں میاں بیوی نے اپنے پراپرٹی ایجنٹ پر مقدمہ دائر کر دیا۔ ان کے وکیل نے عدالت کے سامنے یہ ثابت کیا کہ اس مکان کے بارے میں فروخت کے وقت پراپرٹی ڈیلر نے حقائق کو جان بوجھ کر چھپایا۔ جس کی وجہ سے دونوں بیوی نے کئی برس انتہائی خوف کے عالم میں زندگی کے دن گزارے۔ وکیل نے یہ مقدمہ اتنی مہارت سے پیش کیا کہ عدالت میں موجود ہر شخص دونوں میاں بیوی سے انتہائی ہمدردی محسوس کرنے لگا۔ وکیل نے اپنی بات صرف زبانی دلیل سے نہیں بلکہ دونوں میاں بیوی کے ڈاکٹروں کی جانب سے جاری کردہ میڈیکل سرٹیفکیٹ سے بھی ثابت کی۔ ڈاکٹروں کی متفقہ رائے کے مطابق دونوں میاں بیوی کا وزن کم ہوا۔ وہ اعصابی تناؤ کا شکار رہے۔ شدید خوف نے ان پر منفی اثرات مرتب کئے۔ چنانچہ عدالت نے پراپرٹی ایجنٹ کو حکم دیا کہ وہ مسٹر سام اور مسز جیوڈتھ کو ایک لاکھ اڑتالیس ہزار ڈالر کی رقم ادا کرے۔ پراپرٹی ایجنٹ نے اس فیصلے کے خلاف ٹیکساس کی سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی۔ مگر فیصلہ بالآخر میاں بیوی کے حق میں ہوا۔ بعد میں مسٹر سام نے چند اخبار نویسوں کو بتایا۔

"اس مکان میں گزارے ہوئے دن کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی ان بھیانک اور سنسنی خیز یادوں سے ہر قیمت پر پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ اور اس منحوس مکان کے پاس سے گزرنا تو دور کی بات ہے ہم اس گلی سے بھی دور رہنا چاہیں گے"۔

بظاہر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر معلوم ہوا ہے کہ وہ مکان آج بھی یونہی ویران پڑا ہے۔ اور وہاں سے اکثر راتوں کو چلنے پھرنے اور شور کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

موت سے پہلے

مرسلہ: کاشف مظہر

نومبر ۱۹۴۲ء میں اتحادی فوجوں کا بار بردار طیارہ گرین لینڈ کے علاقے میں گر گیا۔ طیارے میں چار افراد سوار تھے۔ طیارے کا کپتان اوہار، لیفٹیننٹ اسپینسر، سارجنٹ پال اور بیٹ۔ طیارہ گرتے ہی وائرلیس پر خطرے کا ایک کمزور سا اشارہ نمودار ہوا اور ایک ہوائی دستہ طیارے کی تلاش میں اڑا۔ تین دن تک ان طیاروں نے چپہ چپہ چھان مارا لیکن گمشدہ طیارے کا کوئی سراغ نہ ملا۔ گرین لینڈ کا یہ علاقہ جہاں طیارہ گرا تھا بالکل ویران تھا اور چاروں طرف برف ہی برف پھیلی ہوئی تھی۔

تباہ شدہ طیارے کے عملہ میں سے پہلے دو افراد کو ہوش آیا تو انہوں نے اپنے دو زخمی ساتھیوں کو اٹھایا اور جہاز کے اندر لے آئے۔ تاکہ سرد ہوا اور برف سے بچاؤ ہو سکے۔ وائرلیس سیٹ ٹوٹ چکا تھا۔ نہ ان کے پاس اسٹوو تھا نہ روشنی کا سامان۔ موسم بے انتہا خراب تھا۔ قطب شمالی کے اس خطے سے یہ سب ناواقف تھے انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جس جگہ یہ حادثہ ہوا ہے وہ جگہ کون سی ہے؟ انہیں معلوم تھا تو صرف یہ کہ اس علاقے میں کسی جگہ ایک امدادی کیمپ تھا۔ جہاں گشتی ٹیمیں ٹہرتی تھیں۔ یہ لوگ تین روز تک امدادی پارٹی کا انتظار کرتے رہے اور اس دوران برف سے گلتی

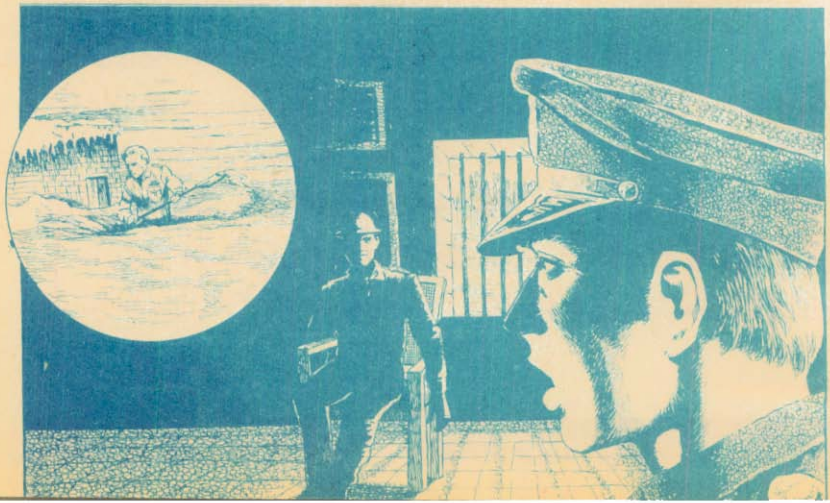

ہوئی انگلیوں سے وائرلیس سیٹ کی مرمت کرتے رہے۔ جب موسم کسی قدر صاف ہوا تو انہوں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ صورت حال بڑی مایوس کن تھی۔ طیارہ برف میں دھنس چکا تھا۔

کپتان اوہار اور لیفٹیننٹ اسپینسر نے فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح پیدل ہی اس جگہ سے نکلا جائے تاکہ بچاؤ کی کوئی تدبیر ہو سکے۔ کپتان اوہار اور لیفٹننٹ اسپینسر نے طویل بحث کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ دونوں امدادی کیمپ کی طرف پیدل جائیں گے اور امداد کے ساتھ واپس طیارہ کی طرف آئیں گے جبکہ سارجنٹ پال اور بیٹ امداد کے آنے کی صورت میں امدادی ٹیم کو ان کی طرف بھیجیں گے۔ آخر یہ عملہ جدا ہو کر اپنے اپنے راستوں کی طرف چلا۔ کپتان اوہار اور اسپینسر امدادی کیمپ کی طرف چلنے لگے۔ چلتے چلتے دونوں شکستہ حال ہو چکے تھے لیکن دونوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آخر کار ان کو امدادی کیمپ کی عمارت نظر آئی وہ دیوانوں کی طرح اس کی طرف دوڑے لیکن عمارت کے اندر پہنچ کر ان کو شدید مایوسی ہوئی کیونکہ وہاں کوئی نہیں تھا۔

اچانک اسپینسر کو ایک خفیہ دروازہ نظر آیا۔ لیکن وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ البتہ وہاں پر ایک جدید قسم کا وائرلیس کا نظام نصب تھا۔ انہوں نے فوراً ہیڈ کوارٹر کو پیغام بھیجنے کی کوشش کی آخر کار تھوڑی دیر کے بعد ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم ہو ہی گیا۔ انہوں نے اپنی پوری داستان سنائی۔ آخر میں ہیڈ کوارٹر سے جواب آیا کہ وہ امدادی ٹیم بھیجنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن موسم خراب ہے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ ان پر بھوک اور مایوسی کے سائے منڈلا رہے تھے دوسری طرف لیفٹیننٹ پال اور بیٹ جہاز میں بیٹھے امدادی ٹیم کا انتظام کر رہے تھے کہ ان کو جہاز کے انجنوں کی آواز سنائی دی وہ دونوں دیوانہ وار باہر کی طرف آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک جہاز ان کے اوپر منڈلا رہا ہے اس جہاز نے ان لوگوں کے لئے امدادی سامان پھینکا۔ تھوڑی دیر کے بعد جہاز آخری چکر لگا کر واپس چلا گیا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ دوسرے دن وہاں پر ایک ہیلی کاپٹر اترا اور ان دونوں کو لے کر اڑ گیا۔ ان دونوں نے ہیلی کاپٹر کے اترتے ہی اس کے پائلٹ کو کپتان اوہار اور اسپینسر کے بارے میں بتایا، لیکن پائلٹ کے منہ سے ان کو یہ سن کر شدید مایوسی ہوئی کہ انہیں ان دونوں کی اطلاع مل چکی ہے مگر وہاں کا موسم شدید خراب ہے وہ وہاں پہنچنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

دوسری طرف کپتان اوہار اور اسپینسر آہستہ آہستہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ رہے تھے کیوں کہ موسم خراب ہونے کی وجہ سے وہ نہ عمارت سے باہر جا سکتے تھے اور نہ کوئی امدادی

ٹیم ان تک پہنچ سکتی تھی۔ اس عمارت کے گودام میں جو بچی کھچی خوراک تھی وہ بھی اب ختم ہو رہی تھی۔ اسپینسر کی حالت شدید خراب ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن عمارت میں خوراک ڈھونڈتے اور ہیڈ کوارٹر کو امدادی ٹیل بھیجنے کے لئے کہتے رہتے۔ آخر ایک رات اسپینسر شدید بیمار ہو کر مر گیا۔ دوسری صبح اوہار نے عمارت کے کمپاؤنڈ میں اسپینسر کو دفن کر دیا۔ اس رات اوہار کو ہر طرف سے وحشت ناک آوازیں آتی رہیں۔ دوسری صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے جسم میں خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی اس نے دیکھا کہ اسپینسر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ شاید اسپینسر زندہ تھا اور وہ اس کو مردہ سمجھ کر دفن کر آیا تھا۔ مگر جب اس نے اس کی نبض ٹٹولی تو وہ رکی ہوئی تھی اور اس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ اس کی لاش کو اٹھا کر کمپاؤنڈ میں لایا تو اس نے دیکھا کہ قبر کھلی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے نیم بے جان ہاتھوں سے اس کو دوبارہ دفن کیا۔ اور واپس عمارت میں آ گیا۔ موسم شدید خراب ہونے کی وجہ سے اس کا رابطہ ہیڈ کوارٹر سے بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی ذہنی حالت شدید خراب ہو گئی تھی۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ اب وہ یہاں سے زندہ حالت میں واپس نہیں جا سکے گا۔

دوسری صبح اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب اس نے دیکھا کہ اسپینسر پھر اس کے سامنے موجود ہے۔ تیسری صبح بھی اس کے ساتھ یہی واقعہ ہوا اس کی یقین نہیں آتا تھا کہ اسپینسر کا مردہ کس طرح قبر پھاڑ کر اس کے سامنے آ سکتا ہے ۲۰ دن بعد جب امدادی شدید مشکلات کے بعد وہاں پہنچی تو کے کمانڈر نے کپتان اوہار اور اسپینسر کو ایک دوسرے کے سامنے بیٹھا ہوا پایا۔ وہ ایک نظر میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں مر چکے ہیں۔ ان دونوں کے قریب ہی اس کو کپتان اوہار کی ڈائری ملی جس میں اس نے تمام واقعات لکھے تھے۔ سب لوگوں کو یہ پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اسپینسر مرنے کے بعد ہر صبح کپتان اوہار کے سامنے موجود ہوتا تھا۔ ٹیم میں موجود ڈاکٹر نے اس معمے کو حل کرتے ہوئے کہا کہ اسپینسر کے مرنے کے بعد رات کو جب کپتان اوہار اکیلا ہوتا تھا تو وہ خوف اور تنہائی سے بچنے کے لئے اسپینسر کو قبر سے نکال کر اپنے سامنے بٹھا دیا کرتا تھا۔ مگر صبح جب وہ اٹھتا تھا وہ یہ بھول چکا ہوتا تھا کہ رات کو خود اس نے اسپینسر کے مردے کو کھود کر نکالا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کچھ لوگ رات کو سوتے میں چلتے ہیں مگر جب وہ صبح سو کر اٹھتے ہیں تو انہیں اپنے رات کے چلنے کے بارے میں کچھ یاد نہیں رہتا۔

ذرا سوچیے ہم میں سے کسی کو اگر ایسی حالت کا سامنا کرنا پڑے تو کیا ہو؟

بچوں کے ادب کیلئے کام کرنیوالی تنظیمیں اور افراد متوجہ ہوں

پاکستان میں بچوں کے ادب کی مختلف جہتوں پر گذشتہ ۴۲ سال سے کام جاری ہے۔ یہ کام جتنا اہم اور دُور رس نتائج کا حامل ہے، اسی قدر غیر مربوط اور غیر مؤثر انداز میں ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں آج تک مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکے۔

یورپی ممالک میں بچوں کے ادب پر اس قدر جدید اور سائنٹیفک انداز میں کام ہو رہا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ شاید یورپی ممالک نے اپنی تمام تر توجہ بچوں کے ادب پر مرکوز کر رکھی ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان میں بچوں کے ادب کی رفتار کا جائزہ لیا جائے تو صورتِ حال کچھ زیادہ خوش کن نظر نہیں آتی۔

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام شعبہ "بچوں کا ادب" اس امر کے لیے کوشاں ہے کہ بچوں کے ادب کو جہاں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں با مقصد اور مفید بنایا جائے، وہیں اسے جدید اور سائنٹیفک انداز میں منظم و مربوط بھی کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے آپ سے درخواست ہے کہ آپ بچوں کے ادب کے حوالے سے اپنی تنظیم کا مکمل تعارف بھجوائیں کہ آپ کی تنظیم کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ کب سے کام کر رہی ہے؟ اور اس تنظیم کے تحت اب تک کیا کچھ کیا جا چکا ہے۔ اگر آپ کسی تنظیم کے بغیر انفرادی طور پر بچوں کے ادب کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں تو اس کی تفصیل سے آگاہ کیجئے کہ یہ کام آپ کب سے کر رہے ہیں۔ کیا کچھ کر چکے ہیں اور مستقبل قریب میں کیا کچھ کرنے کے ارادے ہیں۔

— اپنے جواب سے درج ذیل پتہ پر آگاہ کیجئے۔

شعبہ بچوں کا ادب
دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔
پوسٹ بکس 1485 مرکز جی نائن۔ اسلام آباد

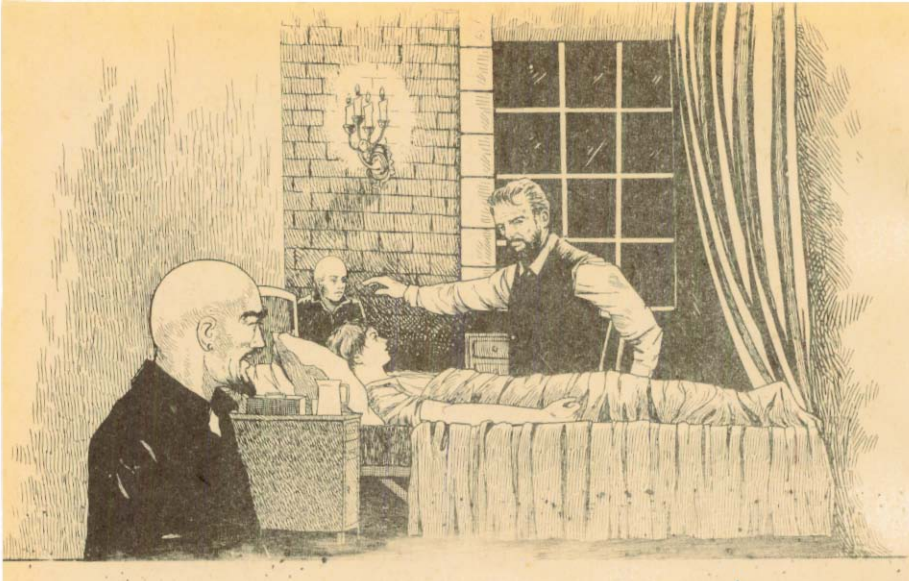

چاندی کا روپیہ

عمران مشتاق

بچوں کے چلے جانے کے بعد ماموں جان نے ۔۔

"ریاض بیٹا ذرا میرے کوٹ کی جیب سے میرا پائپ اور تمباکو کی ڈبیہ تو نکال لاؤ۔" ماموں جان نے ریاض سے کہا وہ گیا تو بھاگا بھاگا لیکن واپس آنے میں کافی دیر لگا دی۔ ادھر ہم لوگ ہیں کہ اس پر تاؤ کھا رہے ہیں کہ کب آئے اور ماموں جان اپنا دلچسپ قصہ شروع کریں۔ ہم لوگ سے مراد میں، نیاز میرا چھوٹا بھائی، شازیہ میری چھوٹی بہن اور فرحت میری کزن ہیں۔ ریاض بھی میرا کزن ہے۔ ریاض اور فرحت ہمارے تایا زاد تھے اور آج کل چھٹیاں گزارنے ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے۔ ماموں جان دراصل ہماری امی کے ماموں تھے لیکن سب انہیں ماموں جان ہی کہتے تھے۔ وہ بے حد دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ عمر اسّی سال سے اوپر تھی مگر مزاج میں نوجوان جیسی شگفتگی اور بچوں جیسی شوخی تھی سر کے بال، ڈاڑھی مونچھوں کے بال حتیٰ کے بھوئیں تک سفید ہو چکی تھیں۔ جھریوں سے بھرے چہرے پر ہمیشہ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ

چھائی رہتی ۔ انہوں نے تقریباً پوری دنیا گھوم رکھی تھی ۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتے تو رات کے وقت ہم سب انہیں گھیر کر بیٹھ جاتے اور ایک مزیدار قصے کی فرمائش شروع کر دی جاتی ۔ وہ کبھی ہماری بات ٹالتے نہیں تھے ۔ ان کے قصے روایتی کہانیوں سے ہٹ کر ہوتے کیونکہ یہ وہ واقعات ہوتے تھے جن سے ماموں جان خود گزر چکے ہوتے تھے ۔ آج بھی ہم ماموں جان کا گھیراؤ کئے ہوتے تھے ۔ سینے تک لحاف لئے سب بستروں میں دبکے ہوئے تھے ۔ جنوری کے شروع کے دن تھے ۔ سردی زوروں پر تھی ۔ "یہ ریاض بھائی بھی عجیب انسان ہیں ۔ تھوڑی دیر کے کام میں گھنٹے لگا دیتے ہیں ۔ " فرحت برا سا منہ بناتے ہوئے بولی ۔ ماموں جان فرحت کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا دیئے ۔ خدا خدا کر کے ریاض کمرے میں داخل ہوا ۔ ایک ہاتھ میں اس نے ماموں جان کے تمباکو کی ڈبیہ اور پائپ پکڑ رکھا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ کی مٹھی بند تھی ۔ اس کے چہرے پر دبے دبے جوش کے آثار تھے "ماموں جان یہ چاندی کا سکہ آپ کے پاس کہاں سے آیا ۔ " وہ بند مٹھی کھولتا ہوا بولا ۔

"ارے یہ تم کہاں سے اٹھا لائے ؟ " انہوں نے تیزی سے ریاض کے ہاتھ پر رکھی کوئی چمکدار چیز اٹھالی ۔ نہ صرف اٹھالی بلکہ جلدی سے اپنی مٹھی مضبوطی سے بند کر لی ۔ "یہ سکہ آپ کے کوٹ کی جیب میں تھا ۔ پائپ نکالتے ہوئے نیچے گر پڑا تھا ۔ میں اٹھا لایا ۔ یہ کیسا سکہ ہے میں نے آج تک چاندی کا سکہ نہیں دیکھا ۔ " ریاض نے بتایا

"ارے عام سا سکہ ہے پاکستان بننے سے پہلے چاندی کے ایسے سکے بھی بطور کرنسی استعمال ہوتے تھے ۔ " وہ ٹالنے والے انداز میں بولے ۔ "ماموں جان ہمیں بھی یہ سکہ دکھائیں ۔ " شازیہ ان کے قریب کھسکتی ہوئی بولی ۔

"ارے اس میں کوئی خاص بات نہیں بس عام سا سکہ ہے تم لوگ دیکھ کر کیا کرو گے ۔ " ماموں جان دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولے ۔ "نہیں دکھائیں ۔ ہم ضرور دیکھیں گے ۔ " سب ایک ساتھ چلا اٹھے ۔

"لو دیکھ لو ۔ تم بھی کیا یاد کرو گے ۔ " انہوں نے ہنستے ہوئے مٹھی کھول دی ۔ سب سے پہلے سکہ میرے ہاتھ لگا ۔ یہ چاندی کا سکہ کافی وزن رکھتا تھا ۔ یہ ایک روپیہ کا سکہ تھا ۔ اور یہ ۱۹۳۸ء کا تھا ۔ باری باری جب سب دیکھ چکے تو چاندی کا یہ روپیہ واپس ماموں جان کے پاس پہنچ گیا

"ماموں جان آپ نے چاندی کا یہ روپیہ اب تک سنبھال کے کیوں رکھا ہوا ہے ؟ " نیاز نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا ۔

"بس ایسے ہی پڑا رہ گیا کوئی خاص بات نہیں۔"

"ماموں جان ایسے تو نہ کہیں۔ کوئی خاص بات تو ہے ورنہ پچاس سال تک کون اتنی چھوٹی سی چیز کو سنبھال کر رکھتا ہے۔" ریاض پرجوش انداز میں بولا۔ ماموں جان گہری نظروں سے ریاض کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

"چاندی کے اس روپیہ کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ وابستہ ہے۔ لیکن میں تمہیں سناؤں گا نہیں ورنہ تم لوگ ڈر جاؤ گے۔" "نہیں ماموں جان ہم ضرور سنیں گے۔" سب ان کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ ماموں جان کافی دیر تک انکار کرتے رہے۔ لیکن کب تک بالآخر انہیں ہار ماننا ہی پڑی۔ اور وہ واقعہ سنانے پر تیار ہو گئے۔ "بھئی اگر تم میں سے کوئی ڈر گیا تو میرا ذمہ نہیں ہو گا۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "آپ واقعہ سنائیں کوئی نہیں ڈرے گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو سنو۔ یہ پاکستان بننے سے کئی سال پہلے کی بات ہے۔ غالباً آٹھ سال دس سال پہلے کی۔ میں اس وقت فیصل آباد میں رہتا تھا۔ اس وقت اس کا نام لائل پور تھا۔ وہ اتنا بڑا صنعتی مرکز بھی نہ تھا جتنا کہ آج کل ہے۔ مجھے ڈاکٹر بنے ہوئے دو یا تین سال ہی ہوئے تھے۔ میں لائل پور کے گورنمنٹ اسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ اس وقت وہاں صرف ایک ہی گورنمنٹ اسپتال تھا۔ میں چونکہ اکیلا تھا اس لئے اسپتال سے قریب ایک مختصر سے مکان میں رہتا تھا۔ جس روز کا یہ واقعہ ہے اس دن سارا وقت بارش ہوتی رہی تھی۔ سیاہ بادلوں نے شام سے پہلے ہی ہر طرف اندھیرا سا پھیلا دیا تھا۔ بار بار بجلی کڑک رہی تھی۔ اور سچ پوچھو تو بجلی کی کڑک میرا دل دہلا دیتی ہے۔ اس دن میں شام سات بجے ہی بستر میں گھس گیا تھا۔ سردی بھی غضب کی پڑ رہی تھی۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی تھی اور اسے پڑھنے لگا تھا۔ پتہ نہیں کس وقت کتاب پڑھتے پڑھتے میں سو گیا۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی کوئی شخص مسلسل دروازے پر دستک دیئے جا رہا تھا۔ میرا دل بستر میں سے نکلنے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا لیکن یہ سوچ کر مجھے اٹھنا پڑا کہ کہیں مصیبت کا مارا کوئی نہ ہو ابھی میں بستر میں سے نکل کر جوتے پہن ہی رہا تھا کہ مسلسل ہونے والی دستک تھم گئی اور میرا دل ایک انجانے خوف سے دھڑک اٹھا۔ جیسے ہی میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آیا حیرت سے میری چیخ نکل گئی۔ بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور دروازے کے پاس بارش میں بھیگتا ہوا ایک سیاہ سایا موجود تھا۔ سائے نے حرکت شروع کی اور پھر وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص نے ایک عجیب و غریب سیاہ لبادہ

سا اوڑھ رکھا تھا۔ وہ لمبے قد کا تھا۔ سب سے عجیب شے اس کا سیاہ چہرہ تھا۔ اسکی آنکھیں بڑی اور بے حد چمکدار تھیں۔ اسکے سر پر بال بالکل بھی نہ تھے۔ جیسے کبھی اگے ہی نہ ہوں۔ مجموعی اعتبار سے وہ ایک خوفناک شخص لگ رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب جلدی چلیں میرا بیٹا بیمار ہے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ میں نے سوچا کہ انکار کر دوں بھلا ایسے موسم میں رات کے وقت کون نکلنا پسند کرتا ہے۔ اچانک میری نظریں اس کی نظروں سے چار ہو گئیں اور میں انکار نہ کر سکا۔ چپ چاپ اپنا میڈیکل بیگ اٹھایا اور اسکے ساتھ ہو لیا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے مجھ پر سحر کر دیا ہو۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا جا رہا تھا اور میں اسکے پیچھے پیچھے اس کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ سرد ہواؤں کے تھپیڑے مجھے کپکپائے دے رہے تھے۔ بارش اتنی تیز تھی کہ میری آنکھیں تک نہیں کھل رہی تھیں۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں زور زور سے جھومتے ہوئے دیو قامت درخت خوفناک عفریت لگ رہے تھے۔ میں نے کئی بار کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن ہر بار زبان رک سی جاتی۔ کافی دیر بعد میں بولنے میں کامیاب ہوا۔

"بھائی صاحب ذرا رکئے ہمیں کتنی دور جانا ہے۔" یہ چند لفظ بڑی مشکل سے میرے منہ سے نکلے تھے۔ وہ مجھ سے کافی فاصلہ پر تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میری بات اس تک پہنچ گئی ہوگی لیکن میں نے اسے رکتے ہوئے دیکھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آیا۔

"کیا بات ہے؟"

"ہمیں کتنی دور جانا ہے۔ میں اب تھک گیا ہوں۔ اور چلا نہیں جاتا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"زیادہ دور نہیں ہے۔ تم تو بہت ہی آہستہ چلتے ہو۔ لاؤ مجھے اپنا ہاتھ پکڑاؤ۔"

یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اچانک میرے ہاتھ کو جھٹکا سا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑے جا رہے ہوں۔ بس ایک عجیب غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ کیفیت کتنی دیر رہی جب اوسان بحال ہوئے تو احساس ہوا کہ ہم اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ایک مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ بجلی ایک بار پھر بڑے زور سے چمکی۔ پل بھر کو ہر طرف روشنی سی پھیل گئی۔ وہ ایک منزلہ بڑی سی عمارت تھی۔ جس پر جلی حروفوں میں درج "محمود

منزل" صاف پڑھا جا رہا تھا۔ اچانک مکان کے اندر سے دل ہلا دینے والی چیخ کی آواز آئی۔ میں پوری جان سے کانپ گیا۔ چیخ کی آواز کے ساتھ ہی بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہاں بھینسوں کا باڑہ تھا۔ عمارت کا دروازہ کھلا اور تھوڑی دیر بعد ہم ایک لمبی سی راہداری میں تھے۔ اور پھر وہ ایک کمرے کے دروازے کے باہر پہنچ کر رک گیا۔ چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی اور میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

"آیئے ڈاکٹر صاحب اندر آیئے۔ میرا بیٹا تکلیف سے بری طرح تڑپ رہا ہے۔" وہ دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔ میں اندر داخل ہوا سامنے ہی چارپائی پر ایک بچہ پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سخت تکلیف میں ہے۔ بچے کی عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اسکی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ مڑے ہوئے سے تھے سارا جسم کانپ رہا تھا یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ دورے کی کیفیت میں ہو۔

"ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے کے دوست کو بچا لیجئے۔ میرا بیٹا اسے بہت محبت کرتا ہے"

"کیا مطلب کیا یہ تمہارا بیٹا نہیں؟" اس کی بات سن کر میں حیرانی سے بولا۔

"نہیں یہ میرا بیٹا نہیں پر میرے بیٹا جیسا ہی ہے۔ میرا بیٹا تو وہ ہے۔" اس کے اشارے پر پہلی بار میں نے غور سے دیکھا بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ اسکی شکل بالکل اپنے باپ جیسی ہی تھی حتیٰ کہ وہ گنجا بھی تھا۔ مجھے وہ بچہ بڑا خوف ناک لگا۔ لیکن جس بات نے مجھے بہت متاثر کیا وہ اس بچے کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو تھے۔ اپنے دوست کی بیماری پر وہ بہت غمزدہ تھا۔ کچھ دیر معائنہ کرنے کے بعد میں مرض کی نوعیت سمجھ چکا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بچے کے جسم پر کئی زخموں کے نشانات تھے۔

"ایک گلاس پانی چاہیئے بچے کو دوا دینی ہے۔" میں نے مریض پر سے نظر اٹھائے بغیر کہا۔ چند لمحوں میں کسی نے پانی کا گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ جیسے ہی میں نے نظر اٹھا کے دیکھا حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ پانی کے گلاس والا ہاتھ بری طرح کانپنے لگا۔ ڈر کے مارے میری تو گھگھی بندھ گئی۔ وہ بچہ اسی طرح دیوار کے ساتھ لگ کے بیٹھا ہوا تھا اور مجھے پانی کا گلاس دے کر اسکا ہاتھ واپس جا رہا تھا۔ دیوار سے چارپائی کا فاصلہ کم سے کم دس فٹ ضرور تھا۔ بچے نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے مجھے گلاس پکڑا دیا تھا۔ اسکا ہاتھ دس فٹ سے زائد لمبا ہو گیا تھا۔

"یاخدایہ میں کس شیطانی چکر میں پڑ گیا۔" میرا سارا جسم بری طرح کانپنے لگا۔ اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈر کے مارے ایک زور دار چیخ میرے حلق سے آزاد ہو گئی۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ آپ اپنے مریض کا علاج کریں۔" اجنبی مجھ سے کہہ رہا تھا اس کے چہرے پر ایک دوستانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس بچے کا علاج میں نے کیا یا نہیں۔ وہ بچہ زندہ رہا یا نہیں۔ یہ سب باتیں مجھے یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ اس نے مجھے چاندی کا روپیہ دیا اور اس کے ساتھ ایک شرط بھی عائد کی۔ جب میری آنکھ کھلی تو صبح کا وقت ہو رہا تھا۔ میں اپنے بستر میں پڑا ہوا تھا اور میرا سارا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے پر میرے سرہانے پڑا ہوا چاندی کا روپیہ اس کی تردید کر رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد میں تین چار دن تک سخت بخار کی حالت میں رہا۔ ٹھیک ہونے کے بعد میں پھر اسپتال جانے لگا اور میں نے کسی سے اس واقعے کا ذکر نہیں کیا۔" ماموں جان خاموش ہو گئے اور میں گویا چونک اٹھا۔ ماموں جان کے قصے کے سحر نے سب کو گویا جکڑ لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نیاز، شازیہ اور فرحت تینوں سو چکے تھے صرف میں اور ریاض جاگ رہے تھے۔ "ماموں جان پھر کیا ہوا؟" ریاض نے پوچھا۔ "ارے بھئی قصہ ختم ہو گیا۔" ماموں جان ہنستے ہوئے بولے۔

"ماموں جان قصہ ختم نہیں ہوا۔ میرا تو خیال ہے قصہ اب شروع ہو گا۔" ریاض کے بولنے سے پہلے میں بول پڑا۔

"بھئی تم لوگ بڑے چالاک ہو۔ تمہیں پورا واقعہ سننا ہی پڑے گا۔ چلو یہ بھی اچھا ہے کہ چھوٹے تینوں سو گئے ورنہ وہ لوگ اس بات کا کچھ اچھا اثر نہ لیتے۔ اچھا تو خیر سنو۔" وہ کہنے لگے۔

"اس واقعے کو تین سال بیت گئے ایک دن ایک کام کے سلسلے میں مجھے جھنگ جانا پڑا یہ لائل پور سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ کام سے فارغ ہو کر میں ٹہلتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔ اچانک میں ٹھٹک کے رک گیا۔ میں پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دو منزلہ عمارت "محمود منزل" ہی تھی۔ عمارت کے سامنے بھینسوں کا باڑہ تھا۔ "تو کیا اس رات میں نے لائل پور سے جھنگ تک کا سفر کیا تھا اور وہ بھی پیدل ناممکن۔" مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایسا بھلا کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص پچاس میل کا فاصلہ رات بھر میں دوبار پیدل طے کرے۔" میری عقل اس بات کو نہیں مانتی

تھی۔ "کسی سے کچھ پوچھنا چاہئے شاید "محمود منزل" کے بارے میں کوئی ایسی بات کا پتہ چل جائے جس سے یہ اسرار حل ہو سکے۔" یہ سوچ کر میں بھینسوں کے باڑے کی جانب بڑھ گیا۔ اندر ایک پہلوان نما شخص سے ملاقات ہوئی۔

"بابو جی کتنا دودھ چاہئے۔" مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً بولا۔

"مجھے دودھ نہیں چاہئے صرف آپ سے کچھ معلومات چاہئیں۔ میں محمود منزل کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ شاید یہ عمارت خریدنا چاہتے ہیں۔ پر جی اسے ہرگز نہ خریدنا یہ تو آسیب زدہ ہے۔ اس میں بھوت رہتے ہیں۔" وہ اپنے ٹھیٹ لہجے میں بولا۔

"آسیب زدہ ہے۔" میرے کان کھڑے ہوئے۔

"ہاں جی" وہ اپنی ہی رو میں بولا

"ادھر یہ عمارت تو کئی سالوں سے بند پڑی ہے جی کوئی اس میں نہیں آتا۔ سب اس میں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ دو تین بندے اندر گئے تھے جی پر وہ چیخیں مارتے ہوئے باہر آئے تھے پھر کوئی اندر نہیں گیا۔ پر جی ایک بچہ تھا صفدر یہی کوئی دس بارہ سال کا۔ اب تو دو تین سال سے اس کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اس عمارت میں رہنے والا ایک بچہ اس کا دوست بن گیا ہے۔ وہ روز اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اسے اچھی اچھی چیزیں دیتا ہے۔ سب اس کی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے پر میں آپ کو بتاؤں جی میں نے کئی بار اس کے پاس کھانے پینے کی ایسی چیزیں دیکھی تھیں جو وہ خود خرید نہیں سکتا تھا۔ وہ بن ماں باپ کا بچہ تھا۔ اپنے چاچا چاچی کے پاس رہتا تھا۔ وہ اس ننھی جان پر بہت ظلم کرتے تھے۔ سب نے سمجھایا جی پر وہ دونوں باز نہیں آتے تھے اس سے گھر کا سارا کام کراتے تھے نہ کرنے پر بیچارے کو خوب مارتے تھے۔ وہ اکثر روتا ہوا "محمود منزل" کی طرف چلا جاتا تھا۔ ہم لوگ اسے روکتے تھے کہ ادھر مت جاؤ کسی دن تمہیں بھوت ووت کھا جائیں گے پر وہ ہماری نہیں سنتا تھا۔ ایک دن اس کی چاچی نے اسے بہت مارا وہ روتا ہوا کہیں چلا گیا اور آج تک اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ جس دن وہ گیا تھا اس دن "محمود منزل" سے بڑی ہی دردناک چیخوں کی آواز آئی تھی۔ کئی دن تک یہ آوازیں آتی رہیں۔ ہم سب کی تو راتوں کی نیندیں تک حرام ہو گئی تھیں۔ وہ تو ایک دن بڑی گرج گرج کے بارش ہوئی تھی اس دن کے بعد پھر کبھی آوازیں نہیں آئیں۔" پہلوان سے پتہ لے کر میں

صفدر کے چاچا کے گھر گیا لیکن انہیں نے بھی یہ ہی بتایا کہ تین سال سے صفدر غائب ہے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں۔ تو یہ تھا تمہارا سارا قصہ۔ " ماموں جان اپنا بجھا ہوا پائپ دوبارہ سلگاتے ہوئے بولے۔

"قصہ تو ختم ہو گیا لیکن آپ نے چاندی کے روپیہ کے بارے میں شرط والی بات تو بتائی ہے نہیں۔" میں نے کہا۔ "نہیں بھئی وہ بات بتائی نہیں جا سکتی تم لوگ ضد نہ کرو۔" ہم نے ضد کی اور نہ صرف یہ کہ ضد کی بلکہ ایسی ضد کی ماموں جان کو شرط ختم کرنی پڑی۔

"تم لوگ میرا نقصان چاہتے ہو۔ اور تمہیں اس بات کا پتہ بھی نہیں ہے۔ چلو خیر آج آزما لیتے ہیں کہ اس شخص نے چاندی کے روپیہ کے بارے میں سچ کہا تھا یا جھوٹ۔" ماموں جان منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولے۔ "مجھے چاندی کا روپیہ دیتے ہوئے اس نے کہا کہ اس روپیہ کو ہمیشہ سنبھال کر رکھنا تم جب بھی اس سے کوئی چیز خریدو گے۔ تو یہ دکاندار کے پاس نہیں رہے گا۔ واپس تمہاری جیب میں پہنچ جائے گا۔ تم کبھی اس روپیہ کو خرچ نہ کر سکو گے۔ یہ ہمیشہ واپس تمہاری جیب میں آ جایا کرے گا۔ بس شرط کی پابندی کرنا ہو گی۔"

"پھر تو ماموں جان آپ نے تو اس چاندی کے روپیہ کی مدد سے بہت ساری چیزیں بن مول خرید لی ہوں گی۔" ریاض پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"نہیں میں نے ایسا نہیں کیا۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے ساتھ اتنا عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا کہ میں اس سکے سے ڈرنے لگا تھا۔ دوسرا اس بات کا خوف تھا کہ اگر اس کی بات صحیح ہوئی تو خواہ مخواہ کسی غریب دکاندار کا نقصان ہو جائے گا۔ اس لئے میں نے اس سکے کو چلانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اور ایک بات کہوں اس نے سکے کے بارے میں بالکل سچ کہا تھا۔" آخر میں ماموں جان کا لہجہ عجیب پراسرار سا ہو گیا۔

"کیسا سچ" میں رہ نہ سکا۔ "اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے کسی کو چاندی کے روپیہ کی حقیقت بتائی تو یہ سکہ میرے پاس نہیں رہے گا میرے پاس سے غائب ہو جائے گا۔ اور اس نے سچ کہا تھا۔" یہ کہتے ہوئے ماموں جان نے ہاتھ کی بند مٹھی کھول دی۔ چاندی کا سکہ ان کی مٹھی میں سے غائب ہو چکا تھا۔ حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہم سکہ ان کے ہاتھ میں دیکھ چکے تھے۔

سب کے سو جانے کے بعد ماموں جان نے اپنے بستر پر سے چاندی کا روپیہ اٹھایا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائے "اب مجھے اس سکے کو کہیں چھپانا پڑے گا ورنہ بچے آئندہ کبھی میری کہانیوں اور قصوں پر یقین نہیں کریں گے۔"

سوچئے تو!!

خدانخواستہ جان پر بن آئے
اور خون کے بنا کوئی چارہ نہ ہو

ایسے میں
خون نہ ملے تو کیا ہو

؟

آج آپ
کسی کو خون کا عطیہ دیجئے
کل کوئی
آپ کے کام
آئے گا

انجانی بلا

اے زیڈ عالمگیر

بالآخر انجانی بلا اُسے ریل سے گرانے میں کامیاب ہوگئی

یہ ۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے۔ میں اس وقت آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔ ہم تقریباً دو میل کا فاصلہ پیدل طے کرکے گورنمنٹ ہائی سکول کھیوڑہ میں پڑھنے کے لئے جاتے تھے۔ میرا ایک دوست گلزار بھی میرے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

اس دن تفریح کی گھنٹی بجتے ہی گلزار نے مجھ سے کہا کہ "میری طبیعت سخت خراب ہے اس لئے میں چھٹی کر رہا ہوں۔ انچارج صاحب کو میرے بارے میں بتا دینا۔"

"کیوں خیریت تو ہے؟ کیا ہوا تمہیں؟" میں نے گلزار سے پوچھا۔

"بس یار کچھ نہ پوچھو۔" یہ کہتے ہی وہ قریبی ریلوے اسٹیشن چلا گیا، اور میں خان بابا سے چھولے کھانے میں مصروف ہو گیا۔

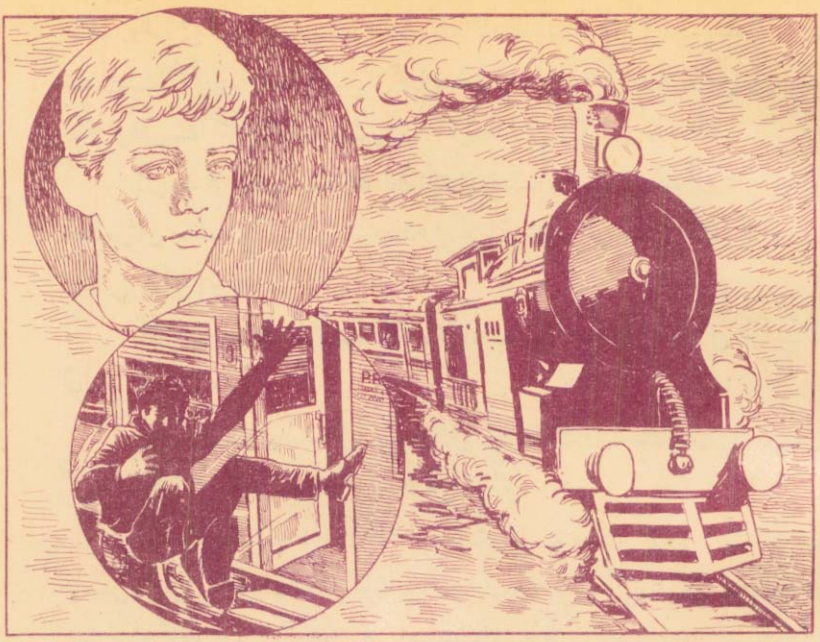

اس اثنا میں ہمارے کلاس انچارج کسی کام سے باہر نکلے۔ میں فوراً ان کے قریب پہنچا اور کہا۔

"سر! وہ گلزار کی طبیعت خراب تھی اس لئے وہ چھٹی کر گیا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" وہ شاید زیادہ جلدی میں تھے۔

میں نے ان کے پیچھے تقریباً بھاگتے ہو کہا "سر! اس کی رخصت لگا دیجئے گا

"اچھا بھئی ٹھیک ہے۔" یہ کہنے کے بعد وہ چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد تفریح بند ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ تمام لڑکے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے تفریح کے بعد تمام پیریڈ میں نے بڑی بے دلی سے پڑھے۔ آخری پیریڈ خالی تھا۔ لڑکے آپس میں کھیل کود رہے تھے۔ لیکن میں اداس سا ایک طرف بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں آج میرا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

تین بجے چھٹی کی گھنٹی بج گئی۔ تمام لڑکے گیٹ کی جانب بھاگے۔ میں بھی تیزی سے باہر

بھاگا۔ کیونکہ ریل گاڑی بھی تین بجے ہی ہمارے قصبے ڈنڈوت کے لئے چلتی تھی۔ اس لئے میں تیزی سے ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگا۔ ریل گاڑی نے زور دار سیٹی بجائی اور پھر دوسری سیٹی کے ساتھ ہی اس نے اسٹیشن چھوڑ دیا۔ میں بڑی مشکل سے ریل گاڑی میں سوار ہو سکا۔

میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو پچھلے ڈبے کے دروازے میں مجھے گلزار نظر آیا۔ وہ بہت پریشان سا لگ رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا، اور جواباً اس نے بھی ہاتھ ہلایا۔

گاڑی ہمارے قصبے کے قریب پہنچ چکی تھی اور اب اپنے قصبے کا بڑا قبرستان بھی نظر آنے لگا تھا۔

یہاں ریلوے لائن کے بالکل نزدیک پہاڑی مٹی کے اکھٹے ہونے سے ایک پٹڑی سی بنی ہوئی تھی جو کہ بالکل ریل گاڑی کے پائیدانوں سے چل رہی تھی۔

اچانک میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گلزار دروازے کے اندر جانے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن کوئی انجانی قوت اسے باہر کی جانب کھینچ رہی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جو کہ میں کبھی بھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ اور اچانک گلزار لڑکھڑاتے ہوئے دروازے سے باہر جا گرا۔ ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور وہ پہاڑی ڈھلوان نما پٹڑی پر جا گرا۔ اسی لمحے پچھلے ڈبے کا پائیدان گلزار کے سر پر جا لگا۔ اور وہ پٹڑی سے پھسلتے ہوئے ریلوے لائن کے درمیان جا گرا۔ اور اس کے آگے میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیخ بلند ہوئی اور پھر گاڑی کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اور گاڑی رک گئی

چند اور لوگ بھی اس منظر کو دیکھ رہے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ لڑکا پاؤں پھسلنے کی وجہ سے گاڑی کے نیچے آ گیا ہے۔ لیکن میں اپنے دوست کی انجانی طاقت کے خلاف کشمکش کبھی بھی نہیں بھول سکتا نہ جانے وہ کیا بلا تھی جس نے میرے دوست کو گاڑی کے نیچے پھینک دیا۔ اس دن کے بعد میں نے ریل گاڑی کا سفر چھوڑ دیا ہے۔

اب جب بھی مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو بے اختیار میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

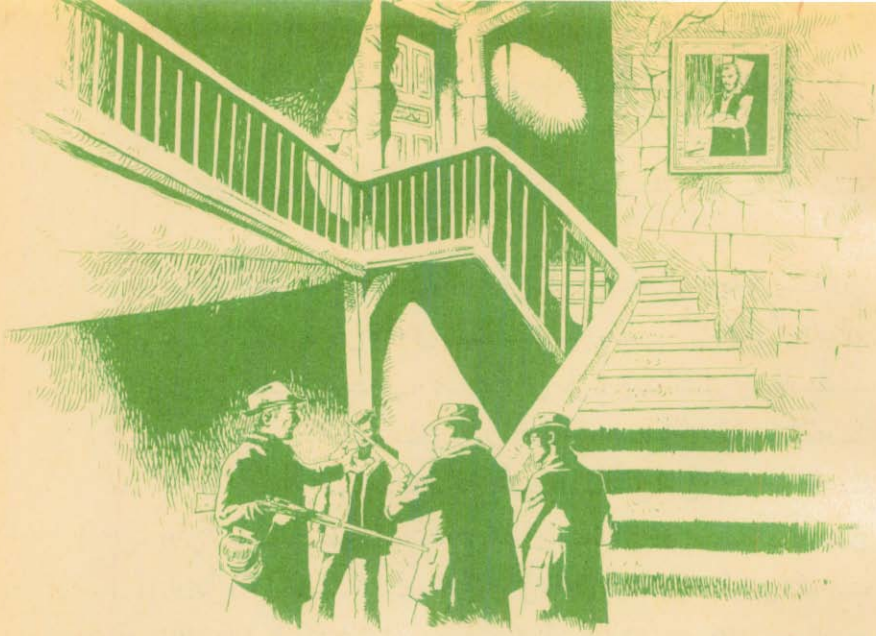

بھوت حویلی

سید کاشان جعفری

اُس حویلی کی داستان جس میں بھوتوں سے زیادہ خطرناک مخلوق آباد تھی

منصور نگر کے چودھری عظمت اللہ صاحب میرے بچپن کے ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میں تو ملازمت کر کے کراچی کے ہنگاموں میں گم ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے اپنی زمینداری سنبھال لی۔ ایک دو مربع زمین نہیں، پورا منظر نگر ان کا تھا.....

جب کبھی وہ کراچی آتے تو بچپن کی دوستی کے ناطے میرے یہاں ہی قیام کرتے۔ یوں انہوں نے یہاں بھی اچھا خاصا اپنا حلقہ احباب بنا لیا تھا۔ میرے چند دوستوں سے تو ان کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔

گزشتہ سال موسم سرما کی بات ہے۔ چودھری صاحب حسب عادت کراچی تشریف لائے۔ مگر بڑی تبدیلی کے ساتھ..... پہلے دن تو کسی نے بھی اس تبدیلی کو محسوس نہ کیا، سوچا، شاید سفر کی تکان

ہوگی..... مگر جب دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی حال رہا تو سب کو فکر ہوئی..... وقار نے آخر سوال کر ہی ڈالا۔

"چودھری صاحب..... خیریت تو ہے..... اس بار بہت بدلے بدلے سے نظر آرہے ہیں۔"

جواب میں عظمت نے کہا: "کیا آپ لوگوں کو آج کے ترقی یافتہ دور میں جن بھوتوں کے وجود پر یقین ہے.....؟" پھر اپنے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے..... "کچھ عرصہ قبل تک خود میرا بھی یقین یہی تھا کہ جن بھوت سب واہمہ ہے مگر اسی سال مارچ کے مہینے میں ایک حادثے نے میرا یہ یقین چھین لیا۔" عظمت اللہ نے اپنی دونوں ٹانگوں کو آرام سے پھیلا کر تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "منصور نگر کے اطراف کا سارا علاقہ تمام جنگلات میرے اچھی طرح دیکھے، بھالے ہوئے ہیں۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک وہیں شکار کھیلا ہے۔ اس دن میرے ساتھ میرے چچا اور تایا زاد بھائی وسیم اور عارف بھی تھے۔ ہم تینوں کئی گھنٹوں سے شکار کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ اچانک ہماری نظر ایک ساتھ سنہرے رنگ کے ہرنوں کے جوڑے پر پڑی..... وہ ہم سے تھوڑے ہی فاصلے پر دھوپ میں چر، چگ رہے تھے..... دھوپ میں ان کی کھال سونے کی طرح دمک رہی تھی..... ہم نے انہیں شکار کرنے کے بجائے زندہ پکڑنے کی سوچی، اور کمند کا پھندا بنا کر گھوڑوں کا رخ ان کی طرف پھیر دیا۔ وہ شاید بہت ہی چوکنے تھے..... جیسے ہی ہمارے گھوڑوں کا رخ اس طرف ہوا، وہ خطرے کی بو سونگھتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے..... اب آگے، آگے ہرنوں کی جوڑی..... اور پیچھے پیچھے ہم گھوڑوں پر سوار....."

عظمت بولتے بولتے رک گئے پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "یار کافی تو پلواؤ..... قصہ کافی طویل ہے....." میں نے ملازم سے کافی لانے کیلئے کہا، عظمت نے دوبارہ بولنا شروع کیا: "ہم لوگوں کو ہرن کے اس جوڑے کا پیچھا کرتے ہوئے سمت کا بھی دھیان نہیں رہا۔ اچانک سامنے قد آدم جنگلی گھاس کے جھنڈ میں اس جوڑے کو غائب ہوتے دیکھا۔ پھر بھی ہم گھوڑوں کو آہستہ آہستہ آگے بڑھاتے ہوئے اس جھنڈ کے قریب پہنچ گئے۔ قریب پہنچ کر میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی..... میں نے دیکھا کہ اس قد آدم گھاس کے جھنڈ میں کسی شاندار حویلی کے کھنڈر دور تک پھیلے ہوئے ہیں اور اب میں ہرن کے اس جوڑے کو تو قطعی بھول گیا اور اس حویلی کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق بڑھ گیا۔

ہم تینوں نے اپنے، اپنے گھوڑے وہیں چھوڑ دیئے۔ تاکہ وہ ستالیں اور پھر جھنڈ میں راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ حویلی مغل طرز تعمیر کا نمونہ ہے اور برسوں کے موسموں کا مقابلہ کرتے ہوئے جگہ جگہ سے بری طرح ٹوٹ، پھوٹ گئی ہے۔ ایک جگہ ایک بڑے سے ستون کے قریب سنگ مرمر کی ایک تختی لگی تھی جس پر عربی رسم الخط میں نواب خورشید عالم اور سن تعمیر ۱۷۵۱ء کندہ تھا۔ خورشید عالم کے نام پر مجھے یاد آیا کہ ان کا نام ہمارے شجرے میں درج ہے۔ اب مجھے اس کھنڈر سے اور بھی دلچسپی ہو گئی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسی حویلی کے کھنڈر آپ کے ہی خاندان کے تھے....." ارسلان نے سوال کیا۔

"ہاں یہی بات تھی۔ جس نے مجھے وہاں رکنے پر مجبور کر دیا اب میں بہت ہی آہستگی اور دلچسپی کے ساتھ ہر ہر چیز کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے عم زاد اور تایا زاد بھائی پیچھے پیچھے ساتھ چل رہے تھے..... میں نے دونوں نے اپنی بندوقیں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی.....، اور وہ کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ ٹوٹی، پھوٹی، بوسیدہ دیواروں سے اب بھی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ تھا..... ایک وسیع و عریض صحن عبور ہم ایک بڑے ہال نما کمرے میں پہنچے اس میں دائیں، بائیں دو سرنگ نما راستے تھے جو غالباً حویلی کے اندرونی حصوں تک جاتے ہوں گے۔ میں وہیں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ ان میں سے کسی سرنگ کے ذریعے اندر جایا جائے کہ وسیم کی دردناک چیخ نے میرے ہوش و حواس اڑا کر رکھ دیئے۔ میں نے پیچھے مڑ کر اس طرف دیکھا جہاں وسیم کھڑا میری طرح مدد کے لئے چیخ رہا تھا..... اف میرے خدا..... وہ منظر! حویلی کی دیوار پر آویزاں کسی شخص کی تصویر کے دونوں ہاتھوں نے فریم میں سے نکل کر وسیم کی گردن کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ میں نے فوراً شانے سے لٹکی ہوئی اپنی شکاری بندوق اتاری، اور ہاتھوں میں تھام کر تصویر کا نشانہ لیا اور اس پر پورا راؤنڈ خالی کر دیا۔ اس جگہ اگر شیر بھی ہوتا تو یقیناً اس کے پرخچے اڑ گئے ہوتے، مگر وہاں تو صرف اور صرف دیوار میں گولیوں کے نشانات نظر آ رہے تھے..... تصویر میں سے نکلنے والے ہاتھ نجانے کہاں غائب ہو چکے تھے۔ اب دیوار پر وہی تصویر اپنی جگہ ویسے ہی لٹکی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اچانک ایک انجانے قسم کے خوف سا احساس ہوا، میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے پھر مجھے ایسا محسوس ہو، گویا وہ تصویر ہمیں ٹکٹکی لگائے گھور رہی ہو..... اور یہ کہہ رہی ہو

کہ بھاگ جاؤ، یہاں سے۔ فوراً بھاگ جاؤ۔ وسیم کی حالت تو خوف کی وجہ سے بہت زیادہ خراب تھی وہ بار بار اپنی گردن مل رہا تھا۔ میں نے وسیم اور عارف کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ ہمیں محسوس ہو رہا تھا گویا کوئی نادیدہ چیز ہمیں بھاگتے دیکھ کر ہماری بزدلی پر دل کھول کر قہقہے لگا رہی تھی۔"

ہم سب حیرت کی تصویر بنے بڑی خاموشی سے چودھری صاحب کی باتوں کو سن رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں ان کے ہی بولنے کی آواز گونج رہی تھی..... وہ ذرا توقف کرتے تو پھر ہماری اپنی ہی سانسوں کی آوازیں ہماری سماعت سے ٹکرانے لگتیں۔ ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ اسی واقعے کو سنانے کے بعد وہ کچھ اور زیادہ خاموش ہو گئے تھے۔

اگلے روز منصور نگر واپس جاتے ہوئے انہوں نے ہم سب کو منصور نگر آنے اور واقعات کا خود مشاہدہ کرنے کی دعوت دی۔

منصور نگر کے پروگرام سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن دوستوں کے اصرار کے آگے میری ایک نہ چلی۔ منصور نگر کی تمام تفصیلات طے کر لیں گئیں۔ اور یوں جنوری کی ایک صبح ہم منصور نگر کی حدود میں داخل ہو گئے۔ پنجاب تو یوں بھی اپنی زرخیزی اور سبزہ زاری کے لئے مشہور ہے۔ مگر منصور نگر کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ہرے، بھرے سرسبز شاداب گھنے جنگل۔ دلکش وادیاں۔ میٹھے پانی کے چشمے منصور نگر کا سارا علاقہ ہی پکنک اسپاٹ تھا۔ منصور نگر کی شمالی حدود کے ساتھ ہی بنے ہوئے خوبصورت، آرام دہ اور عالیشان ریسٹ ہاؤس میں ہم چار دوستوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ جا اترا تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد طے یہ ہوا کہ لنچ وہیں کیا جائے اور پھر آرام، وہیٹ پوجا سے فارغ ہو کر دو، ڈھائی بجے تک کھنڈرات کی طرف روانہ ہوا جائے۔

سردیوں کے دن تھے..... اور سنہری دھوپ بڑی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ سارے سامان اور کیل کانٹوں سے لیس ہو کر جیپ میں سوار ہوئے ہی تھے کہ نجانے ایک بلی کہاں سے آکر عین جیپ کے سامنے کودی اور اٹھ کر ایک طرف کو بھاگ گئی..... ارسلان جو ہم میں بے حد توہم پرست ہے بولا۔ "لو ہو گیا، ستیاناس۔ یہ بد شگونی ہے..... ہمیں اپنا پروگرام آج کے دن ملتوی کر دینا چاہئے....."

"کیا، ستیاناس ہو گیا.....؟ کیا بد شگونی ہے..... کیوں آج پروگرام ملتوی کر دیا جائے"۔ شہباز

تیز لہجے میں آنکھیں نکال کر بولا..... "وہ کالی بلی راستہ کاٹ گئی ہے نا" ..... ارسلان نے دھیرے سے کہا۔ "بلی ہی تو ہے۔ اس سے کیا ہوتا۔ یہ سب تو ہم پرستی کی باتیں ہیں....." شہباز نے قدرے برہمی سے کہا۔ اور خود اچک کر پھرتی سے جیپ میں بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے جیپ کو اسٹارٹ کرنا چاہا، مگر وہ گرر رکی آواز کر کے رہ گئی۔ ڈرائیور نے پھر کوشش کی ..... دوبار، تین بار چار بار۔ آخر وہ بھی جھنجلا گیا۔ ادب سے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "صاحب انجن شاید ٹھنڈا ہو گیا ہے ..... ذرا آپ لوگ نیچے اتر کر تھوڑی دور تک دھکا لگائیں۔"

"دوسری بدشگونی....." ارسلان نے زیر لب اپنے آپ سے کہا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میری زبان سے کھنڈرات کی طرف جانے کی گفتگو سن کر ریسٹ ہاؤس کا گونگا چوکیدار بری طرح چونکا تھا۔ اور اس کے چہرے پر ناگواری کے سے اثرات نمایاں ہوئے تھے۔ شائد اسے ہمارا اس طرف جانا پسند نہیں تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ جیپ اسٹارٹ ہو گئی..... ہم سب تیزی سے دوڑ کر اس میں سوار ہو گئے۔ جیپ میں بیٹھنے کے بعد میری نظر اسی گونگے چوکیدار پر پڑی جو ریسٹ ہاؤس کی چھت پر کھڑا ہمیں جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

ہماری جیپ بڑے پر فضا مقام سے گزر رہی تھی۔ موسم سرما میں ہجرت کر کے آنے والے ٹھنڈے برفیلے سرد علاقوں کے پرندے۔ مرغابیاں، جنگل کے حسن میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔ اچانک میری نظر ارسلان کی طرف اٹھی وہ سر جھکائے بیٹھا خود کلامی کے سے انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ یہ اس کی اپنی عجیب سے فطرت ہے، جب کبھی کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہو تو یہی کیفیت ہو جاتی ہے اس کی..... جس وقت میں اس کی طرف متوجہ ہوا، وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

"اللہ خیر کرے..... آغاز ہی دو، دو بدشگونیوں سے ہوا ہے۔"

جب ہماری جیپ گھنے جنگل میں داخل ہوئی تو ہمارے دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی..... ہمیں یوں محسوس ہوا گویا جنگل میں دور کہیں بہت سارے کتے مل کر ایک ساتھ رو رہے ہوں اور اسی کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکہ ہوا، ہماری جیپ چند فٹ تک لڑکھڑائی اور پھر رک گئی۔ ڈرائیور نے کہا۔ ٹائر پنکچر ہو گیا۔ پہیہ تبدیل ہونے کے بعد اب جیپ پھر آگے بڑھ رہی تھی۔ جوں، جوں ہم آگے بڑھتے جاتے ویسے، ویسے جنگل اور گھنا ہوتا جاتا۔ نصف گھنٹے بعد کھنڈرات کے سامنے تھے۔ حویلی

کے کھنڈرات پر، پر ہول سناٹا طاری تھا...... اس کی ویرانی اور سناٹا دیکھ کر لمحے بھر کے لئے تو ہم چاروں ہی لرز کر رہ گئے۔ لیکن شہباز کو نہ جانے کیا ہوا کہ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا حویلی میں داخل ہو گیا۔ ہم سب اسے کورس کے اندازی میں رک جانے اور تنہا اندر جانے سے روکنے کے لئے آوازیں ہی دیتے رہ گئے ہماری آواز کے جواب میں کچھ کہنا تو دور۔ اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اب ہمارے لئے وہیں کھڑے رہ کر اس کا انتظار کرنا بیکار تھا۔ ہم سب ہی تیزی سے اندر جانے کے لئے آگے بڑھے۔ اوپر سامنے ایک بڑا وسیع صحن تھا۔ اور اس کے تین اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ نجانے شہباز ان میں سے کس کمرے میں داخل ہوا تھا؟۔ حویلی کی بوسیدہ دیواریں زمانے اور موسموں کے اثرات سے لڑتے، لڑتے سیاہ پڑ چکی تھیں کچھ کمرے ایسے بھی تھے جن کے دروازے بند تھے اور کنڈیوں میں زنگ آلود تالے پڑے نظر آرہے تھا۔ اس وقت خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا اچانک ہمارے کانوں سے شہباز کی چیخیں ٹکرائیں۔ گھٹی، گھٹی سی چیخیں...... جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ وقار نے جلدی سے اپنا جدید چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگایا۔ اس چشمے کی خصوصیت یہ تھی کہ اسے آنکھوں پر لگا کر اندھیرے میں بھی بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ وقار مشرقی سمت میں بنے ہوئے ایک کمرے کی طرف تیزی سے بڑھا میں نے اپنی ٹارچ پر گرفت مضبوط کی اور اسے آن کر کے وقار کے پیچھے لپکا۔ وہ ایک ہال نما کمرے تھا...... اندر دیوار پر کئی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ وہی ہال تھا جس کا ذکر چودھری عظمت اللہ نے کیا تھا۔ اچانک ہم دونوں کی نظریں فرش پر بے سدھ پڑے ہوئے شہباز پر پڑی۔ ہم فوراً لپک کر اس کے پاس پہنچے۔ وقار نے جھک کر اس کی نبض ٹٹولی اور پھر کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ شہباز صرف بیہوش ہوا ہے۔"

ہم دونوں شہباز کو ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے باہر کھلے صحن میں آئے۔ اسے قدرے سپاٹ سی جگہ پر لٹایا۔ اب ہمیں ارسلان کا خیال آیا، جسے ہم وہیں صحن میں چھوڑ کر اندر گئے تھے۔ وہ کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ یہ ہمارے لئے نئی پریشانی تھی۔ شام کے پھیلتے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ میں نے اپنی ریسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ وہ پانچ بجا رہی تھی...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ نصف گھنٹے کے اندر، اندر پورے ماحول پر اندھیرے کی سیاہ چادر چھا جائے گی۔ رات کو یہاں رکنا بھی ممکن نہیں تھا۔ مگر اب بڑا اور اہم سوال یہ تھا کہ اپنے ایک بیہوش ساتھی اور ایک گمشدہ دوست کو ہم چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے تھے۔

وقار نے بے ہوش شہباز کو ہوش میں لانے کے کافی جتن کئے اپنے شولڈر بیگ میں سے کوئی دوا بھی نکال کر اس کے حلق میں ٹپکائی مگر بے سود..... اسے ہوش میں آنا تھا نہ آیا..... وقار نے کہا "گھبرانے کی بات تو نہیں ہے شہباز اندر بھری ہوئی گیس کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ میں نے گیس کا اثر زائل کرنے کی دوا دے دی ہے۔" اور اتنا کہہ کر وقار خشک لکڑیاں چن چن کر جمع کرنے لگا..... اور میں اسکاؤٹنگ کی تربیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں الاؤ جلانے کی لئے ترتیب سے رکھنے لگا۔ سورج کے غروب ہوتے ہوتے ہم نے لکڑیوں کا خاصا ڈھیر جمع کر لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وقار نے مجھے وہیں بیٹھنے کے لئے کہا، اور خود ارسلان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ چند ہی قدم آگے چلا ہو گا کہ مجھے اپنی اسکاؤٹنگ تربیت کی ایک اور اہم بات اور یاد آئی میں نے وقار کو آواز دے کر ہدایت کی کہ وہ اپنے ساتھ خشک گھاس رکھ لے اور جس طرف بھی جائے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھاس بکھیرتا جائے تاکہ انہی نشانات کی مدد سے واپس اپنی جگہ پہنچ سکے۔ وقار کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا..... اور شہباز ابھی تک ویسے ہی بے ہوش تھا..... اندھیرا گہرا ہوتے ہی خنکی اپنا اثر دکھانے لگی۔ میں نے الاؤ روشن کر دیا..... الاؤ کا روشن کرنا تھا کہ اچانک ساری فضا بلیوں کے رونے سے گونج اٹھی۔ ان کے رونے سے ایک خوف کا سا احساس ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد بلیوں کی آواز کے ساتھ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ شہباز ہوش میں آ رہا ہے میرے آواز دینے پر اس نے ایک بار نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ..... اچانک ہوا تیز ہوئی..... دیکھتا کیا ہوں فضا میں ایک انسانی کھوپڑی اڑتی ہوئی آئی اور میرا طواف کرنے لگی..... یا اللہ..... یہ میں کہاں پھنس گیا..... یہ سب کیا ہے..... میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اور اپنے جی کو سخت کئے رکھا۔ دو یا تین چکر میرے گرد لگانے کے بعد وہ کھوپڑی خود بخود ہی کہیں اندھیرے میں غائب ہو گئی..... میں نے یوں ہی بیٹھے، بیٹھے ذرا دیر کو آنکھیں بند کر لیں مگر تڑ، تڑ کی آواز نے مجھے اپنی آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ آنکھیں کھولنے پر مجھے نظر آیا کہ بچوں کے کھیلنے والی شیشے کی گولیاں برس رہی ہیں حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ ساری گولیاں میرے اطراف میں برس رہی تھیں میں ان سے بالکل محفوظ تھا..... پھر فضا میں بے شمار لوگوں کے چیخنے، رونے اور ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہاں تک کہ اس شور شرابے سے میرے کان کے پردے پھٹنے لگے۔ میں نے گھبرا کر اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لیں۔ اور آنکھیں بند کر لیں..... پھر جب میری آنکھ کھلی تو وقار کو اور شہباز کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا..... چاروں طرف گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ الاؤ شاید بجھ چکا تھا..... مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وقار نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اٹھاتے ہوئے کہا

"کیا ہوا، کیا تم سو گئے تھے۔"

اب میں پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا واپس ریسٹ ہاؤس جانے کے لئے حویلی سے باہر نکلا تو بے خیالی میں ایک کنویں میں جا گرا..... یہ اندھا کنواں ہے۔ میرا مطلب یہ کہ خشک بغیر پانی کا کنواں..... "پلیز میری مدد کریں۔ اور مجھے کسی طرح باہر نکالیں اوور"..... اچھا ٹھہرو..... گھبراؤ نہیں..... اگر تمہیں صحن سے باہر نکلنے کا صحیح رخ اور سمت یاد ہو تو بتاؤ ہم تمہاری مدد کو فوراً پہنچتے ہیں..... اوور..... پھر ارسلان نے مجھے سمت کی نشاندہی اندازے سے کی..... ہم دونوں باہر نکلے..... ایک موٹی لمبی نائلون کی رسی میرے ہاتھ میں تھی..... باہر نکل کر میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو خود رو لمبی گھاس میں چھپی ہوئی ایک باؤلی مجھے نظر آئی..... شاید یہ وہی کنواں تو نہیں جس میں ارسلان گرا ہے..... میں نے دل ہی دل میں سوچا..... غالباً یہ باؤلی حویلی کے ہی مکینوں نے تعمیر کرائی ہو گی۔ باؤلی ایسے کنویں کو کہتے ہیں جس کے گرد رہائشی جگہ بنی ہوئی ہوتی ہے۔ قدیم ترین زمانوں میں امراء موسم گرما کی گرم دوپہریں ان ہی باؤلیوں میں گزارا کرتے تھے..... صدیوں استعمال نہ ہونے کی وجہ سے شاید یہ خشک ہو گئی ہے..... جسے ارسلان نے اندھا کنواں سمجھ لیا ہے۔ میں نے رسی لٹکانے کے بجائے سیڑھیاں تلاش کیں جو مجھے جلد ہی مل گئیں۔ سیڑھیوں کو بھی خودرو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ نے بری طرح ڈھانپ لیا تھا..... ہم دونوں بڑی احتیاط سے ایک ،ایک قدم دھیرے دھیرے آگے بڑھاتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ چند گز کے فاصلے پر نیچے اترنے کے بعد ہم اس جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں ارسلان موجود تھا..... مگر ہم وہاں یہ دیکھ کر خوف زدہ کہ ارسلان تک پہنچنے کے لئے ہمیں کئی زہریلے سانپوں اور دو اژدھوں کے اوپر سے گزرنا پڑے گا..... رات کے اندھیرے میں ارسلان ان موذیوں کو دیکھ نہیں سکا، وگرنہ خوف سے اس کا ہارٹ فیل ہو جانا یقینی تھا..... اب ہم پھر عجیب سی کشمکش میں گرفتار تھے..... منزل سامنے دیکھ کر بھی منزل سے دور تھے۔

اب ہم پھر تین تھے اور صرف ارسلان کا پتہ چلانا اور حویلی کا راز معلوم کرنا باقی رہ گیا تھا..... وقار نے کہا، "ہم صرف حویلی کے پراسرار حالات کا پتہ لگانے کی کوشش کریں، ارسلان کی فکر چھوڑ دیں وہ جہاں کہیں ہو، خدا کرے خیریت سے ہو..... حویلی کے راز پر سے پردہ اٹھے گا تو وہ بھی مل جائے گا....."

اب ہم نے دوسری سمت کے کمروں کو دیکھنے کا پروگرام بنایا، چند کمرے بند تھے، اور ان کے دروازوں کی کنڈیوں میں تالے بھی لٹک رہے تھے..... میں نے ایک جگہ ملبے کے ڈھیر میں سے پتھر کا ایک بھاری ٹکڑا اٹھایا اور ایک بند دروازے کے تالے پر دھڑ سے دے مارا..... صدیوں پرانا رنگ خوردہ تالا پتھر کی

ایک ہی ضرب میں ٹوٹ کر کھل گیا۔ ہم نے دروازہ کھول دیا تاکہ برسوں بند رہنے کی وجہ سے اندر جمع ہو جانے والی زہریلی گیس باہر نکل جائے..... اسی دروازہ میں سارے بند تالے پتھر کی ضرب سے توڑ ڈالے، اور ہر کمرے کے دروازے کو کھلا چھوڑ دیا قطار کے آخری سرے پر بنا ہوا کمرہ باہر سے تو کھلا ہوا تھا، مگر وہ اندر سے بند تھا..... میں نے زور لگا کر کھولنے کی کوشش کی تو وہ بہت مضبوط محسوس ہوا، وقار اور ارسلان مجھے زور آزمائی کرتا ہوا دیکھ رہے تھے وہ بھی میری مدد کے لئے قریب آ گئے..... اب ہم تینوں نے ملکر زور لگانا شروع کیا۔ مگر دروازہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، وقار نے دروازے کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا، "یہ دروازہ حویلی کے دوسرے دروازوں سے مختلف ہے اور مضبوط بھی، یقیناً اسے بعد میں لگایا گیا ہے تین سو سال پرانے دروازے وہ ہیں جو پتھر کی ایک ایک ضرب سے کھل گئے تھے....." اس کے کہنے پر میں نے اور ارسلان دونوں نے مل کر دروازے کا جائزہ لیا..... واقعی دروازہ چند سال پرانا تھا۔ اور لاہور کے کسی دروازے کے کسی مستری نے بنایا تھا۔ مگر سوال تو اسکے کھولنے کا تھا..... میں ابھی اس کے کھولنے کی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ ارسلان کو وہی پتھر جس سے میں نے تالے توڑے تھے، دروازے کے اوپری فریم پر دے مارا، اور نتیجے میں فریم کا تختہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ ٹوٹ گیا اب ارسلان نے ٹوٹے ہوئے تختے کی جگہ ہاتھ ڈال کر اندر کی کنڈی کھولنی چاہی..... مگر ہاتھ اندر ڈالتے ہی اس نے بری طرح چیختے ہوئے اپنا ہاتھ باہر واپس نکال لیا۔ وہ بری طرح اپنے ہاتھ کو بار بار جھٹک رہا تھا..... اور سخت تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا، "ہائے میں جل گیا۔ ہائے میں جل گیا۔ اف میرا ہاتھ....." میں نے آگے بڑھ کر اسکا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی ہتھیلی کی پشت پر ایک جگہ سوئی کی نوک برابر خون جھلک آیا تھا..... معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں کسی بچھو کا ڈنک نہ ہو فوراً ہی میں نے کلائی کے نیچے اپنا رومال کس کر باندھ دیا۔ اور مقناطیس کا ٹکڑا نکال کر خون رسنے کی جگہ پر گھسنے لگا..... رفتہ رفتہ اس کی جلن ختم ہو گئی..... اسے آرام آ گیا۔ اب ہم پھر اس کمرے کی طرف متوجہ ہوئے، دروازے کے اندر ہاتھ ڈالنے سے قبل میں نے چمڑے کے دستانے ہاتھ پر چڑھا لئے ..... جیسے ہی میں نے اندر ہاتھ ڈالا کسی نے اندر سے میرا ہاتھ پکڑ لیا..... گرفت بے حد مضبوط تھی۔ میں نے اس نادیدہ گرفت سے آزاد ہونا چاہا مگر ناکام رہا۔ مجبوراً مجھے وقار کو مدد کے لئے آواز دی۔ وقار نے مجھے کمر سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور ہم دونوں دھڑام سے باہر کی طرف گر پڑے..... میرا ہاتھ تو اس نادیدہ گرفت سے آزاد ہو گیا تھا، مگر میرا چرمی دستانہ اندر رہ گیا تھا..... اب ہم نے اندر ہاتھ ڈال کر دروازہ کھولنے کے بجائے کنڈی کی جگہ پر لگاتار پتھر کی ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ دروازے کے فریم میں جڑے ہوئے تختوں

کو بھی پتھر کی ضربات سے توڑ دیا..... پھر ایک ضرب سے کنڈی کھل گئی..... ہم نے دوسرے کمروں کی طرح اس کا دروازہ بھی کھول دیا، تاکہ تازہ ہوا اندر بھر جائے.....

تھوڑی دیر آرام کرنے اور ستانے کے بعد سب سے پہلے اسی کمرے میں چلنے کا فیصلہ کیا جو اندر سے بند تھا، اور سب سے آخر میں بڑی جدوجہد کے بعد کھلا تھا۔

اندر پہنچ کر سب سے پہلے ہم نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اندر کمرہ بالکل صاف ستھرا تھا۔ اب ہم پھر یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ جب اندر کوئی ہے ہی نہیں تو ارسلان کے ہاتھ پر ڈنک مارنے کا سا نشان کیوں آیا اور میرا ہاتھ کس نے پکڑا تھا۔ وقار کا کہنا تھا کہ اس کمرے میں کوئی شخص ضرور رہتا ہے۔ جو ہمارے اندر داخل ہونے سے پہلے تک یہاں موجود تھا..... مگر وہ کہاں غائب ہو گیا۔ کمرے میں جس دروازے سے ہم داخل ہوئے ہیں اس کے علاوہ کوئی اور دروازہ تو ہے نہیں دروازے کے دائیں بائیں دو کھڑکیاں بند تھیں۔ کمرے کے عین وسط میں ایک خوبصورت آبنوسی مسہری تھی۔ سرہانے کی طرف ایک تپائی پر دو تین قلمی کتابیں رکھی تھیں جو فارسی زبان میں تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک الماری میں بھی چند قدیم قلمی نسخے رکھے ہوئے تھے۔ میں اور وقار دونوں حیران تھے کہ اگر کمرے میں کوئی شخص موجود تھا تو وہ گیا کہاں..... اسے زمین نگل گئی، یا آسمان..... کھا گیا کمرے میں موجود ہر ہر چیز کا بغور کئی کئی دفعہ جائزہ لیا، مگر گتھی سلجھنی تھی نہ سلجھی۔ اتفاقاً میری نظر دیوار میں ایک طرف تین کھونٹیوں پر پڑی، تینوں کے مختلف رنگ تھے۔ ایک سنہری، زرد رنگ دوسری سبز اور تیسری کالی تھی۔ میں نے وقار کی توجہ ان رنگین کھونٹیوں کی طرف مبذول کرائی..... وقار نے کہا، "کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔ تین کھونٹیاں تینوں مختلف رنگوں میں..... ضرور ان میں کوئی راز ہے....."

ہم دونوں نے باری باری کھونٹیوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ انہیں ہلایا جلایا بھی مگر کچھ نہیں ہوا، پھر وقار نے سبز رنگ کی کھونٹی کو پیچ کی طرح گھمانے کی کوشش کی تو وہ گھوم گئی..... اس کھونٹی کے گھمانے سے مسہری نیچے بیٹھنے لگی..... وقار برابر اس کھونٹی کو پیچ کھولنے کے انداز میں گھما رہا تھا مسہری دھیرے دھیرے فرش میں بیٹھتی جا رہی تھی..... کھونٹی کے پیچ ختم ہوئے تو مسہری پوری کی پوری غائب ہو چکی تھی اور وہاں کافی بڑا خلا نظر آ رہا تھا..... ہم دونوں ارسلان کو وہیں چھوڑ کر اس خلا کے طرف بڑھے..... اندر تہہ خانہ تھا۔ نیچے اترنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں ہم دونوں آگے پیچھے اس تہہ خانے میں اترتے چلے گئے.....

نیچے پہنچ کر ہماری آنکھیں پھٹی کر پھٹی رہ گئیں..... ارسلان وہاں ایک آرام دہ مسہری پر بڑی پر

سکون نیند سو رہا تھا۔ ہماری آہٹ پاکر اسکی آنکھ خود ہی کھل گئی..... وہ ہمیں دیکھتے ہی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا..... اور حیرت سے بولا..... "ارے تم دونوں بھی یہاں پہنچ گئے..... مگر وہ لوگ کہاں گئے....."

میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "ارسلان: تم یہاں تک کیسے پہنچے۔" "جب تم لوگ شہباز کی چیخ سن کر ہال کے اندر گئے تو میرے سر پر کوئی شدید چوٹ لگی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا اور جب ہوش آیا تو میں اس کمرے میں تھا اور یہاں دو شخص اور تھے..... ان میں ایک تو وہی ریسٹ ہاؤس کا گونگا چوکیدار تھا..... اور دوسرا ایک اور شخص....."

وقار نے کہا..... "یارو ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کرنا چاہئے..... وہ لوگ ہمیں ڈرانے کی اسکیم میں ناکام ہو کر یقیناً ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "تم کسی بھی طرح اپنے والی ٹاکی پر کسی بھی پولیس اسٹیشن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو..... یقیناً یہ کوئی بڑا جرائم پیشہ گروہ ہے..... خصوصاً پولیس کو ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار پر خصوصی نظر رکھنے کی تاکید کروں میں نے اپنا والی ٹاکی آن کیا۔ اس کی رینج زیادہ سے زیادہ پانچ کلومیٹر تک تھی..... میں والی ٹاکی پر پولیس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وقار اور شہباز نے دیکھا کر ایک جگہ دیوار کے قریب ایک بڑا ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا..... وقار کا اندازہ تھا کہ رات کو رونے، چیخنے، ہنسنے اور جانوروں کی مختلف آوازیں اسی ٹیپ ریکارڈر سے نشر ہوئی ہوں گی..... اور بعد میں یہ حقیقت کھل گئی حویلی کے صحن اور بڑے ہال کمرے کی دیواروں میں دو، دو میٹر کے فاصلے پر لاؤڈ اسپیکر نصب تھے۔ ایک جگہ گیس کے سلنڈر رکھے ہوئے تھے۔ غالباً اس سلنڈر کی گیس کو بھی پائپ کنکشن کے ذریعے ہال، کمروں اور حویلی کے دوسرے کمروں میں پہنچایا گیا ہو گا۔ اور ان جگہوں پر مرنے والے لوگ اسی زہریلی گیس کے اثر سے مرتے ہوں گے راہداری سے ملحق کئی گیراج بنے ہوئے تھے۔ جہاں نئے ماڈل کی جدید کاریں اور ہیوی ٹرک کھڑے تھے۔ پیٹرول کا بھی معقول انتظام تھا.....

شہباز اور وقار دونوں جائزہ لیتے ہوئے بڑی ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ قدم قدم پر انہیں حیرتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا..... تہہ خانہ کیا تھا اچھی خاصی ریاست تھی..... مگر سب سے زیادہ حیرت انہیں اس بات پر تھی کہ وہاں ان کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا.....

وہ بڑے اطمینان اور بے خیالی میں باتیں کرتے بڑھتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک جگہ قدم

رکھتے ہی وہ جال میں پھنس گئے..... جال میں پھنستے ہی انہیں ملے جلے خوفناک قہقہوں کی آواز سنائی دی..... تھوڑی دیر میں ہنسنے والے چہرے ان کے سامنے تھے۔ وقار ان میں سے ایک چہرے کو دیکھ کر بری طرح چونکا..... یہ وہی گونگا چوکیدار تھا۔ جسے انہوں نے ریسٹ ہاؤس میں دیکھا تھا.....

"کہو بھئی..... پھنس گئے نا..... آخر ہمارے جال میں....." اسی گونگے چوکیدار نے بڑی رعونت سے کہا..... "دیکھو بھئی..... ہم کسی کے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑاتے ہیں..... اور نہ کسی کو اپنے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی اجازت دینا پسند کرتے ہیں۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ ہمارے ہاتھوں کسی کی جان نہ جائے۔ مگر جب کوئی ہمارے پیچھے پڑ جاتا ہے تو ہم اسے زندہ چھوڑنا خلاف مصلحت جانتے ہیں۔ تم لوگوں کا ادھر آنا ہی مجھے پسند نہیں تھا۔ پھر آ گئے تھے تو گھوم، پھر کر خیر سے اپنے گھر لوٹ جاتے۔ مگر تم لوگوں نے تو ہماری اصلیت جانے کا عزم کر لیا تھا..... لو اب بطور انعام اپنی جانیں دینے کو تیار ہو جاؤ....."

اتنا کہہ کر اس چوکیدار نے ایک چرخی پر ہاتھ رکھا اور اسے گھمانا شروع کر دیا..... چرخی گھمانے سے آمنے سامنے کی دیواروں سے آہنی تیز اور نوکیلے پنجے نکل کر ان کی طرف بڑھنے لگے..... لمحہ لمحہ گزرنے کے ساتھ وہ آہنی پنجے ان کے قریب سے قریب تر ہوتے جاتے تھے۔ عین اسی وقت جب وہ آہنی پنجے ان کے جسموں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔

"ہینڈز اپ" کی آواز نے سب کو چونکا دیا..... وائی ٹاکی کے ذریعے پولیس سے رابطہ قائم کیا جا چکا تھا اور اب پولیس نے حویلی کے کھنڈرات کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر گونگے نے چرخی گھمانا بند کر دیا۔

شام ہوتے ہوتے ساری کاروائی مکمل ہو گئی گونگے چوکیدار کی نشان دہی پر سارے مجرم گرفتار کر لئے گئے..... سرغنے کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ہمارے دوست چوہدری عظمت خان کا تایا زاد بھائی حشمت خان تھا..... جسے اس حویلی کے متعلق ساری معلومات تھیں اور اس نے وہیں سے اسمگلنگ کا کاروبار شروع کیا ہوا تھا۔

یہاں سے فارغ ہو کر اب ہم سب عظمت خان کے پاس اس کے گاؤں منصور نگر پہنچے اور ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی حویلی سے مجرموں کا گروہ پکڑے جانے کی خبر ان تک پہنچ چکی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ کارنامہ ہم لوگوں کا ہے اور ہم جدید عاملوں نے حویلی کے کھنڈرات کو بھوتوں کے قبضے سے نجات دلائی ہے تو انہوں نے باری باری ہم سب کو سینے سے لگا لیا۔

کیسا کھیل کھلونوں کا

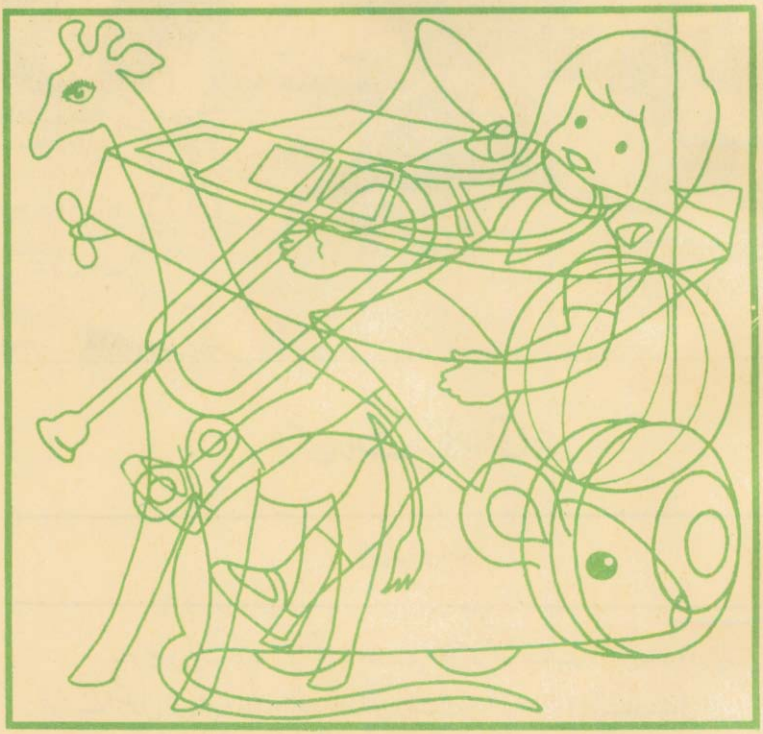

ایک مشکل آن پڑی ہے۔ آپ مدد کر دیجئے۔۔ بہت سے کھلونے گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ہے۔ نہ صرف علیحدہ کرنا ہے بلکہ بتانا بھی ہے۔ کہ کھلونوں کی تعداد کتنی ہے اور ان کے نام کیا ہیں؟ اس سارے کام کے لئے آپ کو صرف ۳۰ سیکنڈ دیئے جا رہے ہیں۔

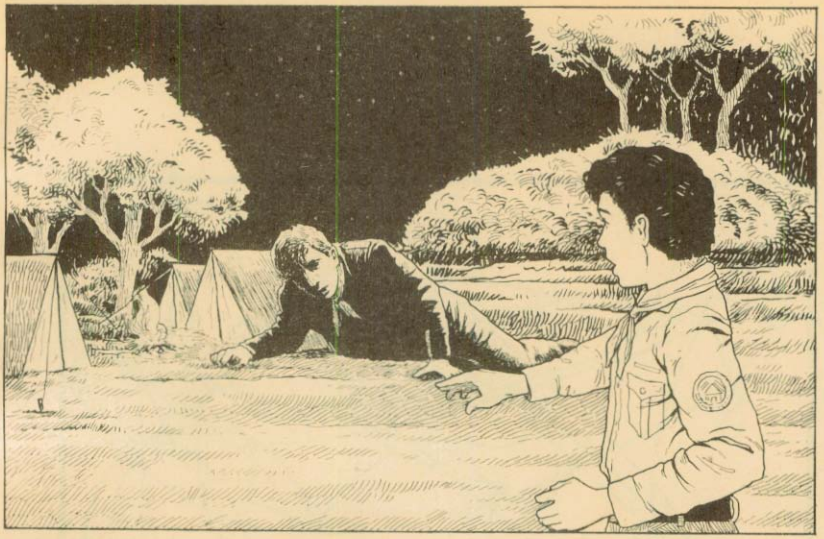

اس رات کیا ہُوا تھا؟

ایس عرفان آفاق

یہ دسمبر کی ایک سرد رات تھی۔ ہمارے اسکاؤٹ گروپ نے آبادی سے دور ایک پرانے طرز کے اسکول میں ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ اور اس رات میری اور ضیاء کی پہرے دینے کی ڈیوٹی تھی ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کر کے وقت گزار رہے تھے مگر شاید گھڑی کی سوئی نے بھی آگے نہ بڑھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

چاروں طرف گپ اندھیرا تھا۔ اور ہم دونوں آگ جلائے ہاتھ تاپ رہے تھے۔ ”ضیاء یہ آج سردی کچھ زیادہ نہیں ہے۔“ میں نے تقریباً کانپتے ہوئے کہا۔

”نہیں میرے بھائی سردی تو روز جیسی ہے البتہ تم آج پہلی بار پہرہ دے رہے ہو۔“ ضیاء نے اپنے تکیہ کلام ”میرے بھائی“ کو استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"یار یہ جو ساتھی خیموں میں سو رہے ہیں یہ تو بڑے آرام سے ہوں گے۔" میں نے حاسدانہ لہجے میں کہا۔

"میرے بھائی کل تم آرام سے سو رہے ہو گے تو کوئی اور پہرہ دے رہا ہو گا" ضیاء کی بات سے میں بھی قائل ہو گیا۔

"یار میں کچھ خوف محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے سردی اور خوف سے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"کس چیز کا خوف؟ اس جھاڑی کا، آگ کا یا میرا۔" ضیاء نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو مذاق نہ کرو۔ جن وغیرہ کے بارے میں تو قرآن پاک میں بھی ہے۔ یہاں تک کہ ایک مکمل سورہ کا نام بھی "سورۃ الجن" ہے میں نے اپنے دلائل پیش کئے۔

"دیکھو میرے بھائی تم ٹھیک کہتے ہو کہ قرآن کریم میں جنات کا ذکر ہے لیکن میرے بھائی وہ جنات اور ہمارے تصوراتی جنات میں زمین آسمان کا فرق ہے ہم نے تو چڑیل، ڈریکولا، ڈائن اور نہ جانے کیا کیا اپنے ذہن سے پیدا کر لئے ہیں جبکہ خداوند کریم کی مخلوق جن نہایت پاک صاف اور عابد قسم کی ہوتی ہے۔" ضیاء نے اپنے نرم لہجے میں تقریباً تقریر کر ڈالی۔

پھر میں ضیاء سے اجازت لے کر ایک ضرورت سے خیمے میں چلا گیا اور جب واپس آیا تو کیا دیکھا کہ ضیاء کی آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی ہیں۔ اور وہ عجیب انداز میں جھوم رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے ضیاء کو آواز دے کر کہا۔

"یار دیکھو مذاق نہ کرو۔" مگر اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اب تو میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ آواز حلق میں اٹک گئی۔

اچانک ضیاء کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور وہ زمین پر لوٹنے لگا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کروں سردی کے باوجود میرا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ میں الٹے قدموں بھاگا میں نے اپنے ٹیچر اور تمام ساتھیوں کو اٹھایا اور انہیں تمام ماجرا بتایا۔ ہم سب ٹیم کی شکل میں اس جگہ پہنچے تو دیکھا ضیاء بالکل ٹھیک ٹھاک آگ کے سامنے بیٹھا ہاتھ تاپ رہا ہے۔ اب میری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ جب ٹیچر نے ضیاء سے ماجرا پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور

کہا کہ "یہاں تو کچھ بھی نہیں ہوا ہاں عرفان مجھ سے پوچھ کر خیمے کے اندر گیا تھا اور واپسی میں آپ

لوگوں کے ساتھ آیا ہے۔" ٹیچر اور تمام لڑکوں نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے انہیں میری ذہنی حالت پر شبہ ہو۔ بلکہ مجھے کافی ڈانٹ بھی پڑی۔ اور یہ سمجھ کر میں اتنا بڑا مذاق کیوں کیا انہوں نے مجھے اپنے اسکاؤٹ گروپ سے نکال دیا۔

اس واقعہ کے کوئی دو یا تین دن گزرے تھے میں حیران پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ شاید یہ میرا خواب تھا وہم تھا یا اللہ جانے کیا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو سامنے ضیاء کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے عجیب سے خوف کا احساس ہوا لیکن اس نے تقریباً رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرے بھائی مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔" میں ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ "اس رات تم نے جو کچھ دیکھا وہ سچ تھا لیکن میں مجبور تھا۔ مجھے مرگی کی بیماری ہے جس میں انسان پر وہی کیفیت ہو جاتی ہے جو تم نے میری دیکھی۔ مگر میرے بھائی میں نے اپنی اس بیماری کو اسکاؤٹ کے ساتھیوں سے چھپانے کے لئے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ اب میں تمہارے سامنے ہوں۔ میں ہی تمہاری اسکاؤٹ ٹریننگ میں حائل ہوا ہوں اس لئے جو سزا چاہو مجھے دے دو۔" میں اس کو کیا کہتا اسے معاف کر دیا۔ اور وہ دن اور آج کا دن ضیاء سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ خدا جانے اس رات اس نے مجھ سے مذاق کیا تھا یا وہ سچ مچ بیمار تھا لیکن میں جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میرے دوست ضیاء اگر تم یہ تحریر پڑھو تو صرف ایک بار مجھ سے مل لو۔

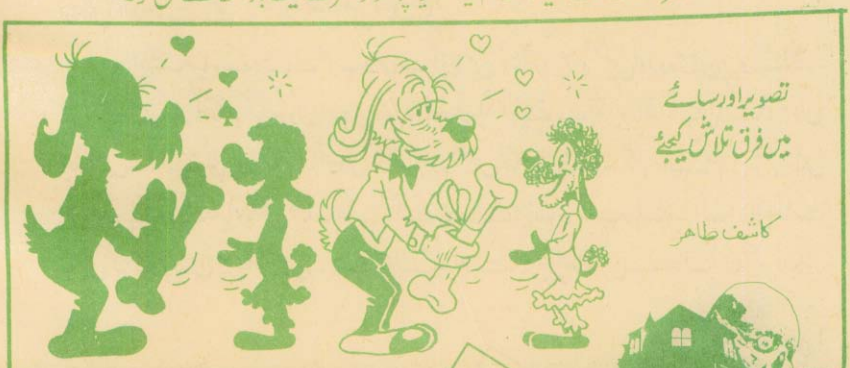

قسط نمبر ۵

تاڑیل

نعیم بلوچ

اٹھارہ سالہ جانو کو اپنی بیمار ماں کے علاج کے لئے وڈیرے سے رقم نہ مل سکی۔ گوٹھ کے ایک ہندو بیوپاری رام چند نے اس کو ماں کے علاج کے لئے رقم بھی دی اور اسے ملازمت دلانے کے لئے اپنی اوطاق پر بلایا جانو جب وہاں پہنچا تو اس نے تین افراد اور اپنے ہم عمر لڑکے منظور کو پہلے سے موجود پایا۔ تھوڑی دیر بعد جانو اور منظور کی آنکھ پر پٹی باندھ کر ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد جیپ کسی نامعلوم جگہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ ایک طویل سفر کے بعد وہ ایک پہاڑی غار میں پہنچا دیئے گئے۔ یہاں انھیں ڈکیتی کے لئے تیار ہونا پڑا۔ چند روز بعد انھوں نے رات کے تین بجے مرکزی شاہراہ پر مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس کو رکاوٹیں کھڑی کر کے روک لیا۔ بس میں موجود پولیس کے دو مسلح سپاہی اور مسافر چونک پڑے۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکوؤں نے بس کے تمام مسافروں کا اسباب لوٹ لیا اور ایک بوڑھے ہاری کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جانو کو مسافروں سے ہمدردی اور ڈاکوؤں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ڈاکو نہیں سمجھ رہا تھا۔ دوسری طرف رام چند نے ارد گرد کے علاقے میں رہنے والوں کو دعوت پر بلایا اور ملک کے

خلاف پروپیگنڈا شروع کیا کہ جو حکمران بھی آتا ہے وہ سندھیوں کو مارتا ہے۔ اس کے بعد رام چند۔ زندہ باد اور "سندھو دیش۔ زندہ باد" کے نعرے بھی لگے۔ دعوت کے بعد رام چند سردار قادر خان کو ایک خفیہ کمرے میں لے گیا جہاں بے شمار اسلحہ موجود تھا۔ رام چند نے قادر خان کو کہا کہ وہ ہر اس آدمی کو اغوا کر لے یا گولی مار دے جو فوج کو کسی بھی ڈاکو کے بارے میں کچھ بتائے۔ پھر اس نے قادر خان کو کہا وہ مشہور پاکستان دوست لیڈر عبدالحق کو ہر قیمت پر اغواء کر لے۔ ادھر جانو کی ماں کو جب علم ہوا کہ اس بیٹا ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو چکا ہے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ دوسری طرف ایک روز رات کے وقت عبدالحق اپنی کار میں گھر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک صحافی بھی تھا۔ جو ان کا انٹرویو کرنا چاہ رہا تھا۔ اچانک ایک سیاہ شیراڈ نے ان کی گاڑی کا راستہ روک لیا۔ ڈرائیور اور صحافی کو بے ہوش کر کے عبدالحق کو بھی بے ہوش کر کے شیراڈ میں بٹھا لیا گیا۔ اور اسے ڈاکو قادر خان کے ٹھکانے پر لے گئے۔ ۲۵ تاریخ کو رام چند نے اخبار میں عبدالحق کے اغواء کی خبر پڑھی اور وائرلیس پر کسی کو اس کامیابی کی اطلاع دی۔ چند روز بعد قادر خان کی جیپ عبدالحق۔ جانو اور رام چند کے ایک آدمی کو لے کر کسی اجنبی مقام کی طرف جا رہی تھی۔ عبدالحق جانو کو غور سے دیکھتا رہا۔ جب ان کی جیپ اپنی منزل پر پہنچی تو عبدالحق جانو کو پہچان چکا تھا۔ جانو کو معلوم ہو گیا کہ عبدالحق اس کے باپ کو جانتا ہے۔ اس نے عبدالحق کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز ڈاکو قادر خان کے آدمیوں نے گاؤں میں زبردست فائرنگ کی اور مختلف مکانات کو آگ لگا دی۔ گاؤں کے لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر نکل بھاگے۔ اگلے دن وہ اپنی بہنوں سے ملنے گیا اور ان کے سامنے عہد کیا کہ وہ ڈاکو نہیں بنے گا۔ اس نے انہیں انتظار کرتے کو کہا تاکہ وہ لوگ گاؤں چھوڑ کر کسی اور جگہ جا سکیں۔ پھر وہ اس حویلی میں جا پہنچا جہاں عبدالحق کو قید میں رکھا گیا تھا۔ اندھیرے میں اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس سے کافی آواز پیدا ہوئی۔ اتنے میں کسی نے جانو کو للکارا۔ اب آپ آگے پڑھئے۔

آواز جانو کو جانی پہچانی لگی تھی۔ لیکن وہ جواب دینے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ برآمدے کے فرش سے ٹکرایا ہے جو زمین سے دو تین انچ اونچا بنا ہوا تھا۔ آواز سن کر جانو بیٹھ گیا اور گھسیٹتا ہوا دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ للکارنے والا چپکے سے اس کے پیچھے ہو لیا۔ جانو اس سے بے خبر تھا۔ جانو ہر لمحے بندوق کی گولی کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ محفوظ طریقے سے، بغیر کوئی آواز پیدا کئے، برآمدے سے گزر کر دوسری طرف جانے والی راہداری کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کمرے کے باہر کھڑا تھا جس کے دروازوں سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ جانو کو باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ اسے رام چند کی آواز کو پہچاننے میں زرا دیر نہ لگی۔ وہ کہہ رہا تھا:

"جب تک شہروں میں فساد نہیں ہوں گے ہمارا کام نہیں بنے گا۔ اگر عبدالحق کے اغوا سے کام نہیں بنا تو ہم اس سے بڑے لیڈروں کو اغوا کر لیں گے۔"

اس کے جواب میں ایک دوسری آواز آئی۔ جانو کے لئے یہ آواز بالکل اجنبی تھی۔

"لیکن میرے خیال میں صرف اغوا کرنے سے کام نہیں بنے گا۔ ہمیں بڑے بڑے لیڈروں

کو قتل کر دینا ہو گا۔ اغوا سے تو لوگ صرف یہی سمجھتے ہیں کہ اسے ڈاکو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ لیکن جب لوگوں کو معلوم ہو گا کہ سندھو دیش والوں نے ان کے لیڈروں کو قتل کیا ہے تو پھر انتقام لینے کے لئے سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ اور ہمیں اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر اپنا کام کر دینا چاہئے۔"

"اس طرح ہمیں اغوا کرنے اور پھر ان لوگوں کو حفاظت سے رکھنے کا مشکل کام بھی نہیں کرنا پڑے گا۔" یہ تیسرے شخص کی آواز تھی۔ جانو کو یہ آواز کچھ مانوس سی لگ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ان کا اگلا قدم یقیناً یہی ہو گا کہ عبدالحق کو قتل کر کے اس کی لاش اس کے گھر پھینک دی جائے۔ وہ فوراً واپس مڑا۔ کمرے سے ابھی چند قدم دور ہی گیا ہو گا کہ اسے پیچھے سے وہی جانی پہچانی آواز سنائی دی..... "جانو"

جانو چونک کر پیچھے مڑا تو اسے ہاتھوں میں بندوق لئے اس کے قد کا آدمی نظر آیا۔ روشنی کافی کم تھی اس لئے وہ اسے دیکھ نہ سکا لیکن آواز کو اب وہ پہچان چکا تھا۔ "تم منظور ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "ہاں۔ لیکن تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ اگر مجھے شک نہ ہوتا تو میں تمہیں کب کا گولی مار چکا ہوتا۔"

"لیکن تم نے تو کل میرے ساتھ ٹھکانے پر جانا تھا۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟" جانو کچھ بتانے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ منظور یہاں کیا کر رہا ہے۔

"میں نے رام چند سے صاف کہہ دیا کہ میں ڈاکو نہیں بن سکتا۔ اس لئے مجھے اس نے چوکیدار رکھ لیا۔ لیکن تم....."

"اگر تم مجھے عبدالحق کے تہہ خانے تک لے جاؤ تو میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔ وہ میرے باپ کو جانتا ہے۔ میں اس سے اپنے باپ کے قتل کا راز جاننا چاہتا ہوں۔ میں اپنے باپ کے قتل کا انتقام لئے بغیر نہ چوکیدار بن سکتا ہوں نہ ڈاکو۔"

منظور جانو کی زبانی اس کی کہانی سن چکا تھا۔ اسے یاد تھا کہ کہانی سن کر اس نے دل میں عہد کیا تھا کہ وہ جانو کی مدد ضرور کرے گا۔ وہ کچھ سوچنے کے بعد بولا۔

"چپکے سے میرے پیچھے چلے آؤ۔" چلتے ہوئے منظور کے ذہن میں رام چند کے وہ الفاظ آ رہے تھے جو اس نے حویلی کی چابیاں دیتے ہوئے اسے کہے تھے۔ "قادر خان کے پاس جو نہیں ٹھہرتا وہ میرے پاس آتا ہے اور جو میرے پاس بھی نہ ٹکے۔ وہ پھر صرف قبر میں جاتا ہے" لیکن وہ

اس وجہ سے تھوڑا سا مطمئن بھی تھا کہ وہ جانو کی ہی تو مدد کر رہا ہے جسے رام چند نے اپنا بیٹا بنایا ہوا ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہو بھی گیا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر ہی سکتا ہے۔

تہہ خانہ بر آمدے کی پچھلی جانب مویشیوں کے احاطے کے پاس ایک کمرے کے نیچے تھا۔ منظور نے اس کا تالا کھولتے ہوئے جانو سے کہا۔ "میں باہر ہوں۔ کوئی خطرہ ہوا تو جھینگر کی آواز نکالوں گا۔ لیکن اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

جانو نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے ہی آواز دی۔ "میں جانو ہوں چچا۔ وسایا کا بیٹا۔" عبدالحق دروازے کے کواڑوں کے پیچھے سے نکلا۔ اس نے ہاتھ میں ایک بوسیدہ سی لوہے کی سلاخ پکڑی ہوئی تھی۔ اگر جانو آواز نہ دیتا تو یقیناً وہ اس پر حملہ کر دیتا۔ لیکن اب بھی وہ جانو کے سامنے بڑے ہوشیار طریقے سے کھڑا، اسے اندھیرے میں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا تم میرے باپ کے قاتل کو جانتے ہو؟"

عبدالحق کچھ دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ وہ واقعات کی کڑیاں ملا کر حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔ "جس لڑکے نے تمہیں تہہ خانے کا تالا کھول کر دیا ہے وہ تمہارا کیا لگتا ہے؟"

جانو، عبدالحق کے اس قدر چوکنے اور ہوشیار رہنے پر حیران رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ اس پر شک کر رہا ہے کہ کہیں اسے رام چند نے تو نہیں بھیجا۔

"مجھے کسی نے یہاں نہیں بھیجا۔ میں یہاں چوری چھپے آیا ہوں۔ چوکیدار منظور میرا دوست ہے..... تم مجھے....."

"میں تمہارے باپ کے قاتل کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم مجھے حویلی کے باہر اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے۔"

"لیکن میں تمہیں کہاں لے جاؤں....." جانو اچانک رک گیا۔ باہر سے جھینگر کی آواز آ رہی تھی۔ "کوئی آ رہا ہے" اس نے سرگوشی کے سے انداز سے کہا۔ عبدالحق نے جانو کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ جانو اب باہر نہ جاتا تو کہاں جاتا۔؟ تہہ خانے سے باہر نکلتے وقت عبدالحق نے دروازے سے تالا اتار کر اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ تالا ٹوٹے ہونے کے بجائے کھلا دیکھ کر رام

چند یہی شک کرے گا کہ عبدالحق منظور کی مدد سے بھاگا ہے۔ وہ ابھی مویشیوں کے باڑے میں ہی ہوں گے کہ انہیں نے دو تین آدمیوں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ان کے اٹھتے قدم رک گئے۔ عبدالحق نے باڑے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "آؤ باڑے کی دیوار پھاند کر باہر نکل جاتے ہیں۔"

"لیکن دیوار تو کافی اونچی ہے۔ اس پر چڑھیں گے کیسے؟" عبدالحق جانو کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے دیوار کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک بھینس کی طرف لپکا۔ بھینس پر بیٹھ کر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سلاخ سے بھینس کو مارنا شروع کر دیا۔ بھینس اٹھ کھڑی ہوئی۔ عبدالحق کے لئے اب کھڑی ہوئی بھینس سے دیوار پر چڑھنا مشکل نہیں تھا۔ دیوار پر چڑھ کر اس نے فوراً دوسری طرف چھلانگ لگادی۔ جانو بھی اسی بھینس کی طرف لپکا۔ بھینس کی دم پکڑ کر جب وہ اس پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا تھا تو اس نے دو تین آدمیوں کو باڑے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ خوش قسمتی سے کوئی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن بھینس سے جب وہ دیوار پر چڑھا تو اسے رام چند کی آواز سنائی دی۔

دوسرے ہی لمحے دیوالور سے دو لگاتار فائر ہوئے۔ لیکن جانو دیوار سے چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ دونوں اب حویلی سے باہر تھے اور پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔

.....○○.....

رام چند اور اس کے ساتھی اس آدمی کے متعلق بات کر رہے تھے جو عبدالحق کو تہہ خانے سے نکال کر لے گیا تھا۔ ان کے خیال میں صرف دو شخص یہ جانتے تھے کہ عبدالحق اس حویلی میں قید ہے۔ ایک جانو اور دوسرا قادر خان رام چند کو اگر کل جانو کے اپنے گھر جانے کا علم ہوتا تو وہ ضرور یہی سمجھتا کہ یہ جانو ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن اب وہ یہی خیال کر رہا تھا کہ قادر خان نے اپنے آدمی کی مدد سے یہ کام کروایا ہے۔ اس نے فوراً اپنے دو آدمیوں کو جانو اور عبدالحق کے پیچھے دوڑایا۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ دونو کو زندہ یا مردہ ہر قیمت پر واپس لانا ہے۔ رام چند اپنی حویلی کی سرگرمیوں کو ہر قیمت پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

.....○○.....

جانو اور عبدالحق جب بھاگتے بھاگتے تھک گئے تو وہ راستے میں درختوں کی اوٹ میں کچھ دیر کے

لئے رک گئے۔ سانس درست ہونے پر جانو نے عبدالحق سے مطالبہ کر دیا کہ وہ اس کو اس کے باپ کے قتل کا راز بتائے لیکن عبدالحق نے اصرار کیا کہ وہ پہلے یہ بتائے کہ وہ قادر خان کے گروہ میں کیسے شامل ہوا۔ جانو کو اپنی ساری کہانی سنانی پڑی۔ عبدالحق نے آخر اس سے پوچھا۔ "تم اپنے بہن بھائیوں کو کہاں رکھو گے؟"

"تمہیں اس سے کیا؟ تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ بتاؤ میرے باپ کا قاتل کون ہے۔" جانو نے سخت اکتائے ہوئے لہجے سے کہا۔

"سنو جانو۔ تمہارے باپ کا قاتل اور میرا دشمن کوئی دو نہیں۔ ایک ہی شخص ہے۔ اس لئے ہم دونوں کو اکٹھے رہنا چاہئے۔" عبدالحق نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

"کیا رام چند میرے باپ کا قاتل ہے؟" جانو نے بے صبری سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا۔ لیکن اس وقت سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب رام چند کو یہ معلوم ہو گا کہ تم اسی رات اپنے اپنے بھائی بہنوں کو اس کے گھر سے لے گئے ہو، جس رات میں بھاگا ہوں، تو پھر وہ یہی سمجھے گا کہ تم نے ہی مجھے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔ اور میرے فرار ہونے کا مطلب صرف اس کی موت ہی نہیں بلکہ اس کے تمام ساتھیوں کی موت ہے۔ اس لئے وہ پھر تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔" عبدالحق کی بات سن کر جانو کچھ دیر کے لئے کچھ نہ بولا۔ اسے خاموش دیکھ کر عبدالحق دوبارہ بولا۔ "میں تمہیں اس لئے وسایا کے قاتل کا نام نہیں بتا رہا تھا کہ کہیں تم جذبات میں آکر اپنے بہنوں کو بھول کر انتقام لینے نہ چلے جاؤ۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتبار ہے تو تم اپنے بھائی بہنوں کو میرے پاس چھوڑ سکتے ہو۔"

"لل..... لیکن تم..... میرا مطلب ہے آپ کون ہیں؟" جانو نے پہلی دفعہ عبدالحق کو آپ کہہ کر پکارا تھا۔ عبدالحق کو اب موقع ملا تھا کہ وہ اسے اپنی کہانی سناتا۔ اس کی کہانی سننے کے بعد جانو نے اسے وہ باتیں بھی بتائیں جو اس نے رام چند کی حویلی میں چوری چھپے سنی تھیں۔ یہ سب کچھ سن کر عبدالحق کچھ دیر کی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر بولا۔ "چلو۔ چاند طلوع ہونے کو ہے۔ ہمیں دیر نہ ہو جائے۔"

.....○○.....

جانو کے بھائی بہن اس کا انتظار کر رہے تھے۔ حویلی کے دروازے پر جیسے ہی کسی دستک دی،

بڑی بہن فوراً دروازے پر پہنچی ۔ دروازا کھولا ۔ لیکن آنے والا اس کا بھائی نہیں تھا ۔ رام چند تھا۔ وہ آج سارا دن گھر نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ وقت بھی تو اس کے گھر آنے کا نہیں تھا۔ وہ سخت گھبرا گئی ۔ سوچنے لگی کہ کہیں رام چند کو معلوم تو نہیں ہو گیا۔ رام چند بھی حیران تھا کہ دروازہ اس قدر جلدی کیوں کھل گیا؟ لیکن وہ اس سے کچھ سوال پوچھے بغیر سیدھا اپنے خاص کمرے میں گھس گیا ۔ جس حویلی سے عبدالحق فرار ہوا تھا اس کے ساتھ رام چند گھر سے واکی ٹاکی سے رابطہ قائم کر سکتا تھا ۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا کوئی کامیابی ہوئی یا نہیں۔ حویلی سے کسی قسم کی کامیابی کی اطلاع نہ پا کر وہ پریشانی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی ۔

"آج سہ پہر کو جانو آیا تھا۔ اس نے مجھ سے بدتمیزی کی ۔"

"کیا۔" رام چند حیرت سے اچھل پڑا۔ تو کیا وہ جانو ہی تھا۔" وہ بڑبڑانے لگا۔ اور پھر وہ بھاگتا ہوا اس کمرے کی طرف گیا جہاں جانو کے بھائی بہن رات کو سوتے تھے ۔

.....○○.....

رام چند کے آنے کے تھوڑی دیر بعد ایک دفعہ پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ "بھیا۔ وہ رام چند ابھی ابھی آیا ہے ۔"

"رمضان اور حمیدہ کو لے کر فوراً اجاؤ ۔" جانو نے سرگوشی کی ۔ چند لمحوں کے بعد وہ رام چند کی حویلی کے باہر تھے ۔ باہر نکلنے کے بعد جانو نے دروازے کی باہر کی کنڈی چڑھائی دی تھی۔

.....○○.....

رام چند جب کمرے میں پہنچا تو اسے خالی پایا۔ وہ جانو اور اس کے بہن بھائیوں کو گالیاں دیتا حویلی کے دروازے کی طرف لپکا ۔ لیکن دروازے باہر سے بند ہو چکا تھا ۔ وہ پھر بھاگتا ہوا اپنے خاص کمرے کی طرف گیا۔ وہ یوں بے چین پھر رہا تھا جیسے اسے باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہو۔ اس نے دوبارہ حویلی سے رابطہ قائم کر کے حکم دیا۔ "عبدالحق کو جانو نے فرار کروایا ہے ۔ ان کے ساتھ جانو کی دو بہنیں اور ایک بھائی بھی ہے ۔ یہ میری حویلی کے قریب ہی ہوں گے ۔ تم ریلوے سٹیشن اور سڑک کی طرف جانے والے راستے کی ناکہ بندی کر دو۔ ایک آدمی پولیس اسٹیشن والے راستے کی طرف بھیج دو ۔ میں صبح تک وڈیرے کے ذریعے تھانیدار کو پیغام بھجوا دوں گا۔ ہاں ۔ ہاں ۔ تم

منظور پر نظر رکھو۔ مجھے بھی اس پر شک ہے...... نہیں نہیں۔ انہیں زندہ پکڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ۔ جہاں نظر آئیں سب کو بھون کر رکھ دو۔ عبدالحق اور جانو کے جسم میں اتنی گولیاں مارو تاکہ ان کی لاش کو دیکھنے والے دہشت سے منہ دوسری طرف کرلیں۔ اوور اینڈ آل"

.... ○○ ....

جانو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ گندم کے کھیت میں چھپا ہوا تھا۔ یہ کھیت تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ عبدالحق تھانے میں اکیلا ہی گیا تھا۔ وہ یہاں چھپ کر اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب ایک لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ بچے تھک چکے تھے۔ ننھی حمیدہ کئی دفعہ پانی مانگ چکی تھی۔ لیکن جانو انہیں اکیلا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب اس نے رونا شروع کیا تو اس نے اسے چپ کرایا اور پانی کی تلاش میں کھیت سے باہر نکل آیا۔ اش وقت صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ آدھ پونے گھنٹے کی تلاش کے بعد کھیتوں کے باہر ایک جھونپڑی کے پاس اسے پانی کا ایک مٹکا نظر آیا۔ مٹکے میں تھوڑا سا پانی موجود تھا۔ اس نے مٹکا اٹھایا اور تقریباً بھاگتا ہوا واپس کھیتوں کی طرف چل دیا لیکن جب وہ کھیتوں میں پہنچا تو وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے پورا کھیت چھان مارا۔ لیکن ان کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح انہیں آوازیں دینے لگا ۔ لیکن اس کی آوازیں فضا میں گم ہو کر رہ گئیں۔ پھر اسے ایک ہمدرد آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا جانو۔ خیریت تو ہے۔؟"

اس نے چونک کر آواز دینے والے کی طرف دیکھا............

آگے کیا ہوا؟ آئندہ شمارے میں پڑھئے............

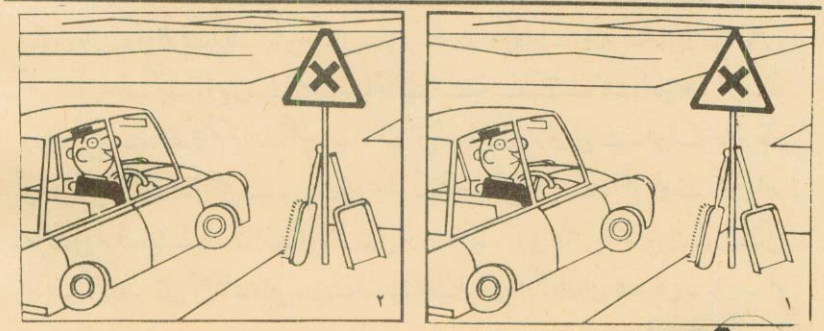

فرق تلاش کیجئے

مسلمان خوفزدہ نہیں ہوتا

ساجد سعید

دنیا میں ایسا کوئی انسان موجود نہیں جس کو کسی چیز کا خوف نہ ہو۔ ہر شخص کسی نہ کسی خوف میں ضرور مبتلا ہوتا ہے چاہے اس کی نوعیت بڑی ہو یا چھوٹی۔ مثال کے طور پر عارف ایک ہونہار طالب علم ہے جس کا عقیدہ مضبوط ہے اور جو ایک صحت مند دماغ اور جسم بھی رکھتا ہے لیکن جب اس کے سامنے ایک ننھا اور معمولی سا کیڑا لایا جائے تو وہ ڈر اور خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے ایسا کیوں؟ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ ہم خوفزدہ کیوں رہتے ہیں اور خوفزدہ ہونے سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔

اصل میں خوف ہمارے جذبات کا ایک بنیادی اور لازمی جزو ہے اور کوئی انسان خوف کے جذبے سے خالی نہیں۔ خوف کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ خوف جو فطری ہو اور ایک غیر فطری۔ فطری خوف انسانی زندگی میں ایک بامقصد اور تعمیری کردار ادا کر سکتا ہے۔ کیونکہ فطری خوف ہمیشہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ انسان کے لئے خطرے کے الارم کا کام دیتا ہے۔ ہزاروں سال پہلے جب انسان غاروں اور درختوں پر زندگی بسر کرتا تھا تو اس وقت اس کو اپنی زندگی کی بقا اور غذا کے حصول کے لئے جنگلی جانوروں تک سے لڑنا پڑتا تھا۔ اس وقت انسان غیر محفوظ تھا لیکن ایک فطری خوف ہونے کے باوجود وہ اپنی زندگی کی بقاء کے لئے ہر خطرے سے لڑنے کے لئے تیار رہتا۔ اگر ہم آج کے اس جدید اور قدیم دور کا موازنہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کل کے انسان سے زیادہ ترقی تو آج کے انسان نے کی ہے لیکن ہمارے وہ فطری خوف اب بھی پہلے کے انسان کی طرح مختلف جدید صورتوں میں

موجود ہیں ۔ زمانہ قدیم کے بہت سے اوہامی باتوں کا جھوٹا پٹارہ سائنس کی موجودہ ترقی نے کھول کر رکھ دیا۔ فطری خوف انسان کو مشکل اور خطرے کے وقت محفوظ رکھتا ہے ۔ مثال کے طور پر آپ سڑک پار کر رہے ہیں آپ کا منہ دائیں جانب ہے اور بائیں جانب سے کوئی تیز رفتار گاڑی آ رہی ہے اچانک آپ کی چھٹی حس آپ کو گاڑی کی آمد کی جانب متوجہ کرتی ہے اور آپ اس طرح اس حادثہ سے بچ جاتے ہیں اس وقت آپ کے اندر ایک خوف کی لہر سی دوڑ جاتی ہے کہ کہیں گاڑی آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچادے۔ اس کے رد عمل میں آپ پیچھے ہٹ جاتے ہیں تاکہ آپ کو گاڑی سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہی فطری خوف کی بہترین مثال ہے اس کے برعکس بعض لوگ ایسے خوف کا شکار رہتے ہیں جس کی کوئی وجہ نہیں ہوتی اور وہ غیر فطری ہوتا ہے۔ اس غیر فطری خوف کی وجہ سے بعض اوقات ہمیں بڑی شرمندگی اور ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ بڑی عجیب صورتحال ہے کیونکہ ایک طرف تو سائنس اور اسلام نے ان تمام اوہامی تصورات اور خیالات کو بے بنیاد اور غیر طبعی قرار دیا اور اس سے بچنے کی تلقین کی اور دوسری طرف آج کا مسلمان لغو اور بے بنیاد خوف کو اپنا کر اپنی توانائیاں اور قوتوں کو ضائع کرتا ہے ۔ انہی بے بنیاد قوتوں کی وجہ سے انسان اپنا سکون تک برباد کر دیتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک کی سورہ انعام کی پندرہویں آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "کہہ دیجئے میں ڈرتا ہوں اگر میں نافرمانی کروں اپنے رب کی، ایک بڑے دن کے عذاب سے" ۔ اور سورہ لقمٰن میں ہے کہ "ڈرو اپنے رب سے اور اس دن سے" ۔ اگر انسان عقل و شعور سے یہ بات سمجھنے کی کوشش کرے کہ خوف کوئی ایسی چیز نہیں جس سے اس کو کوئی نقصان ہو تو یہ بات دعوے اور بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ صرف اس ایک سوچ سے وہ اپنے اندر کافی تبدیلی لا سکتا ہے موت سے خوف کا اظہار بھی ہمارے ہاں عام ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی جاندار شے موجود نہیں جس کی موت واقع نہیں ہوتی۔ ہمیں موت سے کیوں ڈر لگتا ہے ؟ یہ ایک فطری بات ہے مثال کے طور پر اگر موت نہ ہوتی تو دنیا میں انسانوں، مویشیوں اور دیگر جاندار اشیاء کی بہتات کی وجہ سے دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا اور انسان بے اندازہ مصیبتوں کا شکار ہو جاتا۔ آپ اگر روزانہ کی زندگی کا مشاہدہ کریں تو کوئی جوانی میں ہی مر جاتا ہے تو کوئی بڑھاپے میں لقمہ اجل بنتا ہے الغرض خدا کے اس اعتدالی نظام میں ایک مقصد پوشیدہ ہے موت برحق ہے اس سے ڈرنا بھی ایک دینی اور فطری تقاضہ ہے لیکن یہ کوشش اور خیال کرنا کہ ہم اس حادثے سے بچ جائیں یہ ایک فضول سی بات ہے۔

بعض خوف کی صورتیں ہمارے معاشرے میں عام ہیں جن میں اندھیرے کا خوف، ہجوم کا خوف، آگ کا خوف، اونچائی کا خوف، روحوں کا خوف، مردوں کا خوف، شور کا خوف، یہی وہ خوف ہیں جو انسان کے اندر احساس کمتری پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اپنے آپ سے پیار اور اپنی ذات کا احترام ہو انسان یہی چاہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو تسخیر کر سکے لیکن اکثر اوقات انسان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کسی محفل میں بیٹھے ہیں اور وہاں گرما گرم گفتگو ہو رہی ہے آپ چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس گفتگو میں برابر شریک ہوں لیکن یہ ڈر اور خوف آپ کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے کہ کہیں میری گفتگو کا مذاق نہ اڑایا جائے یا دوسروں کی گفتگو اور ذہانت مجھے ان سے پیچھے نہ دھکیل دے اگر اس وقت آپ کے اندر خود اعتمادی اور تھوڑی ذہانت کا عمل دخل ہوتا تو آپ کی ٹوٹی پھوٹی گفتگو بھی کافی اثر انگیز نتائج مرتب کرتی۔ اسی طرح بعض بچے جن بھوت اور بدروحوں کے تصور سے خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ بدروحوں اور بھوتوں کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ جب ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور رسول ؐ کے ذریعے اس نے ہمیں جو باتیں بتلائیں ان کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ حقیقت رکھتا ہے اور اس نے ان تمام بے بنیاد تصورات کو جھوٹا قرار دیا ہے اور پھر ہم ان اوہامی باتوں کو اپنے ذہن میں جگہ دیں یہ کسی طرح سے بھی مناسب نہیں۔ انسان اور جنات اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق ہیں اس کے علاوہ کسی اور غیر مخلوق کا تصور فرشتوں کے علاوہ رکھنا اسلام کی نگاہ میں ٹھیک نہیں۔

عالم طفولیت میں ایک طالب علم جس خوف کا عمومی طور پر شکار ہوتا ہے وہ اندھیرے کا خوف ہے یہ ایک جبلی جذبہ ہے اگر ہم یہ سوچیں کہ زمانہ قدیم کا انسان کس طرح اندھیرے غاروں میں زندگی بسر کرتا تھا اور اس وجہ سے اسے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا یہ بات سوچ کر فطرتاً ہمارے اندر اندھیرے کا خوف کم ہو جاتا ہے کیونکہ زمانہ قدیم کے انسان کی نسبت آج کا جدید انسان ہزاروں گنا زیادہ ترقی کر چکا ہے جس کی وجہ سے وہ بہت سے اوہامی تصورات کو بے نقاب کر کے ان پر قابو پا چکا ہے۔ مختصر یہ کہ غیر فطری خوف کوئی چیز نہیں یہ صرف انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ ان تمام اقسام کے خوف کا تدراک کرنے اور بچنے کے لئے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنا تعلق باللہ مضبوط کریں اسلام کے ذریں اصولوں کی پابندی کریں ۔اسلام سے قربت اور منفی خیالات سے اجتناب یہ ایسے بنیادی عوامل ہیں جو آپ کو بے بنیاد اور غیر طبعی خوف سے بچنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

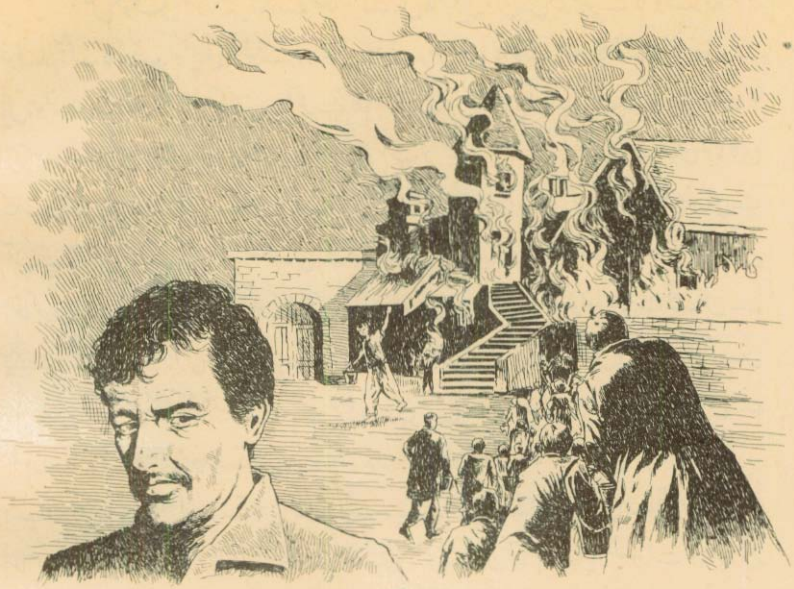

سُناؤں تمہیں بات اِک رات کی

پھر دیکھتے ہی دیکھتے حویلی شعلوں کی لپیٹ میں آگئی

محمد عادل منہاج

میں ایک پرائیویٹ سراغرساں ہوں۔ سراغرسانی کا پیشہ میں نے اپنے شوق کی وجہ سے اپنایا ہے۔ جب مجھے کوئی کیس ملتا ہے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسے حل کرنے میں لگ جاتا ہوں۔ کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ہولناک اور عجیب و غریب قسم کے کیس حل کئے ہیں۔ جن پر مجھے آج بھی یقین نہیں آتا۔ ان میں سے ایک واقعہ میں آپ کی دلچسپی کے لئے پیش کرتا ہوں۔

اس روز میں ایک معاملہ نمٹا کے دوسرے شہر سے کار میں واپس آ رہا تھا۔ شہر ابھی چھ سات گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے ۔ دھوپ آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا نظر آ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹکڑا پھیلنے لگا اور پورے آسمان پر چھا گیا۔ ایک دم چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اور پھر بوندا باندی شروع ہو گی۔ میں نے کار کے وائپر چلا دیئے اور ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ بارش تیز ہوتی گئی اور پھر تو گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یہ موسم دیکھ کر میں پریشان ہو گیا کیونکہ اندھیرا بہت پھیل گیا تھا اور آس پاس آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ مجھے رات وہاں گزار لینا چاہئے ورنہ میں اس موسم میں کہیں پھنس سکتا ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے کار کا رخ گاؤں کی طرف موڑ دیا۔ اندھیرا مزید گہرا ہو چکا تھا۔ اچانک بجلی کی چمک میں مجھے ایک پرانی سی حویلی نظر آئی۔ گاؤں اس حویلی سے ایک فرلانگ آگے تھا۔ شاید یہ حویلی گاؤں کے سردار کی تھی۔ میں بہت خوش ہوا کہ چلو رات گزارنے کا ٹھکانہ ملا۔ اپنی کار میں نے حویلی کے سامنے روک دی۔ کار میں سے چند ضروری چیزیں نکال کر میں اترا اور حویلی کے دروازے پر زور دار انداز میں دستک دی۔ سناٹے میں آواز دور دور تک گونج گئی۔ کافی دیر گذر گئی مگر کوئی نہ آیا۔ میں بری طرح بھیگ رہا تھا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ آہستہ آہستہ میں نے پورا دروازہ کھول دیا۔ چڑ چڑاہٹ کی زور دار آواز گونجی اور ساتھ ہی کتوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ٹارچ روشن کی اور اندر داخل ہو گیا۔ حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ جگہ جگہ جالے لگے ہوئے تھے۔ ہر طرف گرد کی موٹی تہیں تھیں۔ "حیرت ہے، اتنی شاندار حویلی خالی پڑی ہے۔" میں بڑبڑایا اور ایک کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ دروازے کو دھکیلا۔ کئی چیزیں بیک وقت میری طرف لپکیں۔ میں گھبرا گیا تیزی سے پیچھے ہٹا ٹارچ میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔ "دھت تیرے کی یہ تو چمگادڑیں تھیں۔" میں ہنسا اور ٹارچ اٹھالی۔ اس کمرے میں ٹھہرنا تو ممکن نہیں تھا۔ میں مزید آگے بڑھا اور پھر دھک سے رہ گیا۔ حویلی کا پچھلا حصہ جلا ہوا تھا یوں لگتا تھا یہاں کافی عرصے پہلے آگ لگی تھی۔ میں جلے ہوئے حصے کو بغور جائزہ لینے لگا۔ اچانک کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ میں بڑبڑایا اور پھر میں وہاں سے واپس پلٹ گیا۔ رات کے اندھیرے میں جلے ہوئے حصے کی وجہ سے عجیب دہشت سی طاری ہو رہی تھی۔ میں

نے سوچا صبح اس جگہ کا جائزہ لوں گا۔ میں حویلی کے اگلے حصے کی طرف آیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھولا اس بار چمگادڑوں سے ملاقات نہ ہوئی یہ کمرہ بھی گرد سے اٹا پڑا تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک طرف مشعل موجود تھی۔ میں نے مشعل جلائی اور ٹارچ بجھادی پھر پلنگ پر بچھی چادر جھاڑی ہر طرف گرد ہی گرد ہو گئی۔ چادر جھاڑ کر بچھائی اور جوتے اور کوٹ اتار کر لیٹ گیا۔ اگرچہ اب ذہن پر کچھ خوف طاری تھا۔ مگر پھر بھی میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بارش اسی زور دار طریقے سے ہو رہی تھی۔ میں غنودگی کے عالم میں تھا کہ اچانک چیخ و پکار کی آواز سنائی دی۔

"بچاؤ..... بچاؤ" بڑی دردناک آوازیں تھیں۔ میں بستر سے اچھل پڑا۔ حویلی میں کوئی نہیں تھا پھر یہ آوازیں کیسی؟ میں نے جیب سے پستول نکال لیا۔ آوازیں ایک دم ختم ہو گئیں۔ میں پریشان ہو گیا۔ ساتھ ہی کتوں کے رونے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ آخر میں نے مشعل اٹھائی اور کمرے سے باہر نکلا۔ اب میں پچھتا رہا تھا کہ حویلی میں رکنے سے بہتر تھا کہ آگے گاؤں میں چلا جاتا۔ نیند تو اچاٹ ہو ہی چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ ان آوازوں کا سراغ لگانا چاہئے۔ میں ایک بار پھر حویلی کے جلے ہوئے حصے کی طرف بڑھا۔ ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں پستول تھا۔ برآمدے میں پہنچا تھا کہ اچانک کسی نے مجھ پر چھلانگ لگائی ساتھ ہی غراہٹ گونجی کوئی چیز مجھ پر گری۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور مشعل ہاتھ سے نکل کر گر پڑی اور آگ بجھ گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میرے چہرے پر جلن ہو رہی تھی۔ کوئی چیز دوڑتی چلی گئی۔ میں نے چہرے ہاتھ پھیرا تو پتہ چلا کہ چہرے پر خراشیں پڑ گئی ہیں۔ "شاید بلی تھی یا پھر....." میں الجھن میں بڑبڑایا۔ میں نے اندھیرے میں فرش پر ادھر ادھر مشعل تلاش کی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد مشعل مل گئی۔ میں نے مشعل جلانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر پھر ٹھٹھک گیا۔ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے یہ کون چل رہا تھا۔ آواز جلے ہوئے حصے کی طرف سے آ رہی تھی اور پھر قدموں کی آواز میری جانب بڑھنے لگی۔ میری رگ رگ میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس غضب کی تاریکی میں کوئی میری جانب بڑھ رہا تھا مگر کون.....؟ قدموں کی آواز میرے قریب آتی گئی۔ میں خوف کے عالم میں پیچھے ہٹتا گیا۔ مگر آواز برابر میرے قریب آتی گئی اور پھر ایک دم مشعل میں آگ بھڑک اٹھی۔ قریب تھا کہ دہشت کے عالم میں مشعل میرے ہاتھ سے نکل جاتی مگر میں نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ پستول پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ میرے سامنے ایک چالیس پچاس سالہ

شخص کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا جیسے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "کک..... کون ہو تم....." میں کانپتی آواز میں بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" آواز ابھری مگر اس شخص کے ہونٹ نہیں ہلے تھے یہ دیکھ کر مجھ پر مزید دہشت طاری ہو گئی۔ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ "آؤ" آواز پھر ابھری اور وہ شخص حویلی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ حویلی کے دروازے پر پہنچ کر میں نے مشعل بجھادی اور ٹارچ لے کر اس کے پیچھے باہر نکل آیا۔ باہر آکر میں حیران رہ گیا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ وہ شخص میری کار میں بیٹھ گیا۔ پریشانی کے عالم میں میں بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "گاؤں کی طرف چلو" آواز پھر ابھری اور میں نے ایک معمول کی طرح اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔ میری خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بارش بالکل بند تھی البتہ بادل گرج رہے تھے اور بجلی بھی زور دار طریقے سے چمک رہی تھی۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر میں چونک اٹھا۔ مجھے ایک جگہ آگ کے شعلے اٹھتے نظر آئے۔ میری کار کا رخ بھی اس طرف ہو گیا۔ اور پھر میں اس حویلی کے سامنے پہنچ گیا۔ جس میں آگ لگی ہوئی تھی۔ لوگ دھڑا دھڑ پانی ڈال رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ میں بھی تیزی سے کار سے اترا۔ اس شخص نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ میں نے اک نظر اس کی طرف دیکھا وہ پراسرار نگاہوں سے آگ کو دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی میں حویلی کی طرف دوڑا اور آگ بجھانے میں لوگوں کی مدد کرنے لگا مگر آگ بھڑکتی جا رہی تھی اور پھر پوری حویلی راکھ کا ڈھیر بن گئی اور آگ آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ "افسوس! نواب اکبر علی بھی جل کر ختم ہو گئے۔" ایک شخص بولا۔

"انہیں اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔" دوسرا بڑبڑایا۔ "کیا مطلب!" میں چونکا اور پھر گاؤں کے لوگوں نے مجھے جو کہانی سنائی۔ وہ کچھ یوں تھی کہ نواب اکبر علی اور نواب اصغر علی پہلے اس حویلی میں رہتے تھے۔ مگر لالچی اکبر علی نے جاگیر پر قبضہ کرنے کے لئے ایک دن اپنے بھائی کے کمرے میں آگ لگوادی خود وہ اس دن شہر گیا ہوا تھا تاکہ کوئی اس پر شک نہ کر سکے۔ جب حویلی میں آگ بھڑکی تو لوگ اسی طرح آگ بجھانے دوڑے۔ حویلی میں اصغر علی اور اس کے بیوی بچے چیخ رہے تھے۔ مگر کوئی انہیں بچا نہ سکا وہ جل کر ختم ہو گئے اور پھر زور دار بارش شروع ہو گئی جس سے آگ بجھ

گئی اس طرح بقیہ حویلی جلنے سے بچ گئی۔ اصغر علی اور اس کے بیوی بچوں کے مرنے پر حویلی کے کتے بلند آواز میں رو رہے تھے۔ اگلے دن اکبر علی واپس آیا تو اس نے مگرمچھ کے آنسو بہائے اور اپنے بھائی اور دوسروں کی جلی ہوئی لاشوں کو حویلی کے صحن میں ہی دفنا دیا۔ اکبر علی کا خیال تھا کہ وہ جلے ہوئے حصے کو ٹھیک کروائے گا مگر وہ حویلی میں نہ رہ سکا۔ ہر رات وہاں چیخ وپکار کی آوازیں گونجتیں۔ کتے روتے حویلی آسیب زدہ مشہور ہو گئی اور اس کے آس پاس کی آبادی ختم ہو گئی۔ گاؤں کچھ آگے آ گیا۔ اکبر علی نے بھی یہاں حویلی بنوالی اور آج پھر وہی ہوا اور اکبر علی اپنی حویلی میں بجلی گرنے سے جل کر مر گیا۔ اسے قدرت کی طرف سے سزا مل گئی۔ میں یہ داستان سن کر حیران رہ گیا اور کچھ خوف زدہ ہو گیا۔ تو کیا جو شخص میرے ساتھ کار میں آیا ہے وہ اصغر علی ہے اور اپنے بھائی کو جلتے ہوئے دیکھنے آیا ہے مگر..... مگر..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تیزی سے اپنی کار کی طرف دوڑا اور پھر دھک سے رہ گیا۔ کار میں وہ شخص نہیں تھا۔

شاید آپ کو اس واقع پر یقین نہیں آیا مگر اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ اس واقعے پر تو خود مجھے آج تک یقین نہیں آیا۔ یہ اور اس جیسے نہ جانے کتنے پراسرار واقعات میرے ساتھ پیش آ چکے ہیں جن پر میں جتنا غور کرتا ہوں الجھتا چلا جاتا ہوں۔

ڈاکٹر کے پاس ایک آدمی آیا اور گھر جا کر مریض دیکھنے کی فیس پوچھی۔

ڈاکٹر نے جواب دیا "پچیس روپے" "تو جلدی کیجئے میری بیوی گھبرا رہی ہوگی۔" اس آدمی نے کہا۔

ڈاکٹر نے سمجھا کہ اس کی بیوی بیمار ہے چنانچہ ڈاکٹر اپنی کار نکال کر اس آدمی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس آدمی نے کافی دور جا کر ایک گھر کے سامنے کار رکوائی اور ڈاکٹر کو پچیس روپے دیئے اور شکریہ ادا کیا۔

"آپ مریضہ کو نہیں دکھائیں گے" ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی نہیں شکریہ" وہ شخص بولا "جناب میری بیوی بیمار نہیں، مجھے گھر آنے میں دیر ہو گئی تھی اور کوئی ٹیکسی والا پچیس روپے سے کم میں اس طرف آنے کو تیار نہ تھا اس لئے آپ کو زحمت دی۔"

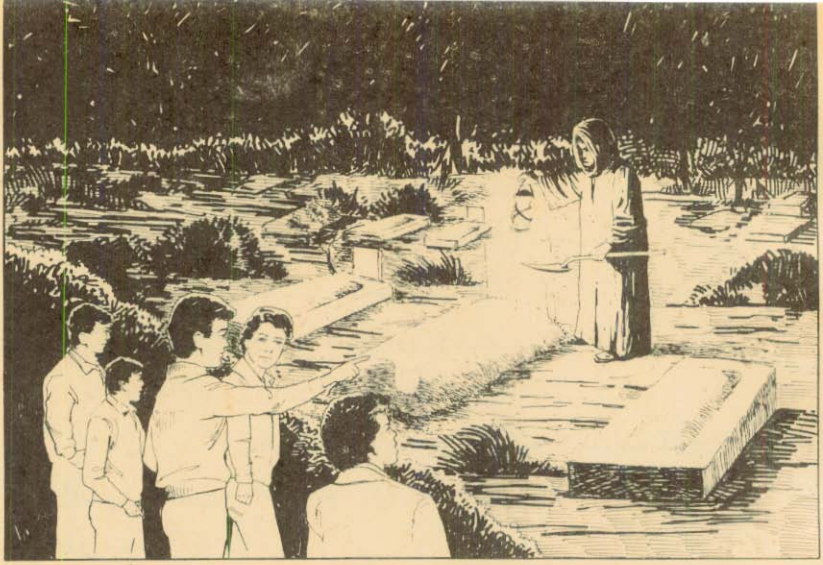

جب ہم نے بھوت کی اصلاح کی

فاٹر کی آواز سنتے ہی بھوت بھاگ کھڑا ہوا

اورنگ زیب عالمگیر

رات کافی بیت چکی تھی جب میں اپنے گاؤں کے قبرستان کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں سفید لبادہ اوڑھے ہوئے کوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا قبرستان کی طرف آرہا ہے۔ گاؤں میں پہلے ہی مشہور تھا کہ قبرستان میں بھوت آتے ہیں ۔ اور کئی لوگوں کا دعویٰ تھا کہ اس بھوت کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور سردی کے سخت موسم میں سر پر پاؤں تک پسینہ بہنے لگا۔ میں نے دل میں یہی خیال کیا کہ یہ بھوت ہے اور آج میرا بچنا محال ہے۔ میں دل ہی دل میں جتنی قرآنی آیات یاد تھیں پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بھوت ایک تازہ قبر پر کھڑا کدال سے قبر کھود رہا ہے۔ کدال چلانے کی لگاتار آواز سے میرے دل میں شک سا ہوا لیکن میں راستہ کاٹ کر اپنے گھر چلا گیا۔

خوف اور تجسس سے تمام رات آنکھوں میں کاٹی۔ صبح چند دوست ملنے کے لئے آئے تو انہوں نے میری سرخ آنکھوں کو دیکھ کر پوچھا۔ "یار کیا بات ہے رات کو نیند نہیں آئی کیا!" میں نے تمام واقعہ انہیں کہہ سنایا میری بات سن کر تمام دوستوں نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ "پاگل ہوئے ہو۔ بھلا بھوت بھی کدال چلاتے ہیں۔" سب دوستوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ قبرستان میں جا کر بھوت کے راز سے پردہ اٹھائیں گے۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ میں کھلونا نما پستول جو کہ دیکھنے میں بالکل اصلی اور چلانے میں زور دار دھماکہ کی آواز نکالتا ہے لے چلوں گا۔

شام ہوئی تو ہم چاروں دوست اکٹھے ہو کر قبرستان کی طرف چل پڑے۔

قبرستان میں درختوں اور خود رو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ ہم نے ایک گھنے درخت کو منتخب کیا اور اس کی کھوہ میں دبک کر بیٹھ گئے۔ چند قدم کے فاصلہ پر وہی قبر نظر آ رہی تھی۔ اور اس پر سے تھوڑی سے مٹی اتری ہوئی تھی۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ ہماری حالت خراب ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹہ مزید گزر گیا۔ ہم سب اب تھک چکے تھے۔ سب نے یہی پروگرام بنایا کہ اب گھر چلتے ہیں۔ بھوت آج نہیں آئے گا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہی تھا کہ ہمیں قدموں کی چاپ سنائی دی۔

تھوڑی دیر بعد گاؤں سے وہی بھوت سفید لبادہ اوڑھے آتا دکھائی دیا۔ ہم نے دم سادھ لیا۔ اور انتظار کرنے لگے۔ ہم نے دیکھا کہ بھوت اسی کل والی قبر پر کدال چلانے لگا۔ قبر کھودتے ابھی اسے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ہمارے ایک دوست نے اٹھ کر اسے للکارا اور ساتھ ہی نقلی پستول سے فائر کیا۔ دھماکہ کی زور دار آواز سے درختوں پر سوئے ہوئے پرندے اڑنے لگے۔ اور شور مچانے لگے۔ بھوت نے کدال وہیں پھینکی اور گاؤں کی طرف بھاگ نکلا۔ ہم نے تھوڑی تک بھوت کا تعاقب کیا اور بلا خر اسے جالیا۔ گاؤں بھی نزدیک آ گیا تھا۔ ہم نے اس کا سفید لبادہ اتارا تو وہ ساتھ کے گاؤں کا ایک نوجوان تھا۔ ہمارے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ کفن چرا کر ٹوپیاں اور جیکٹ بنا کر فروخت کرتا ہے۔ اس نے ہم سب سے معافی مانگی اور آئندہ کفن چرانے سے توبہ کر لی ہم نے رحم کھا کر اسے چھوڑ دیا۔

گاؤں میں اب بھی بھوت والی بات مشہور ہے لیکن ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ بھوت اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

ایک خوفناک فضائی حادثہ

ترجمہ :- ایس کے عالم

یہ اندوہناک فضائی حادثہ امریکی شہر سیوکس سٹی (آئیووا) میں پیش آیا۔ ایک جمبو جیٹ کسی فنی خرابی کی وجہ سے عین رن وے پر آگرا اور ہولناک شعلوں نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر طرف واویلا مچ گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سو گیارہ انسانی جانیں فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔ امدادی پارٹیاں، فائر بریگیڈ طبّی عملہ فوراً حرکت میں آگئے اور یوں بد قسمت فلائٹ نمبر ۳۲۳ کے ایک سو پچاس مسافروں کو بچالا گیا۔ ان تصاویر میں آپ حادثے کے ہولناک مناظر دیکھ سکتے ہیں جو اس وقت بد قسمت طیارے کے مسافروں کو پیش آرہے تھے۔

۱۔ ”میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا تو درخت انتہائی تیزی سے قریب آتے محسوس ہوئے۔ میں نے خوف سے اپنا سر اپنے کانپتے ہوئے گھٹنوں میں چھپالیا اور انتظار کرنے لگا.....“ ایک مسافر کا بیان۔

۲۔ ”میں آج تک ان مہیب شعلوں کی حدت کو فراموش نہیں کر سکی ہوں۔ دھوئیں کا ایک طوفان تھا۔ جس نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر طرف دھاتوں، شیشے اور پلاسٹک کے ساتھ انسانی گوشت کے جلنے کی بو محسوس ہو رہی تھی“۔ ایک خاتون مسافر کے تاثرات۔

۳۔ ”رن وے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہاں کوئی طاقتور اور مہلک بم پھٹا ہو۔ جہاں تک نظر جاتی تھی لاشیں، طیارے کے ٹکڑے اور چیزیں بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اسے بھی معجزہ ہی کہا جائے گا کہ کچھ لوگ اس ہولناک حادثے میں بچ رہے“۔ ایک فوٹو گرافر کا آنکھوں دیکھا حال۔

۴۔ ”کچھ لوگوں کو معمولی خراشیں آئی تھیں اور کچھ لوگ صرف ایک لمحے کے اندر اندر موت کے

اس حادثے میں کچھ لوگ تو فوراً ہی موت کے منہ میں چلے گئے اور کچھ بالکل محفوظ رہے۔ اسے معجزہ ہی کہا جائے گا۔ (فائرمین کا بیان)

کچھ لوگ اپنے عزیزوں کی دائمی جدائی پر نوحہ کناں تھے اور کچھ خوف سے پتھرائے ہوئے تھے (ایک امدادی کارکن کا بیان)

جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے

منہ میں چلے گئے۔ "ایک فائر مین۔

۔ "ہر شخص حواس باختہ اور اپنے عزیزوں کے لئے پاگل نظر آرہا تھا۔ اپنے عزیزوں کی جدائی واقعی جان لیوا ہوتی ہے۔" امدادی کارکن۔

۔ "میں نے ایک بچے کو بالکل ساکت زخمی حالت میں پڑے دیکھا۔ قریب گیا تو وہ زندہ تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی" ۔ عینی شاہد

۔ "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے" ۔ بدقسمت طیارے کا واحد خوش قسمت ننھا مسافر جو بالکل محفوظ رہا۔ اسے خبر بھی نہ ہوگی کہ وہ کس عظیم حادثے سے گزرا ہے۔

خزانے کی تلاش

خزانے کے لالچ نے اُسے موت کے قریب پہنچا دیا

وسیم عباّس شیخ

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ چاند بھی بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا تھا۔ جس کی وجہ سے روشنی کچھ اتنی زیادہ نہ تھی۔ مگر وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے اس کی رفتار اچانک تیز ہو جاتی اور وہ تیزی سے اونچی نیچی قبریں پھلانگنا شروع کر دیتا۔ آخر کار ایک جگہ پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ ایک جگہ سے تھوڑی سی مٹی ہٹا کر اس نے ایک پھاوڑا نکالا اور زمین کھودنے لگا۔ اس کا نام ہارون تھا۔ آج سے ایک ہفتہ قبل اسے ایک خط موصول ہوا تھا۔ جس میں لکھا

تھا کہ شہر کے بڑے قبرستان میں شمال کی طرف پندرہ قبریں چھوڑ کر ایک برگد کا بوڑھا درخت آئے گا اس درخت کے دائیں طرف بیس قدم چھوڑ کر زمین کھودی جائے تو بہت بڑا خزانہ بر آمد ہو گا۔ ہارون تو سدا کا دولت کا پجاری تھا۔ فوراً قبرستان پہنچ گیا اور جگہ پہچان کر وہاں ایک پھاوڑا چھپا آیا تھا۔ اور آج وہ جلدی جلدی زمین کھود رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک تھیلا پڑا تھا۔ جس میں ایک ٹارچ، ایک ۳۲ بور کا پستول چند گولیاں اور ایک ڈبے میں کچھ کھانا تھا۔

اس کے ہاتھ بڑی تیزی سے کام کر رہے تھے۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ جلد سے جلد خزانہ حاصل کر لے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے سر سے ایک سخت چیز ٹکرائی اس نے ڈرتے ڈرتے مڑ کر دیکھا ایک مردہ کفن اوڑھے اس کے سامنے کھڑا جھوم رہا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ دیکھ سکا اور چیخ مار کے بے ہوش ہو گیا۔

ڈاکٹر فیض علی کے کلینک میں رات کو ایک مریض بے ہوشی کے عالم میں لایا گیا تھا۔ اب تک وہ مکمل طور پر بے ہوش تھا۔ دن کے بارہ بجے مریض نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اپنے سامنے سفید لباس میں ملبوس ایک ڈاکٹر کو کھڑے پایا۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر اس کے منہ سے تیز چیخ نکلی:

"مم...... مم...... مردہ!"

وہ بے ہوش ہو گیا۔

ڈاکٹر فیض علی بیہوش مریض کو انجکشن لگا کر اپنے چیمبر میں آئے تو اچانک دروازہ کھلا اور دو آدمی گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ "ڈاکٹر صاحب! کل رات جو مریض بے ہوشی کے عالم میں لایا گیا تھا اس کی طبیعت اب کیسی ہے؟" ایک نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"اس کے اعصاب بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ابھی تک ذہنی توازن بحال نہیں ہوا ہے۔" ڈاکٹر فیض علی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اس آدمی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ سب کچھ ہوا کیسے؟" ڈاکٹر فیض علی نے سوال کیا۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا نام عاصم ہے اور ہارون میرا دوست ہے، بہت ہی بے تکلف دوست۔ آج سے ایک ہفتہ قبل باتوں باتوں میں ہارون نے دعویٰ کیا کہ وہ بہت بے باک اور نڈر انسان ہے اور

کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ ہم نے اس کے اعصاب کا امتحان لینے کے لئے ایک ترکیب سوچی اور اس کے نام ایک خط خفیہ طور پر لکھا۔ جس میں ہم نے ایک قبرستان میں خزانے کی نشاندہی کی۔ ہمارے خیال کے عین مطابق ہارون خزانہ تلاش کرنے وہاں جا پہنچا۔ جب وہ زمین کھود رہا تھا۔ ہم نے کفن نما سفید لباس پہن کر اسے ڈرا دیا۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ تو ہم بھی وہاں سے بھاگ آئے۔ قبرستان کا گورکن چیخ سن کر آیا اور وہ ہارون کو اٹھا کر ہسپتال لے آیا۔ ساری داستان سن کر ڈاکٹر فیض علی نے کہا۔

"مسٹر عاصم! آپ نے اپنے دوست سے ایک سنگین مذاق کیا تھا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس میں آدمی کی جان بھی جا سکتی ہے اور وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ سن کر ہارون کے دونوں دوستوں نے شرمندگی سے اپنا سر جھکا لیا۔

ایسی جلدی بھی کیا ہے

کھانا کھاتے ہوئے بے صبری کا مظاہرہ کبھی نہ کیجئے
کیوں کہ عجلت میں کھایا ہوا کھانا ہاضمے کی تکالیف
اور نظامِ ہضم میں خرابی کا باعث بن سکتا ہے۔

تحمل کے ساتھ
کھانے کی عادت
آپ کی صحت
کی ضامن ہے۔

(اشتہار ادارہ آنکھ مچولی)

گنی چُنی معلومات

عقیل عباس جعفری

اعداد کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دُنیا کی اہم شخصیات ہوں یا بڑے بڑے واقعات ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح اعداد سے ضرور بنتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے دُنیا بھر کی اہم معلومات پر مبنی یہ سلسلہ ہم ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتے ہیں صفر سے شروع ہونے والا سلسلہ دیکھیے کہاں تک جاتا ہے۔

(۹۵)

- ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو آسٹریلیا اور پاکستان کے درمیان کھیلے جانے والے ٹیسٹ میچ کے پہلے دن صرف ۹۵ رنز بنائے گئے تھے۔ جو ایک دن میں کم سے کم اسکور کا عالمی ریکارڈ ہے۔
- انسانی جسم میں ۹۵٪ پانی ہوتا ہے۔
- ۱۵۱۷ء میں مارٹن لوتھر نے عیسائی مذہب میں ۹۵ اصلاحات کا مطالبہ کیا تھا۔
- مریخ کی فضا کا ۹۵٪ کاربن ڈائی آکسائیڈ پر مشتمل ہوتا ہے۔
- آسٹریلیا کے مشہور کرکٹر سر ڈان بریڈمین کا فرسٹ کلاس کرکٹ میں اوسط ۹۵٫۱۴ رنز فی اننگ تھا۔
- جزیرہ مالٹا کا رقبہ ۹۵ مربع میل ہے۔
- سیّارہ زحل کا وزن زمین سے ۹۵ گنا زیادہ ہے۔
- فولاد میں ۹۵٪ لوہا اور کانسی میں ۹۵٪ تانبا ہوتا ہے۔

(۹۶)

- کرکٹ کے بلّے کی لمبائی ۹۶٫۵ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔
- ہالینڈ کا مشہور شہر ایمسٹرڈیم ۹۶ جزیروں کو بذریعہ پل ملا کر بنایا گیا ہے۔

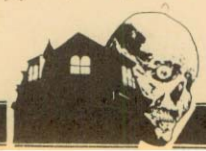

- برِّصغیر میں اتوار کی ہفتہ وار تعطیل کا آغاز ۱۸۸۱ء سے ہوا۔ پاکستان میں یکم جولائی ۱۹۷۷ء کو اتوار کی بجائے جمعہ کی ہفتہ وار چھٹی کا آغاز ہوا اور یوں پاکستانی علاقے سے انگریزوں کی یہ ۹۶ سال پرانی نشانی ختم ہوئی۔
- چھاپہ خانہ کے موجد ولیم کیکسٹن نے اپنے ویسٹ منسٹر پریس میں کُل ۹۶ کتابیں چھاپی تھیں۔
- امریکہ کی ۹۶٪ آبادی عینک استعمال کرتی ہے۔
- دنیا میں ۲۴ ہزار فٹ سے اونچی چوٹیوں کی تعداد ۱۰۹ ہے۔ جن میں سے ۹۶ ہمالیہ/قراقرم کے علاقے میں ہیں۔
- ایک میل کی بلندی سے ایک اوسط بینائی والا شخص ۹۶ میل دور تک دیکھ سکتا ہے۔
- سویڈن میں ۹۶ ہزار جھیلیں ہیں۔
- سیارہ زہرہ کا ۹۶٪ حصہ کاربن ڈائی آکسائیڈ پر مشتمل ہے۔

(۹۷)

- دنیا کی پہلی پبلک ریلوے لائن ۱۸۳۰ء میں لیورپول سے مانچسٹر تک بچھائی گئی۔ یہ ریلوے لائن ۹۷ میل لمبی تھی۔
- ۱۹۷۲ء تک بوائے اسکاؤٹ تحریک کا دائرہ ۹۷ ممالک تک وسیع ہو چکا تھا۔
- فرانس میں بالغ آبادی کی ۹۷٪ تعداد کا بینک اکاونٹ موجود ہے۔
- پومپیائی کا مشہور ایمفی تھیٹر ۷۸ قبل مسیح میں تعمیر ہوا اور ۷۹ء میں ماونٹ ویسووس کے پھٹنے تک قائم رہا۔ یہ تھیٹر ۹۷ برس تک بطور تھیٹر استعمال ہوا تھا۔
- ۶ فروری ۱۹۴۷ء کو انگلستان کے وکٹ کیپر ایچ جی ایونز نے آسٹریلیا کے خلاف ٹیسٹ میچ میں ۹۷ منٹ تک کوئی رن نہیں بنایا تھا۔
- برٹرینڈ رسل کا انتقال ۱۹۷۰ء میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۹۷ برس تھی۔
- دنیا کی سب سے بڑی ریلوے لائن جو ماسکو سے ولاڈی واسٹک تک جاتی ہے۔ ۵۷۹۸ میل لمبی ہے اس ریلوے لائن پر ٹرین ۹۷ مقامات پر رکتی ہے اور یہ سفر ۹ دن میں مکمل ہوتا ہے۔

(۹۸)

- نظامِ شمسی کے کل وزن کا ۹۸/۸٪ حصہ سورج پر مشتمل ہے۔
- سورۂ مریم قرآن پاک کی واحد سورت ہے، جس کا نام ایک خاتون کے نام پر ہے۔ اس سورت میں ۹۸ آیات ہیں۔
- دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو کی بلندی ماؤنٹ ایورسٹ سے ۹۸ میٹر کم ہے۔

- زمین کا ۹۸ ٪ حصہ آٹھ عناصر پر مشتمل ہے۔ جس کے نام ہیں، آکسیجن، سلیکا، المونیم، لوہا، کیلشیم، سوڈیم، پوٹاشیم اور میگنیشیم۔
- خطِ استوا پر زمین کا قطر ۲۴۹۰۲ میل ہے۔ یعنی ۲۵۰۰۰ ہزار میل سے صرف ۹۸ میل کم۔
- سیارہ زحل اپنے محور پر ۹۸ درجے جھکا ہوا ہے۔
- صحت مند انسانی جسم کا درجۂ حرارت ۹۸٫۴ درجے فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔
- ماسکو کا زمین دوز ریلوے نظام جو میٹرو کہلاتا ہے، ۹۸ میل طویل ہے۔
- داستانِ فلسفہ اور نشاطِ فلسفہ کے مصنف ول ڈیوراں کا انتقال ۱۹۸۱ء میں ۹۸ برس کی عمر میں ہوا تھا۔
- سورج کا ۹۸ ٪ حصہ صرف دو گیسوں ہائیڈروجن اور ہیلیم پر مشتمل ہے۔

(۹۹)

- اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ کی تعداد ۹۹ ہے
- خواتین کمرشل پائلیٹس کی بین الاقوامی انجمن کا نام ۹۹ ہے۔
- ٹامس ایلوا ایڈیسن کہا کرتا تھا کہ جینیئس، ایک فیصد خداداد صلاحیت اور ۹۹ فیصد محنت سے وجود میں آتا ہے۔
- برِصغیر کی پہلی فلم راجہ ہریش چندر کے فلمساز دادا صاحب پھالکے نے ۹۹ خاموش فلمیں بنائی تھیں۔
- جرمینیم واحد دھات ہے جو ۹۹٫۹۹ ٪ تک خالص پائی جاتی ہے۔

(۱۰۰)

- آسٹریلیا کے چارلس بیزمین، دنیا کے پہلے کھلاڑی تھے جنہوں نے اپنے پہلے ہی ٹیسٹ میچ میں سنچری (۱۶۵ رنز ریٹائرڈ) بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔ یہ سینچری، دنیا کی پہلی ٹیسٹ سینچری بھی تھی۔
- بادلوں کی ایک چمک میں اتنی روشنی ہوتی ہے کہ اس سے سو واٹ کا ایک بلب تین ماہ تک چل سکتا ہے۔
- ناریل کے درخت میں ایک سال میں اوسطاً سو پھل پیدا ہوتے ہیں۔
- پاکستان کے پہلے کھلاڑی جنہوں نے ٹیسٹ سنچری بنائی، نذر محمد تھے۔
- امریکہ کے ایوان بالا، سینٹ کے کُل ارکان کی تعداد سو ہوتی ہے۔
- امریکہ کی آزادی کی سوویں سالگرہ پر فرانس نے مجسمۂ آزادی کا تحفہ پیش کیا تھا۔
- انگلستان کے جیوف بائیکاٹ اور پاکستان کے ظہیر عباس دونوں نے اپنی سوویں سینچری ٹیسٹ میچ میں بنائی تھی۔

مِس چڑیل سے انٹرویو

آصف وقار آصف

سردیوں کی تاریک اور خاموش رات تھی ذرا ذہن میں یہ بات لائیے کہ باہر کس قدر اندھیرا اور ویرانی ہوتی ہے۔ لیکن اتنے ہی خوفناک منظر میں، میں اور میرا دوست ناصر سائیکل پر سوار قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ ناصر کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور میں سائیکل چلا رہا تھا۔ ہم "خوفناک نمبر" کے لئے چڑیل سے انٹرویو کرنے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے مس چڑیل قبرستان کے ڈراؤنے پارک میں ہی

مل سکتی تھیں۔ مس چڑیل سے ملاقات کا سوچ سوچ کر ہی ہمارا خون خشک ہو رہا تھا۔ ہمارے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے قبرستان کا گیٹ آ گیا۔ قبرستان کا منظر ویرانی اور وحشت سے بھرپور تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ذرا سوچئے کہ اگر آپ ہماری جگہ ہوتے تو آپ کا کیا حال ہوتا؟ اتنا دہشت ناک منظر تھا کہ ہمارا خون منجمد ہو رہا تھا۔ دانت تو باقاعدہ موسیقی پیش کر رہے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ قبروں سے بچتے بچاتے اور کپکپاتے ہوئے آگے بڑھے آخر ہم اس جگہ پہنچے جہاں مس چڑیل مل سکتی تھیں۔ ناصر تو خوف کے مارے تقریباً مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ اچانک ہماری دائیں جانب کی ایک بوسیدہ قبر سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور پھر مس چڑیل اپنی تمام تر ہولناکی کے ساتھ برآمد ہوئیں۔ یہ بڑا لرزہ خیز منظر تھا۔ ناصر نے مجھے سختی سے بھینچ لیا۔ اور سچ پوچھئے تو میرا حال بھی یہی تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ مس چڑیل کے جھاڑ جھنکار جیسے بال لمبے لمبے غلیظ ناخن اور خون آلود دانت چمک رہے تھے۔ اگر ہم پہلے ہی سے اس ملاقات کے لئے تیار نہ ہوتے تو ہمارا تو دم ہی نکل چکا ہوتا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے سلام کر ڈالا۔ میری آواز واضح طور پر کپکپا رہی تھی۔ مس چڑیل نے ہمیں غور سے دیکھا اور گویا ہوئیں۔ ”خوش آمدید ننھے مہمانو مجھے پتہ چل چکا ہے کہ آپ میرا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ میں تیار ہوں“ یہ کہہ کر وہ خوفناک انداز میں دھاڑیں۔ ان کی کرخت اور خوفناک آواز سے تو ہمارے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ لیکن بالآخر میں نے پتہ نہیں کہاں سے، ہمت جمع کی اور تھوک نگلتے ہوئے پہلا سوال کر ڈالا۔ ”میڈم آپ کی رہائش گاہ کس جگہ ہے؟ عموماً آپ کہاں مل سکتی ہیں؟“ یہ سوال سن کر مس چڑیل سوچتے ہوئے بولیں۔ ”آج کل تو میں صرف بچوں کی کہانیوں ہی میں ملتی ہوں۔ ویسے پہلے جب میں تھی تو ماں باپ بچوں کو میرا نام لے کر ڈراتے تھے۔ لیکن آج کل کے بچے۔ توبہ ان سے خدا ہی سمجھے کہ مجھ سے بھی نہیں ڈرتے بلکہ ان شیطان کے چیچوں سے تو میں بھی پناہ مانگتی ہوں۔ اس لئے اب میں اس ویرانے میں پرسکون زندگی گزار رہی ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض؟“ میں نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں میڈم ہم کون ہوتے ہیں آپ کی ذاتیات میں دخل دینے والے۔“ ناصر پیچھے سے بڑبڑایا۔ ”اچھا ہی ہے ہماری آپ سے جان چھوٹی ہوئی ہے۔ خدا نہ کرے کہ آپ ہمارے درمیان رہیں۔“ میں نے جلدی سے دوسرا سوال کر ڈالا کہ کہیں میڈم چڑیل ناراض ہی نہ ہو جائیں۔ پھر تو ہماری خیر ہی نہ ہوتی۔ میں نے پوچھا۔ ”چڑیل جی آپ کو گھر میں پیار سے کیا کہتے ہیں؟ اور یہ

کہ آپ کا باقی خاندان کہاں ہوتا ہے ؟ "

مس چڑیل ہمارا یہ سوال سن کر شرما کر بولیں۔ "بھئی مجھے پیار سے "حسنہ" کہتے ہیں۔ " یہ سن کر ناصر خوفزدہ ہونے کے باوجود مسکرا اٹھا۔ لیکن مس چڑیل بولتی رہیں۔ بھئی ہمارا زیادہ تر خاندان تو اب صرف کتابوں ہی میں ملتا ہے ویسے ہمارا خاندان بڑا پاپولر ہے۔ میرے "جن چاچا" تو ٹی وی پر بھی آچکے ہیں۔ ایک دفعہ میرے بھوت انکل کا "بھوت بنگلہ" بھی ٹی وی پر دکھایا گیا تھا۔ ویسے میری آنٹی بھوتنی اور پھوپھی جنی کا چڑیلستان میں بیوٹی پارلر ہے۔ میں بھی وہیں سے تیار ہو کر آئی ہوں۔ میرے تقریباً سارے کزنز وغیرہ تو پرستان میں عیش کر رہے ہیں۔ اور میں یہاں انسانوں کے بیچ پھنس گئی ہوں۔ جہاں پیٹ بھر کر انسان بھی نہیں ملتے۔ " یہ جواب سن کر ناصر نے جھرجھری لی۔

"میڈم آپ کن جگہوں پر جانا پسند کرتی ہیں ؟ " میں نے پوچھا۔

"جہاں گندگی ہو۔ بھئی مجھے صفائی وغیرہ سے سخت چڑ ہے۔ " میں نے اور ناصر نے دیکھا کہ چڑیل کے ناخنوں میں میل بھری ہوئی تھی۔

"اچھا مس اب آپ سے ذرا مختصر مختصر سے سوالات ہو جائیں۔ " ناصر نے سوالات کی فہرست جیب سے نکالی۔ اب اس کی ہمت خاصی بندھ گئی تھی۔

" آپ کا پسندیدہ رنگ ؟ "

"انسان کے خون کا رنگ " مس چڑیل نے مختصر جواب دیا۔

" آپ کی سب سے بڑی آرزو ؟ "

"لڑکیاں آپس میں جھگڑتی رہیں، ایک دوسرے کے بال نوچیں کھسوٹیں۔ کیونکہ اس حالت میں وہ بالکل میری طرح نظر آتی ہیں۔ "

" آپ کی تعلیم ؟ "

"ہاہاہا" چڑیل نے قہقہہ لگایا۔ "اگر میں لکھی پڑھی ہوتی تو چڑیل کیوں ہوتی ؟ "

" آپ کی زندگی کا سب سے خوشگوار لمحہ ؟ "

"جب کوئی لڑکی دوسری لڑکی کو "چڑیل" کہتی ہے۔ "

"وہ لمحہ جب آپ کا موڈ سخت خراب ہو جاتا ہے "

"بچوں کو آپس میں میل محبت سے رہتے دیکھ کر"

"مس چڑیل کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟"

"ہائے کیا سوال کر دیا" مس چڑیل نے آہ بھری "اس زندگی سے کون مطمئن ہو سکتا ہے۔ اتنے بڑے قبرستان میں اکیلے رہتے رہتے تو اکتا چکی ہوں کبھی کبھی خود مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔"

میڈم چڑیل نے بولتے بولتے رک کر اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا بھئی مجھے چڑیلستان جانا ہے ایک ڈنر پر اس لئے مجھے اجازت دیجئے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "آخری سوال مس چڑیل کیا آپ آنکھ مچولی کے پرستاروں کے لئے کوئی پیغام دینا چاہیں گی۔" مس چڑیل نے اپنے مکروہ چہرے کو اور بگاڑتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں ضرور۔ آنکھ مچولی تو چڑیلستان میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ میرا بچوں کے لئے یہ پیغام ہے کہ وہ بالکل محنت نہ کیا کریں۔ اپنے ملک و قوم کی خدمت سے بھی اپنا دامن بچائیں۔ ہم بھوت پریت سے ڈرتے رہیں۔ کیونکہ اگر وہ ہم سے ڈرنا چھوڑ دیں گے تو پھر ہمارا سارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔ پھر ہم کسے ڈرایا کریں گے۔ ویسے اب تو آپ لوگ سائنس کے ذریعے ہمیں غلط ثابت کرنے کی کوششوں میں ہیں۔ لیکن خیر میری بد دعائیں آپ کے ساتھ ہیں" پھر دیکھتے ہی دیکھتے مس چڑیل دھواں بنیں اور غائب ہو گئیں۔ قبرستان میں پھر سے وہی ہو کا عالم تھا اور ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ ہمیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ ہماری تو گویا سانس ہی رک گئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک ساتھ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

جانور آپ کی محبت کے مستحق ہیں

جانور بے زبان ہوتا ہے اس لیے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتا، مگر جانور آپ کے پیار کو محسوس کر کے آپ کا مطیع ضرور بن سکتا ہے

جانور اگر درندہ نہیں تو اُس سے محبت کیجیے اس کا خیال رکھیے

ادارہ آنکھ مچولی

ننھی نگارشات

نوخیز قلم کاروں کی مختصر تحریروں سے انتخاب

ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بارہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بددیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شدہ تحریر بھجوائے گا ہم اُس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھی نگارشات" کے آخری صفحے پر دیکھیے۔)

مجھے رات نے "پکڑ" لیا تھا

نعیم احمد ادیب

یہ واقعہ ۱۹۸۷ء کا ہے، جب میں درجہ ہشتم میں پڑھتا تھا۔ میرا ایک چھوٹا بھائی فوت ہو گیا ہم نے اس کی قبر سیمنٹ سے پکی کرا دی۔ میرے ذمے یہ فرض سونپا گیا کہ روزانہ جا کر قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کر آیا کروں تاکہ اس میں دراڑیں نہ پڑیں اور مضبوط ہو جائے قبرستان ہمارے گاؤں سے کوئی سات آٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔

قبرستان کے ساتھ کافی بڑا ایک قصبہ بھی ہے میں روزانہ سائیکل پر یہ فاصلہ طے کرتا اور چھڑکاؤ کر کے واپس آجاتا..... ایک روز میں چھڑکاؤ کر کے ساتھ والے قصبے کو نکل گیا وہاں اپنے اسکول کے ایک استاد صاحب سے ملاقات ہو گئی انہوں نے بتایا کہ فلاں گاؤں میں ایک جلسہ ہے جس میں علمائے کرام اور ذاکرین شرکت کر رہے ہیں۔ ہم دونوں نے سائیکلیں اٹھائیں اور چل پڑے۔ اگرچہ پکی سڑک تھی مگر گاؤں کافی دور تھا۔ تھکے ہارے دوپہر کے وقت کہیں جا کر مطلوبہ گاؤں پہنچے جب جلسہ ختم ہوا تو سورج غروب ہونے کو تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ تیز آندھی چلنا شروع ہو گئی تھی، اس گاؤں کے رہنے والے ایک استاد صاحب جو ہمارے ہی اسکول میں پڑھاتے تھے

مجھے ٹھہر جانے کو کہا، مگر میں نہ مانا اور سائیکل پر سوار ہو کر چل پڑا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ بھاگ کھڑا ہوا ایک تو آندھی تھی، اوپر سے سورج غروب ہو رہا تھا۔ میرا گاؤں یہاں سے دس کلو میٹر دور تھا۔ اس پر ایک اور مصیبت یہ تھی کہ بار بار سائیکل کی چین اتر جاتی اور مجھے بار بار رک کر اسے ٹھیک کرنا پڑتا۔ ایسا چونکہ بار بار کرنا پڑ رہا تھا لہٰذا کافی وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ سورج غروب ہو گیا میں تقریباً نصف فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اب اندھیرا پھیل رہا تھا اور آگے جنگل تھا جس میں ریت ہی ریت پھیلی ہوئی تھی سائیکل چلانا دشوار ہو رہا تھا اندھیرے میں صحیح راستہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں، میں راستہ بھٹک گیا اب مجھے خوف سا آنے لگا تھا، اندھیری رات، اندیکھا راستہ، اوپر سے خوف کے پہرے، میری عجیب حالت تھی۔ اب میں جنگل میں سائیکل کو گھسیٹ رہا تھا صحیح سمت کا پتہ بھی نہیں چل رہا تھا، اچانک مجھے روشنی نظر آئی جو تھوڑی دیر بعد خود بجھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ عمل مسلسل ہونے لگا۔ یعنی روشنی آتی اور غائب ہو جاتی میرا ذہن فوراً بھوتوں کی طرف چلا گیا اور ان کے متعلق جتنے بھی قصّے سن رکھے تھے سب یاد آنے لگے ذہن پہ خوف تو پہلے ہی طاری تھا رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ اب صورتحال یہ تھی کہ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف جا رہا ہوں۔ مجھے قرآن پاک کی جتنی سورتیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں، مشکل میں واقعی خدا یاد آ جاتا ہے۔ مجھے بھٹکتے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اچانک آگے راستہ نظر آیا اب چاند کی روشنی سے سب کچھ بہتر نظر آنے لگا تھا۔ سائیکل پر سوار ہوا اور اس راستے کو دیکھتے ہوئے سائیکل چلانے لگا۔ کچھ دور ہی گیا تھا کہ آگے ایک گاؤں نظر آیا میں پریشان تو پہلے ہی تھا اب حیران بھی ہوا کہ یہ گاؤں کہاں سے آ گیا، رک کر ادھر ادھر دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں ایک اور گاؤں پہنچ چکا تھا ہوا یوں کہ جب اندھیرا چھا گیا اور میں راستہ بھٹک گیا تو بجائے سیدھا اپنے گاؤں جانے کے میں دوسرے راستے سے واپس مڑ گیا تھا۔ گاؤں میں پہنچا وہاں میرے ایک کلاس فیلو رہتے تھے انہیں اپنی بپتا سنائی انہوں نے کہا کہ تمہیں رات نے "پکڑ" لیا ہے اس لئے تمہیں سمت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس واقعے کو "سال بیت چکے ہیں میں اب بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ روشنیاں واقعی بھوتوں کی تھی یا صرف میرا احساس تھا اور یہ کیا واقعی مجھے رات نے پکڑ لیا تھا؟ اگر ایسا نہیں تھا تو میں بالکل مخالف سمت میں کیوں آ گیا تھا۔ آج بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو پورے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہو جاتی ہے، شاید میں اسے کبھی بھی نہ بھول سکوں.....

پراسرار ذائقہ

صبا سعید، کراچی

ہمیشہ کی طرح آج بھی عمران کو کلاس میں جھگڑا کرنے پر ماسٹر سے ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ "عمران تم کو کتنی دفعہ منع کیا ہے لڑائی کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ خالد اور عدیل کو دیکھو جو صرف مثالی دوست ہی نہیں بلکہ ہر ایک سے محبت سے پیش آتے ہیں۔ ان سے ہی کچھ سبق لو آج تمہارے ساتھ آخری بار نرمی کی جا رہی ہے"۔ عمران سے یہ کہہ کر ماسٹر صاحب کلاس روم سے باہر چلے گئے۔

خالد اور عدیل چھٹی جماعت کے طالب علم تھے۔ دونوں کے گھر اسکول سے قریب تھے۔ یہ دونوں دوست نہ صرف پڑھائی میں اچھے تھے بلکہ اسکول میں ہونے والے سب کھیلوں اور پروگراموں میں بھی حصہ لیتے تھے اور کامیاب بھی ہوتے تھے۔ عدیل کی ایک تین سال کی بہن بھی تھی "عینی" جبکہ خالد اکلوتا تھا۔ دونوں دوست اکثر

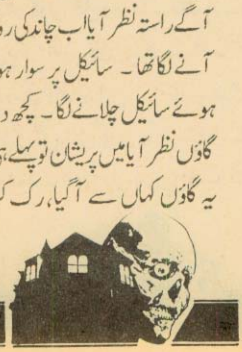

اسکول کا کام ساتھ کرتے تھے۔

سردیوں کا موسم تھا صبح سے ہی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اسکول سے چھٹی کے بعد خالد نے عدیل سے کہا "عدیل

خالد میرے گھر آجانا آج موسم اچھا ہے خوب کھیلیں گے"۔ عدیل اپنے گھر گیا اور جلدی جلدی کھانا کھا کر گھر چلا گیا۔ دونوں دوستوں نے بارش کے خوب مزے لئے اور خوب کھیلے۔ خالد نے عدیل سے کہا۔ "یار اب تم گھر جاؤ ہوم ورک بھی کرنا ہے اور اب تھکن بھی محسوس ہو رہی ہے"۔ عدیل نے سوچا خالد ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ عدیل نے خالد کو خدا حافظ کہا اور گیٹ کی جانب بڑھا۔ خالد ابھی گھر میں داخل ہی ہونے والا تھا کہ اسے عدیل کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو عدیل اپنا پیر پکڑے زمین پر لیٹا ہوا ہے۔

عدیل کے پیر میں کیل گھس گئی تھی جس کی وجہ سے اسے بہت سخت تکلیف محسوس ہو رہی تھی کیونکہ کیل کافی بڑی اور موٹی تھی۔ خالد سے عدیل کی یہ تکلیف دیکھی نہ گئی اس نے کیل نکالنے کے لئے عدیل کے پیر پر اپنا منہ لگا دیا۔ عدیل سے تکلیف برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ عدیل نے کچھ حیرت اور غصہ سے خالد سے کہا خالد! کیا بات ہے اگر تم سے کیل نہیں نکل رہی تو انکل کو بلا لو وہ نکال دیں گے۔ عدیل کے احساس دلاتے ہی خالد نے کیل نکال دی اور پھر اپنے گھر چلا گیا۔ لیکن آج خالد سے اسکول کا کام بھی نہیں ہو رہا تھا جب سے عدیل کے پیر سے کچھ خون اس کے ساتھ منہ میں گیا تھا۔ وہ عجیب سا محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی نیا ذائقہ ہو اور اس کا دل یہ ذائقہ دوبارہ مانگ رہا تھا۔ ابھی وہ اپنی سوچوں میں ہی کھویا ہوا تھا کہ اس کی امی کی آواز آئی "بیٹا! اسکول کا کام مکمل کر لو جلدی سے کھانا لگ گیا ہے جلدی آجاؤ"۔ ایسی آواز کے ساتھ اس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ آج جب وہ بستر میں لیٹا تو اس کو نیند ہی نہیں آرہی تھی اس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے آج وہ خوب سویا ہو بس خالد کا ذہن بار بار شام کو ہونے والے واقعہ کی طرف جا رہا تھا۔

اس واقعہ کو کافی دن ہوگئے۔ لیکن اب خالد میں ہونے والی تبدیلی سب نے محسوس کی اب اس کو بھی عمران کی طرح کلاس میں ہوم ورک نہ کرنے پر ڈانٹ پڑنے لگی۔ عدیل کو بہت دکھ ہوتا تھا اس نے خالد کو سمجھایا بھی اور وجہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن خالد الٹا عدیل سے ہی لڑنے لگتا تھا۔ اسکول جانے کو اب خالد کا دل نہیں چاہتا تھا۔

اب تو خالد کے والدین بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ خالد بہت خاموش رہنے لگا ہے۔ کسی بات کی ضد بھی نہیں کرتا۔ عدیل سے پوچھا تم سے لڑائی تو نہیں ہے خالد کی سب باتیں عدیل نے ان کے ماں باپ کو بتا دیں اب تو خالد کے والدین بھی پریشان ہوگئے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں

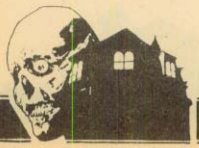

آرہا تھا کہ ان سب باتوں کی وجہ کیا ہے۔

ایک دن خالد ہمیشہ کی طرح اسکول سے خاموشی سے گھر کی طرف چل پڑا جیسے ہی گیٹ سے گھر میں داخل ہوا اس کی نظر مرغیوں پر پڑی کچھ سوچ کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی اور پھر وہ خوشی خوشی گھر میں داخل ہوا امی سے پوچھا۔ امی یہ مرغیاں کس سلسلے میں آئی ہیں۔ اس کی امی نے بتایا کل کچھ لوگ کھانے پر آرہے ہیں۔ بس آج خالد بہت خوش تھا۔ جلدی جلدی کھانا کھا کر تقریر لکھی اور پھر عدیل کے گھر چلا گیا اس کی والدین بھی حیران تھے کہ آخر اس خوشی کی کیا وجہ ہے۔ خالد نے لکھی ہوئی تقریر عدیل کو دکھائی دونوں دوست آج بہت خوش تھے عدیل اس لئے خوش تھا کہ آج اس کا عزیز دوست خوش تھا اور خالد کی پر اسرار خوشی کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے ہر طرف خاموشی تھی۔ ادھر خالد اپنے کمرے میں بیٹھا کبھی مرغی کو اور کبھی چھری کو دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے چھری تیزی سے مرغی کی گردن پر پھیر دی اور پیالہ خون سے بھر کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ اس نے اپنی سوچی ہوئی اسکیم کے مطابق مرغی کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے جو باغ کی جانب کھلتی تھی پھینک دیا اور پھر خوب مزے سے سو گیا۔ کسی کو بھی اس کی حرکت کے بارے میں پتہ نہیں چلا۔ البتہ مرغی کو دیکھ کر اس کی امی نوکر پر غصہ ہو رہیں تھیں کہ مرغیوں کو بند کر کے کیوں نہیں رکھا ایک مرغی اس لاپرواہی کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔ اس بات کو کافی دن ہو گئے تھے۔ اب تو خالد اسکول کی چھٹیاں بھی کرنے لگا تھا اور بہت اداس رہنے لگا تھا۔ اس کے والدین نے ڈاکٹر کو دکھایا لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ایک دفعہ عدیل اسکول سے خالد کے پاس آیا اور پوچھا "آج بھی تم اسکول کیوں نہیں آئے"۔ اتنی چھٹیاں کیوں کرتے ہو۔ خالد نے کہا بس دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر عدیل نے بتایا وہ اپنے ابو کے ساتھ امریکہ جا رہا ہے کل۔ تم کو کچھ چاہئے تو بتاؤ میں تمہارے لئے کیا لاؤں۔ خالد نے کہا مجھے کچھ نہیں چاہئے اور اب تم جاؤ مجھے نیند آرہی ہے۔ عدیل کو خالد کی اس بات پر بہت افسوس ہوا۔ اور وہ یہ سوچتا ہوا خالد کے گھر سے چلا گیا کہ جب وہ پہلے امریکہ گیا تھا تو خالد کتنا اداس ہو گیا تھا اور فرمائش کر کے چاکلیٹ کا پیکٹ بھی منگوایا تھا۔

پھر عدیل نے سوچا چلو میں خود ہی خالد کیلئے اس بار بھی وہی چاکلیٹ کا پیکٹ لے کر آؤں گا۔

خالد کی طرف سے اس کے والدین بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ کیونکہ خالد ان کی اکلوتی اولاد تھی۔

جنوری کی پانچ تاریخ تھی سردیاں اپنے عروج پر تھیں۔ آج خالد کچھ زیادہ ہی بے چین اور پریشان تھا۔ اس کو عدیل بھی یاد آرہا تھا جس نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا لیکن اب تو وہ بہت دور گیا ہوا تھا۔ خالد نے کھانا بھی نہیں کھایا اس کی امی نے بہت کہا لیکن خالد نے انکار کر دیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے سردی کافی بڑھ چکی تھی۔ خالد اپنے کمرے سے نکل کر باغ میں چلا گیا۔ دور دور تک گھروں کی بتیاں بند تھیں آج خالد کا بہت دل چاہ رہا تھا خون کا ذائقہ پھر چکھنے کے لئے وہ پریشان اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اس کو نہ تو نیند آرہی تھی اور نہ ہی سردی لگ رہی تھی۔ ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور پھر وہ غسل خانہ سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا بلیڈ تھا پھر اس نے بلیڈ تیزی سے اپنی کلائی پر پھیر دیا حیرت انگیز طور پر اس کو تکلیف کا احساس بھی نہیں ہوا اس نے اپنی خون آلود کلائی

ہونٹوں سے لگالی۔ پھر اس کو کچھ ہوش نہیں رہا۔

صبح جب نوکر جگانے آیا تو اس سے خالد کو دیکھا نہیں گیا۔ خالد کے مردہ جسم میں جگہ جگہ خون ہی خون لگا ہوا تھا اس کے چہرے پر دہشت چھائی ہوئی تھی اور ہاتھ کی کلائی اس کے منہ پر تھی.....

ڈھانچہ کا انتقام

مسعود آفتاب ، کراچی

"اچانک اس ڈھانچہ نے اس کی گردن دبوچ لی اور چند لمحوں بعد وہ بے جان لاشہ اس کے ہاتھوں میں جھولنے لگا۔"

اچانک خیالات کا تانا بانہ ٹوٹ گیا خالد چلا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا سینہ کسی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر سے کتاب اٹھائی جس کے اندر سے ناول بر آمد ہوا "ڈھانچے کا انتقام" .....اوہو! وہ ہنس پڑا میں تو خواہ مخواہ ہی ڈر گیا۔ اس نے چادر اوڑھی اور منہ دوسری طرف کر کے آرام سے سو گیا۔

خالد ایک ہونہار طالبعلم تھا۔ لیکن اس کی ایک ہی خراب عادت تھی۔ وہ راتوں کو چھپ چھپ کر ناول پڑھتا تھا۔ اور وہ بھی کون سے۔ جن میں ڈھانچوں اور جن بھوتوں وغیرہ کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اس کے گھر والے اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے۔ اور اس کے خواب والی رات کے اگلے دن تو ہنگامہ ہی برپا ہو گیا۔ "خالد! حد ہوتی ہے ایک بات کی بھی تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ ناول مت پڑھا کرو" خالد کے والد دھاڑے۔ "ابو معاف کر دیں آئندہ ایسا نہیں ہو گا" خالد منمنایا۔ خیر اس دن تو بات آئی گئی ہو گی۔

اس دن تو خالد نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ ناول نہیں پڑھے گا۔ کیونکہ سب بہن بھائیوں کے سامنے جو اس کی بے عزتی ہوئی تھی اس پر وہ بہت نادم تھا۔ لیکن جب اس نے اسکول کے سامنے والے بک اسٹال پر اسی خوفناک ناول کا دوسرا حصہ دیکھا تو اس کا دل مچل اٹھا اور اس نے وہ ناول خرید لیا۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کے والد اسے ناول خریدتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔ خالد کے والد نے جب اپنے ایک عزیز دوست سے اس کی عادت کا تذکرہ کیا تو انہوں نے ایک ترکیب بتائی۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

آج خالد کے تمام گھر والے شادی میں شرکت کیلئے گئے ہوئے تھے۔ جانا تو خالد بھی چاہتا تھا لیکن اسے امتحانات کی وجہ سے گھر میں ہی رہنا پڑا۔ خالد کو اتنا غصہ آرہا تھا کہ اس نے سوچا بھاڑ میں گیا امتحان میں تو ناول پڑھوں گا۔ اس نے دراز میں سے وہی ناول نکالا جو اس نے چند روز

پہلے ٹیک اسٹال سے خریدا تھا اور مزے سے پڑھنے بیٹھ گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ناول کی دہشت سے اس کے سارے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کو محسوس ہوا کہ اس ناول کا خونی ڈھانچہ یہیں کہیں اس کے پاس موجود ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ناول واپس رکھا اور بتی بجھائے بغیر منہ لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا اس کی آنکھ اچانک کھلی تو خوف کا احساس اس ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر رہا تھا۔ جب وہ پوری طرح ہوش و حواس میں آیا تو اچانک اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں کیونکہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے ایک انتہائی خوفناک ڈھانچہ ٹیک لگائے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گھڑوں سے شرارے نکل رہے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس کی آنکھیں کسی انتقام کی منتظر ہوں۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور کمرے سے باہر جھانکا تو اسے کچھ نظر نہ آیا ڈھانچہ غائب ہو چکا تھا۔ وہ دوبارہ بستر پر آیا اور منہ ڈھانپ کر لیٹ گیا تھوڑی دیر بعد جب اس نے ہمت کر کے چادر سے منہ باہر نکالا تو وہی ڈھانچہ سامنے کھڑکی سے لگا کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی اور وہ دنیا و مافیا سے بے خبر ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اس کے سب بہن بھائی اس کے بستر کے گرد کھڑے منہ دبائے ہنس رہے تھے۔ دائیں جانب اس کے ابو کھڑے تھے جن کے ہاتھ میں چھوٹا سا ڈھانچہ جھول رہا تھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن جب اسے پچھلے واقعات یاد آئے تو وہ بھی ہنس پڑا لیکن اس کی شرمندگی کا برا حال تھا پھر جب بھائی جان نے پوری کہانی سنائی تو اس کی سمجھ میں آیا کہ کس طرح ایک چھوٹی سی چابی کے گچھے سے ابو نے اسے ڈرایا۔ پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ نہ وہ ایسا واہیات

نقل شدہ، طویل اور غیر معیاری تحریریں شائع نہ ہو سکیں گی۔

ناول پڑھتا اور نہ اسے شرمندگی اٹھانا پڑتی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ ناول نہیں پڑھے گا۔

اب خالد اچھا بچہ بن چکا تھا جب اگلے دن اسے بستر میں سے ناول ملا تو اس نے فوراً پھاڑ دیا۔ خالد کے ابو کھڑکی سے یہ سب ماجرا دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

شرارت کی وجہ سے

عبداللہ شیخ حیدر آباد

ہم پورے گھر میں شرارتی واقع ہوئے تھے۔ سب گھر والے ہماری شرارتوں سے بہت نالاں تھے۔ جس کی وجہ سے ہمیں کئی بار مولا بخش کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

ان دنوں سردیوں کی چھٹیاں تھیں ہم اپنے کمرے میں بیٹھے خوف ناک نمبر پڑھنے میں محو تھے۔ کہ اچانک ہمارے ذہن میں شرارت نے جنم لیا۔ کیوں نا آج باجی کو اپنی شرارت کا نشانہ بنایا جائے لیکن کیسے؟ ہم نے دل میں سوچا ہماری نظر جیسے ہی خوف ناک نمبر پر پڑی تو بے اختیار ہمارے چہرے پر مسکراہٹ تیرنے لگی۔ ہم نے اپنی

شرارت کو عملی جامعہ پہنانے کے لئے رسالہ اٹھایا اور باجی کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ ہم باجی کو تنگ کرنے کا یہ پروگرام بنایا تھا کہ کسی طرح خوفناک نمبر کا خوف ناک ٹائٹل اگر باجی کے سامنے آ جائے تو وہ یقیناً ڈر جائیں گی۔ باجی قدرتی ڈرپورک ہیں۔ اور کبھی کبار تیز ہوا کا جھونکا بھی انہیں بوکھلا دیتا تھا۔ خیر ہم باجی کے کمرے میں پہنچے باجی صاحبہ کرسی پر بیٹھیں آنکھیں بند کئے خیالی دنیا کی سیر فرما رہی تھیں۔ ہم دبے قدموں باجی کے قریب پہنچے۔ اور اچانک خوفناک نمبر کا خوفناک ٹائٹل باجی کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ باجی، باجی ہم نے دور سے باجی کو آواز دیں ہماری آواز پر باجی نے آنکھیں کھولیں لیکن جیسے ہی ان کی نظر خوف ناک ٹائٹل پر پڑی تو باجی کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اور انہوں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں ہم زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بھاگے لیکن فوراً ہی ہمارا قہقہہ چیخ میں بدل گیا۔ آہ بدحواسی میں ہمیں راستے میں رکھی ہوئی میز نظر نہیں آئی تھی جس کی وجہ سے اب ہم زمین پر پڑے کراہ رہے تھے ہائے ہائے یہ ہمارا کان کون سی ہستی کھینچ رہی تھیں۔ ارے یہ تو امی جان ہیں۔ جو باجی کی چیخ سن کر کمرے میں نمودار ہوئیں تھیں۔ اور جو تمام حالات کا جائزہ بھی لے چکی تھیں۔ ہم جل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو۔ کا ورد کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ امی کی غصے سے سرخ آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں "تڑاخ" امی حضور نے ہمارے منہ پر ایک زبردست تھپڑ جڑ دیا۔ اور ہماری آنکھوں کے سامنے تارے رقص کرنے لگے جب ہمارے ہوش سنبھلے تو امی حضور کے ہمراہ باجی بھی جلوہ گر تھیں۔ اس کے بعد ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا ہم بتانے سے قاصر ہیں۔ دعا کریں کہ ہمارے زخم ٹھیک ہو جائیں اور ہم جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔

زندہ لاش

کہانی بشیر احمد شاد

ترجمہ۔ عبدالجلیل عرف راجو نیوہالا

قبرستان پر ہیبت ناک اندھیرے اور گہری خاموشی کا راج تھا۔ قبرستان کے درخت اندھیرے میں جنات کی طرح لگ رہے تھے۔ ایک لالٹین کی مدھم روشنی میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے کئی سلسلے اپنا پتہ دے رہے تھے۔

پچاس کے قریب آدمیوں نے ایک نوجوان کی لاش کو زمین کے سینے میں دفن کیا تھا اور اس کے اوپر منوں مٹی ڈال کر اب اس کی مغفرت کے لئے دعا مانگ رہے تھے

اچانک فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ لوگوں میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کو لگا کہ جیسے کوئی کسی قبر کے اندر سے انہیں اپنی مدد کے لئے پکار رہا ہو۔ لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی۔ سب خوفزدہ چہروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"کسی کی آواز تھی؟؟ کہاں سے آ رہی تھی؟؟؟"

سب کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرنے لگے۔ لوگوں میں سے کسی نے نئی قبر سے کان لگا کر دیکھا۔ مگر وہاں تو

مکمل خاموشی تھی۔

پھر ایک قبر سے کان لگاتے ہوئے کسی نے کہا "آواز یہاں سے آرہی ہے۔" یہ قبر بارہ دن پہلے بنائی گئی تھی اور اس میں شاہ جمیل محلے کا ایک مزدور رحیمو دفن تھا۔ ان لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے رحیمو کے جنازے میں شرکت کی تھی اور انہوں نے خود اسے قبر کی گود میں ابدی نیند سوتے دیکھا تھا۔

اسی قبر سے آنے والی دردناک فریاد نے ان کے حواس کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ اسی پراسرار ماحول میں ایک شخص نے بیلچہ اٹھا کر قبر کو کھودنا شروع کر دی۔ بیلچے کی ہر آواز پر لوگوں کی زبانوں سے کلمہ توحید نکل رہا تھا اور مولوی صاحب قرآن کریم کی آیتیں پڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں قبر سے مٹی ہٹا دی گئی، پھر ایک شخص نے سر کی طرف سے دو اینٹیں ہٹا دیں اور ٹارچ والے نے ٹارچ کی روشنی اس کی طرف پھینکی۔ اچانک ایک ہلکی چیخ کی آواز قبر سے نکلی اور لوگ افراتفری کے عالم میں بھاگنے لگے۔ بڑی مشکل سے کچھ لوگوں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور ایک مرتبہ پھر قبر کے اردگرد کھڑے ہوگئے۔ وہاں رحیمو کی زندہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ہل رہی تھیں۔ وہ آدھا زندہ اور آدھا مردہ تھا۔

"زندہ ہے" کسی نے کہا "ایسے کیسے ہو سکتا ہے"؟

دوسرے نے کہا ہر طرف سے رائے زنی شروع ہو گئی۔

آخر فیصلہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب متقی اور اللہ کے نیک بندے ہیں اس لئے انہیں قبر میں اترا جائے۔ سب کے زور دینے پر مولوی صاحب قبر میں اترے اور پھر جیسے ہی وہ رحیمو کے جسم کو ڈھکنے کے لئے جھکے تو رحیمو کی بانہیں ان کی گردن کے گرد اتنی مضبوطی سے حائل ہو گئیں کہ چھڑانا مشکل ہو گیا۔ قبر سے نکلنے کے لئے مولوی صاحب تیزی سے سیدھے ہوئے تو رحیمو کا جسم بھی ان کے ساتھ آگیا بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو قبر سے نکالا گیا اور لوگ مولوی صاحب اور رحیمو کو اسی حالت میں لے کر رحیمو کے گھر جا پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر رحیمو کے گھر سے ایک عورت نکلی مگر اس نے جیسے ہی رحیمو کی لاش کو دیکھا وہ بے ہوش ہو گئی۔ بالآخر مولوی صاحب کو اندر لے جایا گیا۔ بستر پر لیٹتے رحیمو نے خود بخود مولوی کو چھوڑ دیا ڈاکٹر سمیت سب لوگ حیران تھے کہ رحیمو بارہ دن تک قبر میں کیسے زندہ رہا؟ رحیمو کا بڑی توجہ سے علاج کیا گیا دسویں دن اس نے زبان سے پانی مانگا چند دنوں بعد وہ اپنا احوال بتانے کے قابل ہو گیا۔

رحیمو نے بتایا کہ اسے ایک بیماری لاحق تھی جسے سکتہ کہتے ہیں کچھ دیر کے لئے اس پر غشی طاری ہو جاتی تھی مگر وہ پھر خود بخود ٹھیک ہو جاتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ جو اسے سکتہ ہوا تھا وہ شدید قسم کا تھا۔ اور اسے جلد ہوش نہ آیا۔ اور اس کے رشتے داروں نے اسے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا رحیمو کو پتہ نہیں کہ اس نے کتنا عرصہ بیہوشی کی حالت میں گزارا جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو قبر میں زندہ دفن دیکھا۔ اس نے بارہا چیخ کر مدد طلب کی مگر کون تھا جو اس کی فریاد سنتا اس کے جسم پر کیڑے مکوڑے کاٹتے رہتے مگر بے سود آخر ایک دن اوپر آدمیوں کے چلنے کی آواز سن کر اسنے پوری طاقت سے چیخنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس کی قبر میں ایک بڑا سا سوراخ ہو گیا تھا جس کی بدولت اس کی آواز قبرستان میں موجود لوگوں تک پہنچ سکی۔ دنیا میں آج بھی کیسے کیسے معجزے ہوتے رہتے ہیں۔ ہیں نا؟

عذاب

عین الحق، کراچی

یہ قیام پاکستان سے قبل کا ذکر ہے۔ میں ان دنوں

ریلوے میں ملازم تھا۔ میں لکھنؤ کے ایک دور دراز گاؤں کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر تھا۔ گاؤں کا نام ”بنگلہ بازار“ تھا اور اسٹیشن بھی اسی نام سے مشہور تھا۔ گاؤں کی آبادی اسٹیشن سے دو تین میل کے فاصلے پر تھی۔ بجلی تو اس زمانے میں تھی نہیں، اسٹیشن پر مٹی کے تیل کے دو بڑے لیمپ جلا کرتے تھے۔ میرے ساتھ دو افراد کا مختصر عملہ بھی اسٹیشن پر تعینات تھا۔ سگنل مین ناصر علی جس کی عمر کوئی ۴ برس ہوگی، اور ایک خاکروب رام داس۔ رام داس بہت خومت گزار شخص تھا، مغرب کا وقت ہونے سے پہلے پہلے وہ پلیٹ فارم پر نصب لیمپ روشن کرتا، میرے دفتر میں ایک لالٹین جلا کر رکھ دیتا اور ساتھ ہی اسٹیشن کی عمارت کے پیچھے بنے میرے ایک کمرے کے کوارٹر میں بھی لالٹین جلا دیتا۔ ناصر علی اور رام داس کے لئے میرے کوارٹر سے ملحق ایک علیحدہ کوارٹر تھا جس میں دونوں ساتھ رہا کرتے تھے۔ ناصر علی بڑا مزیدار کھانا پکاتا تھا، وہ ہر روز صبح سویرے اٹھتا، بازار سے سبزی ترکاری لاتا اور کھانے پینے کا دوسرا سامان بھی، الغرض کھانے پکانے کا شعبہ ناصر علی کے ذمہ تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی اسٹیشن کے اطراف بڑا پر حول سناٹا چھا جاتا اور دور دور تک تاریکی کا راج ہوتا۔ شام چھ بجے کے بعد سے صبح آٹھ بجے تک کوئی گاڑی بھی نہیں آتی تھی۔ یوں ہم فارغ ہوتے اور سات آٹھ بجے کھانا کھا کر اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ میں چونکہ اپنے کمرے میں تنہا رہتا تھا، اس لئے کبھی کبھار لالٹین کی مدہم روشنی اور باہر سناٹے اور تاریک کے باعث عجیب و غریب خوف محسوس کرتا۔ ایک دن کا ذکر ہے میں کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آگیا۔ رات کے کوئی نو بجے کا وقت ہوگا، میں عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوا تھا۔ ناصر علی اور رام داس بھی اپنے کمرے میں جا چکے

تھے۔ میں نے لالٹین کی روشنی مدہم کی اور بستر پر لیٹ گیا۔ اچانک میرا پلنگ ایک جھٹکے سے ہلا، میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا، سخت سردی اور باہر ہوا بھی بڑی تیز چل رہی تھی۔ میں پلنگ کے ہلنے کی وجہ پر غور کر ہی رہا تھا کہ میری نظر سامنے پڑی۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی، دیوار کے ساتھ ایک چٹائی پر سفید کفن میں لپٹی ایک لاش پڑی تھی جس کا چہرہ کھلا تھا۔ لالٹین اس پر اسرار لاش کے سرہانے ہی رکھی تھی جس کی مدہم روشنی لاش کو مزید بھیانک بتا رہی تھی۔ کفن سرخ سرخ تازہ خون میں تر تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا جس سے سابقہ پڑا تھا۔ پھر اچانک میرا پلنگ کسی ان دیکھی طاقت نے الٹ دیا۔ میں نیچے گر پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک انسانی سر جس کا دھڑ غائب تھا ہوا میں تیرتا ہوا زمین سے بلند ہوا۔ اس کے نوکیلے دانت باہر کی جانب نکلے تھے۔ میں گھبرا کر بھاگا تو پاؤں لالٹین میں الجھ گیا، لالٹین بجھ گئی اور میں عین لاش کے اوپر گر پڑا۔ میرے گرنے سے

لاش سے بڑی کرخت آواز نکلی۔ خوف سے میرا خون جیسے جم سا گیا۔ اب کمرے میں مکمل تاریکی تھی مگر لاش کا سفید (وہ سفید چادر تھی جسے میں کفن ہی کہوں گا) اندھیرے میں چمک سا رہا تھا۔ سخت سردی کے باوجود میں پسینے میں شرابور تھا۔ میں نے سورۃ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی، جیب سے ماچس نکالی اور کانپتے ہاتھوں سے لالٹین دوبارہ روشن کی۔ جوں ہی لالٹین روشن ہوئی ایک ناقابل فراموش اور دہشت ناک منظر میرے سامنے تھا۔ وہی انسانی سر جو میری چارپائی کو دھکیل کر نمودار ہوا تھا، اپنے لمبے لمبے دانت لاش کے پھولے ہوئے پیٹ میں گھسیڑ چکا تھا۔ خون کا فوارہ ابل پڑا، لاش مارے تکلیف کے دوہری ہو کر بیٹھ گئی اور ایک چیخ بلند ہوئی۔ اب میرے لئے کمرے میں مزید ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے جلدی سے کنڈی کھولی اور باہر بھاگتا چلا گیا۔ آخری الفاظ جو میرے کانوں نے سنے وہ کچھ اس طرح تھے، "چھوڑ دو مجھے..... ہائے، میں کب سے یہ عذاب جھیل رہا ہوں..... مجھے چھوڑ دو ..... چھوڑ دو"۔ اور پھر کٹے ہوئے نرخرے کی سی آوازیں بھی آئیں جو سانس لینے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔

باہر کی سخت سردی نے میرے اعصاب مزید شل کر دیئے۔ میں لیمپ کے قریب لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک تو مجھے ہوش ہی نہ رہا کہ یہ سب کیا تھا اور میں کہاں تھا؟ ہوش اس وقت آیا جب فجر کے آثار نمودار ہوئے۔ ناصر علی اذان دینے باہر آیا تو میں پھر ہمت کر کے اپنے کمرے میں گیا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سکون تھا اور "الصلوٰۃ خیر من نوم" (نماز نیند سے بہتر ہے) کے مسحور کن الفاظ فضاؤں میں بلند ہو رہے تھے۔ آج اس واقعہ کو ساٹھ برس کے قریب گزر چکے ہیں۔ ناصر علی اور رام داس کب کے مر کھپ گئے۔ بنگلہ بازار کا وہ چھوٹا اسٹیشن بھی ختم ہو گیا اور اب وہ سارا علاقہ بجلی کی روشنی سے منور ہو گیا ہے۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔

میں نے اس واقعہ کے بارے میں بہت غور کیا ہے۔ اور صرف ایک ہی بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ عذاب قبر برحق ہے۔ ایک حدیث ہے کہ قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ اور جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ لاش کسی گنہگار بدکردار شخص کی ہوگی جو نہ معلوم کب سے عذاب برداشت کر رہا ہے اور کون جانے کب تک کرتا رہے گا۔

اپنی نگارشات صاف، خوشخط، کاغذ کے ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔

دو دوستوں کی خوفناک موت

عذرا ناز، کراچی

کسی گاؤں میں دو دوست رہتے تھے جن میں سے ایک کا نام احمد اور دوسرے کا نام محمود تھا۔ یہ دونوں ایک ساتھ اسکول جاتے اور ایک ساتھ واپس آتے یہ بہت گہرے دوست تھے اور ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ یہ دونوں جس راستے سے گھر آتے وہاں ایک گھنا درخت تھا۔ کوئی بھی اس جنگل میں سے رات کے وقت نہیں گزرتا تھا۔ ایک مرتبہ احمد اور محمود کے اسکول میں کھیلوں کا مقابلہ ہوا جو کہ رات کے وقت ختم ہوا۔ اب جب احمد اور

محمود گھر واپس آنے کے لئے جنگل سے گزر رہے تھے کہ کسی کے چیخنے کی آواز آئی یہ دونوں اس جگہ کو تلاش کرنے لگے جہاں سے چیخنے کی آواز آرہی تھی اچانک ان کی نظر دو قبروں پر پڑھی جن کا منہ کھلا ہوا تھا۔ پھر محمود نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں سے احمد غائب تھا اب محمود بہت خوف زدہ ہوا اور احمد کو ڈھونڈنے لگا۔ اچانک ایک آواز آئی ''ٹھہر جاؤ'' محمود میں تمہیں جانے نہیں دونگا یہ احمد کی آواز تھی۔ پھر اسی لمحے محمود کو اپنی گردن اکڑتے ہوئے

محسوس ہوئی اور اس کی گردن جسم سے الگ ہو گئی۔ اور اس کا روپ انسانوں سے بدل کر ایک خطرناک جن کا روپ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی احمد بھی اسی روپ میں محمود کے پاس آیا۔ پھر خود بخود دونوں کے جسم ایک ہو گئے اور وہ ایک جان ہو گئے۔ اب ہر رات دونوں کی لاشیں اسی حالت میں گاؤں میں داخل ہو کر کسی ایک کا خون چوستیں ان دونوں کے گھر والے بہت پریشان تھے کیونکہ ایک تو ان کے گاؤں میں ہر رات ایک خون ہو جاتا۔ اور دوسرے ان کے بچے غائب تھے۔ ان دونوں کے گھر والوں نے یہی سمجھ لیا تھا کہ کسی رات ان دونوں کا بھی خون ہو گیا تھا۔ موت کے خوف سے گاؤں کے لوگوں نے گاؤں چھوڑ کر دوسرے گاؤں جانے کا ارادہ کیا۔ اور گاؤں کے لوگ گاؤں چھوڑ کر جانے لگے۔ اب یہ گاؤں ویران ہو گیا اور یہاں کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا اب تو وہ آدم خور یعنی احمد اور محمود بہت پریشان ہوئے اور اپنی خوراک کے بارے میں سوچنے لگے ادھر گاؤں والوں نے اس گھنے جنگل کو کاٹنے کا فیصلہ کیا۔

ایک دن سارا گاؤں کے لوگ اس گھنے جنگل مل کر کاٹنے گئے جب گاؤں والوں نے ایک عجیب و غریب درخت کو کاٹا تو وہ درخت چیخنے لگا سب گاؤں والے حیران ہوئے۔ پھر ان لوگوں نے جلد از جلد پورے درخت کو کاٹ دیا۔ اسی لمحے پیچھے کسی کے گرنے کی آواز آئی تو سب لوگ اس جانب جانے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کہ وہاں احمد اور محمود کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ دراصل ان دونوں کی روح اس درخت میں تھی اور جب گاؤں کے لوگوں نے اس درخت کو کاٹا تو ان دونوں کی لاشیں نظر آئیں اور اس طرح دو دوستوں کی خوفناک موت واقع ہوئی گاؤں والوں نے پورے جنگل کو کاٹ ڈالا اور اب وہاں کسی کو خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔

پرانا قبرستان

علی حسن لغاری..... ماتلی

کہتے ہیں ہمارے گاؤں میں ایک پرانا قبرستان تھا جو اب بھی اسی جگہ موجود ہے جس کا نام '' درساکیل '' تھا یہ قبرستان بہت ہی پرانا تھا اس لئے کہتے تھے کہ رات کو کوئی بھی اس کے قریب نہ گزرے کیوں کہ یہ ایک خطرناک

قبرستان ہے یہاں جن بھوت رہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے گاؤں کا جو بھی شخص شہر جاتا (کیونکہ یہی شہر میں آنے جانے کا راستہ تھا) وہ شام ہوتے ہی گھر واپس آتا رات کو کوئی بھی اس قبرستان کے قریب سے نہ گزرتا۔
ایک دفعہ ہمارے گاؤں کا ایک آدمی جس کا نام محمد رفیع تھا وہ کسی قریبی گاؤں میں ایک شادی میں گیا ہوا تھا اس شادی میں اسے رات ہو گئی اور اسے گھر بھی واپس آنا تھا اس لئے اس نے واپسی کی اجازت مانگی کہ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں لوگوں نے اسے بہت روکا مگر وہ نہ مانا۔

رات کے تقریباً دو بج چکے تھے رات بہت اندھیری تھی کوئی چیز بھی صاف نظر نہیں آرہی تھی محمد رفیع کے پاس ایک سائیکل تھی جس پر وہ سوار اندھیری رات میں اپنے گاؤں کی طرف آرہا تھا، محمد رفیع جو نہی گاؤں کے قریب ہوتا جارہا تھا، وہ قبرستان "در سایکل" بھی قریب ہوتا جارہا تھا اب محمد رفیع "در سایکل" کے بالکل قریب آ گیا کیا دیکھتا ہے کہ ایک بکری کا بچہ ہے جو وہاں قبرستان کے باہر گھاس وغیرہ کھارہا ہے محمد رفیع نے سوچا کہ کوئی بکریاں چرانے آیا ہوگا اس لئے یہ بکری یہاں چھوڑ گیا ہے اس نے فوراً سائیکل سے اتر کر اس بکری کو اٹھا کر گود میں بٹھالیا اب وہ اس بکری کے بچے کو اٹھائے اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا لیکن کچھ دیر چلنے کے بعد اس کو محسوس ہوا کہ سائیکل پنکچر ہو گئی پھر اچانک اس کی نظر نیچے پڑی اس نے دیکھا کہ بکری کے بچے کی ٹانگیں بہت بڑی ہو گئی تھیں اس وجہ سے وہ زمین سے گھسٹتی چلی آرہی تھیں اس لئے سائیکل صحیح طرح سے چل نہیں رہی تھی اس نے فوراً اسے نیچے دھکیل دیا اور خود سائیکل لے کر روانہ ہو گیا پیچھے سے اسے آواز آئی کہ آپ کے مرشد کے واسطے میں نے تجھے چھوڑ دیا ہے ورنہ تجھے کبھی نہیں چھوڑتی اس نے پیچھے دیکھا تو ایک ڈائن کھڑی تھی۔
اس نے اسے دیکھتے ہی سائیکل بہت ہی تیز چلانا شروع کر دی اور خدا خدا کر کے اپنے گاؤں پہنچا اور گھر جا کر خدا کے شکرانے ادا کئے کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔

بلیک بکس

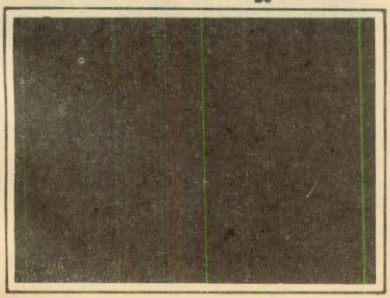

"اگر آپ مستقبل کے اچھے اور نیک نام ادیب بننا چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے کہ آپ کا نام بلیک بکس میں نہ آنے پائے"

امّی ابّو کا صفحہ

ایاز محمود

ماہرین نفسیات اس بات پر بالعموم متفق ہیں کہ انسان کو پیدائشی طور پر صرف دو باتوں کا خوف ہوتا ہے۔ اونچی جگہ سے گرنے کا خوف اور تیز آواز کا خوف۔ اس کے علاوہ باقی تمام ڈر اور خوف ہمارے ماحول کا حصہ ہوتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ہمارے لاشعور میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

اوائل عمری میں ذہن پر ثبت شدہ تاثرات نہایت پائیدار ہوتے ہیں اور ایک طرح سے انسان کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بچے کے ذہن میں موجود ڈر اور خوف کے منفی اثرات کو زائل کرنا والدین کی اولین ذمہ داری ہے۔

بچہ جب آپ کے سامنے اپنے خوف کا اظہار کرے تو اسے مذاق میں نہ ٹالیئے اور نہ ہی اسے شرم دلایئے۔ اسے کبھی بھی مجبور نہ کریں کہ وہ اپنے خوف کو چھپائے یا اس کی نفی کرے بلکہ منطقی انداز میں حقیقت کی تہہ تک پہنچنے میں اس کی مدد کیجئے۔ بہت چھوٹے بچے جو دلائل کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے آپ کے طرز استدلال اور پر اعتماد لہجے سے متاثر ہوتے ہیں۔

ماہرین نفسیات کی رائے میں بچوں کے ڈر اور خوف کو جانچنے کے لئے ان کے عمری تقاضوں اور نفسیاتی کیفیات و عوامل کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ یاد رکھئے..... ! بچے کی قوت متخیلہ نہایت قوی ہوتی ہے۔ آپ نے سماجی دباؤ یا عقلی توجیہات کے زیر اثر خوف کے جن پہلوؤں سے کسی حد تک صرف نظر کر لیا ہے وہ بچوں کی معصوم دنیا میں ایک نہایت متاثر کن مقام رکھتے ہیں۔

بچے کے خوف کو جھٹلانا یا خود کو سپر مین کے روپ میں پیش کرنا درست رویہ نہیں۔ اسے سمجھایئے کہ ڈر اور خوف کے احساسات نہ صرف اپنا وجود رکھتے ہیں بلکہ انسانی نشوونما کا ایک فطری حصہ بھی ہیں۔ خوف کے وجود کو جھٹلانے کے بجائے بچے کو اس بات کا ادراک کرایئے کہ خوف ایک قابل تسخیر حقیقت ہے۔

حامد محمود ، سوم
۱۵ ر جنوری ۱۹۸۰ء
کرکٹ کھیلنا، کہانیاں پڑھنا ، اُردو ، ڈاکٹر ۔ تحصیل و ضلع خانپور تھانہ ظاہر پیر چوہدری مقبول احمد کو ملے۔

محمد گوہر ، نہم
۱۶ ر جنوری ۱۹۷۶ء
کرکٹ کھیلنا ، سائنس
پائیلٹ سرسید گورنمنٹ ہائی اسکول ٹنڈو آدم

کمل کمار جیرانی ، دہم
۱۶ ر جنوری ۱۹۷۵ء
رسائل پڑھنا ، سائنس ، ڈاکٹر بنیں گے ۔ ڈاکٹر نانک رام قصبہ ضلع لاڑکانہ سندھ

حافظ طاہر جمیل قریشی ،
۱۸ ر جنوری ۱۹۷۴ء
کرکٹ ، بیڈمنٹن کھیلنا
بیالوجی ، ڈاکٹر الہادی ٹاؤن ڈیفنس روڈ P.O.S.I.E سیالکوٹ

ممتاز علی سموں ، دہم
۲۰ ر جنوری ۱۹۷۴ء
ڈرائنگ ، آرٹسٹ آنکھ مچولی پڑھنا، پوسٹ آفس مٹیاری
نزد جامع مسجد مٹیاری ضلع حیدرآباد

مدنان ستار ، ہشتم
۲۳ ر جنوری ۱۹۷۶ء
کرکٹ ، فٹ بال ، اُردو ، بزنس مین ۵۳/۱ بابا تاج الدین روڈ ، لیاقت آباد کراچی نمبر ۱۹

محمد کلیم ، ہشتم
۲۶ ر جنوری ۱۹۷۷ء
مصوری کرنا ، سائنس ، انجینئر بننا چاہتے ہیں ۔
شاہ فیصل کالونی نمبر ۱ بلاک نمبر ۲ ۱/۶۵۱ کراچی

فرہاد قریشی ، دہم
۲۷ ر جنوری ۱۹۷۲ء
مطالعہ کرنا ، اُردو بزنس مین ۔ ۸/۵۲، عزیز آباد کراچی نمبر ۳۸

نوٹ :- ساتھیوں سے گزارش ہے کہ کوپن کے ساتھ جو تصویر ارسال کریں اُس کا سائز ۱،۱ انچ ضرب ڈیڑھ انچ ہو۔

★ اس کالم میں انٹرتک کے طلبہ و طالبات شریک ہو سکتے ہیں ★ کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا ★ خراب اور نامکمل کوپن قابلِ قبول نہ ہوں گے ★ طالبات اپنی تصاویر نہ بھیجیں۔

نام ______ عمر ______ جماعت ______
مشاغل ______ پسندیدہ مضمون ______
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ______ وجہ ______
پتہ ______

نصیر احمد ، دہم
یکم جنوری ۱۹۷۲ء
فٹ بال کھیلنا ، آنکھ مچولی
پڑھنا ۔ اُردو ، انگریزی ، فوجی
برکت علی جوس دکاندار مین بازار تربت بلوچستان

نسیم انور ، دہم
یکم جنوری ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا ، رسالہ پڑھنا
مطالعہ پاکستان ، بزنس مین
اسٹریٹ نمبر ۲۔ ۳ نوو پارک ٹوبہ ٹیک سنگھ

اورنگ زیب عالمگیر ، دہم
یکم جنوری ۱۹۷۰ء
کرکٹ کھیلنا ، قلمی دوستی
اردو ، کرکٹر بننا چاہتا ہوں ۔ مقام وڈاکخانہ ڈھاندی
براستہ غریب وال سیمنٹ لمیٹڈ ۔ ضلع چکوال

انور علی شیخ ، دہم
۲ جنوری ۱۹۷۱ء
قلمی دوستی کرنا ۔ دینیات
ماسٹر دینیات کا ۔ اکبر علی پان ہاؤس
ٹاٹی پاڑہ ٹی بی اسپتال میر پور خاص

محمد اسماعیل جاوید ، نہم
۲ جنوری ۱۹۷۶ء
کہانیاں پڑھنا ، اعلیٰ ریاضی
ڈاکٹر ، بزرگوں کی خدمت
محمد اسماعیل تحصیل وضلع وہاڑی ڈاکخانہ سکنہ ۶۵ بی

سید عبدالرحمٰن پاشا ، دہم
۳ جنوری ۱۹۷۳ء
ڈرامے ، کہانیاں لکھنا ،
کیمسٹری ، انجینئر ۔ ۷/۱۱ بی ون ایریا
لیاقت آباد سندھی ہوٹل کراچی ۱۹

محمد عقیل فیاض ، دہم
۳ جنوری ۱۹۷۳ء
مطالعہ کرنا ، انگلش
ایڈووکیٹ معرفت المدینہ کاپی ہاؤس
جامع مسجد روڈ ہارون آباد ۔

خرم اکرم ، ششم
۵ جنوری ۱۹۷۸ء
ٹکٹ جمع کرنا ، اُردو
سائنس ، ڈاکٹر ۔ نوید سویٹ فیکٹری
افغان آباد گلی نمبر ۱۱ ۔ فیصل آباد

دلشاد اللہ ، نہم اے
۵ جنوری ۱۹۷۴ء
کرکٹ کھیلنا ، اُردو
کرکٹر بننا چاہتے ہیں ۔
۷۹/۱۵ ۔ ایف/۵ نارتھ کراچی

جاوید شبیر بریرہ ، نہم
۷ جنوری ۱۹۷۶ء
قلمی دوستی کرنا ، ریاضی
جج بننا چاہتے ہیں ۔
ملک لائبریری پنجند سینما روڈ علی پور

محمد فیصل محسن ، نہم
۹ جنوری ۱۹۷۵ء
مطالعہ کرنا ، انگلش
کرکٹر ۴۵ ، ۴۶ معین آباد
ماڈل کالونی ، کراچی نمبر ۲۷

پرنس ناصر علی تبسم ، نہم
۹ جنوری ۱۹۷۲ء
سائیکل چلانا ، شرارتیں
کرنا ، پنجابی ، اسلامیات ، معزز شہری
اکرم سیال توقیر نہم سی گرو نانک ہائی اسکول ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ

محمد طاہر جاوید تبسم ، نہم
۱۰ جنوری ۱۹۷۶ء
کرکٹ ، دکانداری ، اُردو
پنجابی ، بزنس مین اکرم سیال توقیر گورنمنٹ
گرونانک ہائی اسکول ننکانہ صاحب ، ضلع شیخوپورہ

ندیم اختر شیخ ، نہم
۱۴ جنوری ۱۹۷۴ء
قلمی دوستی ، ٹکٹیں جمع کرنا
بیالوجی ، انجینئر ۔ گورنمنٹ اسلامیہ (ن)
ہائی اسکول شیر گنج روڈ سکھر سندھ

محمد حبیب ہمیسر دہم
جنوری ۱۹۷۱ء
معلومات حاصل کرنا
انگلش ، انجینئر
۱۵ ، سامہ گارڈن حسین آباد حیدرآباد

سالگرہ کے ساتھی

جنوری میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف

سیّد مرید عمران ذائر۔ ہفتم
یکم جنوری ۱۹۷۶ء
فلمی دوستی، کرکٹ، سائنس
انگلش۔ پائیلٹ صابر روڈ میانوالی شہر

شہزاد ، نہم
یکم جنوری ۱۹۷۳ء
کہانیاں لکھنا، اُردو
ڈاکٹر۔ بنیں گے۔ میلہ ماسٹر جمیل
نیو مظفر آباد کالونی لانڈھی ۴۴، کراچی

فضل ودود صابر ، دہم
یکم جنوری ۱۹۷۳ء
کرکٹ کھیلنا، اُردو، پشتو ، اپنے ملک کا وفادار
سوات اولی سیریز اُودھیانہ بازار میگورہ سوات

محمد قدافی آتش ، دہم
یکم جنوری ۱۹۷۵ء
ٹکٹیں جمع کرنا، شعر لکھنا
اُردو، بیالوجی۔ سیکرٹ سروس کا چیف

مسعود اختر ، نہم سی
یکم جنوری ۱۹۷۳ء
مطالعہ کرنا، کہانیاں لکھنا، حساب، مصنّف
عبدالغفار محلہ اندرون کابل گیٹ گجرات

اظہر احمد خان ، نہم
یکم جنوری ۱۹۷۴ء
کرکٹ کھیلنا، آنکھ مچولی پڑھنا۔ سائنس۔ ڈاکٹر ضمیر برادرس پوسٹ بکس نمبر ۲۶ صدر بازار جیکب آباد
محمد نذیر کمرشل سپروائزر ریلوے اسٹیشن ملک سٹی

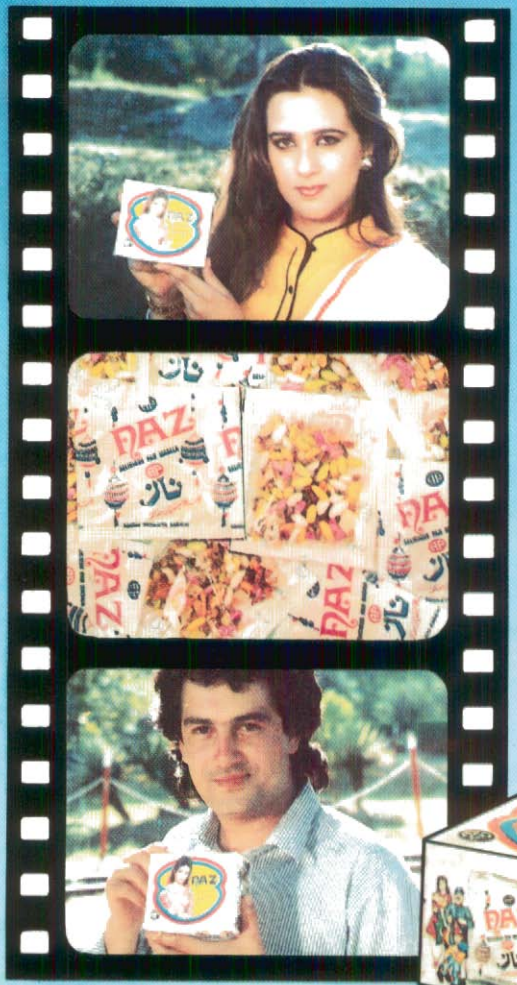

جو تھی کل بھی پسند
وہ ہے اب بھی پسند
میری مٹھی میں بند
ہے کیا... بتادو ناز
ناز
پان مصالحہ
NAZ
ASHRAF PRODUCTS
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE
Repcom

LASERDOT

لذّت بھی
توانائی بھی